

حکایت
ماہنامہ

اگست 2017ء

کیسے قسطنطنیہ پاکستان ہے؟

14TH
AUGUST

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com

ہورِ حُصین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اگر تم رُگردانی کرو گے تو جو پیغام میرے ہاتھ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمہیں پہنچا دیا ہے اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لا بسائے گا اور تم اللہ کا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکتے۔ میرا پروردگار تو ہر چیز پر نگہبان ہے (۵۷) اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے ہود کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے ان کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور انہیں عذاب شدید سے نجات دی (۵۸) یہ (وہی) عاد ہیں جنہوں نے خدا کی نشانیوں سے انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش و متکبر کا کہا مانا (۵۹) تو اس دُنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی (لگی رہے گی) دیکھو عاد نے اپنے پروردگار سے کفر کیا (اور) سن رکھو ہود کی قوم عاد پر پھٹکا رہے (۶۰)

سورۃ ہود

بانی
رح
عنایت اللہ
شاہد بن عنایت اللہ

لاہور
حکایت
ماہنامہ

شمارہ 12

اگست 2017ء

جلد: 47

سرکولیشن مینجر

فضل رزاق

محمد ثار رانجھا

شعبہ اشتہارات

خرم اقبال

محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ

محبوب

زبیر

پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد

مدیر: عارف محمود

مدیر: میاں محمد ابراہیم طاہر

اداری مدد: وحید شہزاد

منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر

وقاص شاہد ایڈووکیٹ

مجلس مشاورت

ابدال بیلا: عظمت فاروق

میم الف: ڈاکٹر شبیر حسین

ڈاکٹر نقی: ڈاکٹر نسیم اسحاق

علامہ عبدالستار عاصم

مدیر: عارف محمود 0323-4329344

مدیر: وقاص شاہد 0321-4616461

مدیر: فضل رزاق 0343-4300564

قیمت: 90 روپے

ہیڈ آفس 26- پیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

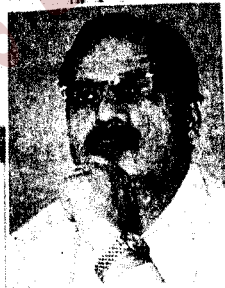
monthlyhikayat44@gmail.com

primecomputer.biz@gmail.com

مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے

امی جان

گاؤں کی رہنے والی غیر تعلیم یافتہ ماں کی کہانی اس کے بیٹے کی زبانی، ایسی باہمت خاتون کی داستان حیات جسے شوہر کی وفات کے بعد تنہا اپنے چار بچوں کی پرورش اور اعلیٰ ترین تعلیم کیلئے دنیا بھر سے جنگ لڑنا پڑی۔ جس کی اولاد دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں تک پہنچی اور خود اس نے زندگی کے آخری 22 برس مدینہ منورہ میں گزارے 15 حج اور 150 عمرے لاکھ ایسی کہانی جس میں سے ہر مشرقی ماں کا چہرہ دیکھا جاسکتا ہے۔



ضیا شاہد

ملنے کا پتہ: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل والٹن روڈ بینک سٹاپ لائبریرینٹ

Qalamfoundation3@gmail.com

0300-0515101 / 042-36613021

الحسن بھارت میں

145	محمد رضوان قیوم	قسط: 9	الاولیٰ	جگ بیتی
156	سکندر خان بلوچ	قسط: 17	سولجر نامہ	ضرب سکندری
161	ڈاکٹر مبشر حسن ملک		اقدار اپنی جاوداں رکھنا	ناقابل فراموش
172	دنگیر شہزاد		جنون عشق	بات ہے رسوائی کی
177	چوہدری غلام رسول اختر		وہ پاکستان کہاں ہے؟	تحریک پاکستان
193	سیدہ شاہدہ شاہ		آزادی کے چراغ	
190	کے ایچ مجاہد		آئین و قانون	مجاہد
209	ریاض بٹ		زن گزیدہ	جرم و سزا
223	حکیم مختار احمد ناز		کھجور	تحقیق
225	اعجاز حسین شہار	قسط: 2	دیارِ حرم کو چلے	سفر نامہ
237	خادم حسین مجاہد		ملفوظاتِ گفتار غازی	طنز و مزاح
21	قارین		خطوط و خیال	متفرق
79	محمد افضل رحمانی		ایک خط ایک وضاحت	
66	محمد سعید رضا		غزل	منظومات
192	عاصم دہرہ		غزل	

الحسن شہادت میر

- 15 خصوصی فیچر پھندوں اور شکنجوں کا وقت افضل مظہر انجم
- 49 کیا یہ قرآن کا پاکستان ہے؟ طاہرہ بٹ
- 29 بھارتی فتنہ سی پیک کی حفاظت گلزار اختر کاشمیری
- 33 سلسلہ وار ناول ستاروں بھری رات قط: 6 سید وسیم رضا
- 57 داستان ہجرت اگست 47ء بھول نہ جانا عبدالرحیم چشتی
- 64 ایک حقیقت ایک افسانہ پانی محمد الیاس
- 67 کچھ یادیں کچھ باتیں آگ اور خون کا سمندر گلزار احمد خان
- 81 ایک غائر ایک کھانی احساس کی منزل طاہرہ ممتاز کابلوی
- 203 آؤ لمحے غلام کر لیں نسیم یکینہ صدف
- 103 دین و دنیا جہیز یا جگائیکس؟ محمد طفیل طوٹی
- 110 دستِ شفا دانتوں کے امراض ڈاکٹر رانا محمد اقبال
- 113 فتنہ ہادیان مرزا غلام احمد قادیانی قط: 6 محمد افضل رحمانی
- 121 لمحہ فکر دائرے محمد حسین علی
- 123 دیارِ غیر سے پاکستان محمد صدیق
- 129 آپ بیتی آزادی اور گناہ حمید رانا
- 139 انتخاب دم طارق بلوچ صحرائی

کہنے کی بات

یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں!

..... اور آخر نواز شریف چلے گئے۔

انسان آتے اور جاتے رہتے ہیں، یہ روز پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ ملک زندہ رہتا ہے، اللہ کی زمین اپنی جگہ پر رہتی ہے۔ اسی طرح حکمران آتے جاتے رہتے ہیں، قوم زندہ رہتی ہے۔ حکمرانوں کی ہر جائز اور ناجائز کوشش کے باوجود ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایک نہ ایک دن ان کے نیچے سے کرسی نکل جاتی ہے یا کھینچ لی جاتی ہے، بعض کو تھکیٹ کر اتارا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی ہوتا آیا ہے۔ پاکستان کے غریب عوام نے اطمینان کا سانس لیا کہ پہلی بار کسی حکمران اور اس کے خاندان کو عدلیہ کے سامنے پیش ہونا پڑا اور عدلیہ نے برسرِ اقتدار وزیراعظم کو مجرم قرار دیا ورنہ عام تاثر یہی تھا کہ ماضی کی طرح اس مرتبہ بھی نواز شریف اس شکنجے سے بچ جائیں گے۔

اس موضوع پر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر سیر حاصل بحث ہو چکی اور ہر پہلو کا جائزہ لے کر ماہر تجزیہ کاروں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ ہم صرف اتنا ہی کہیں گے کہ یہ زوال نواز شریف کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ وہ غرور اور تکبر کے اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ تمام حاکموں کے حاکم کو بھی بھلا بیٹھے تھے۔ غرور اور تکبر اللہ کو ناپسند ہے۔

اللہ پاک کا فرمان ہے:

”کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تُو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی جھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور بے شک تُو ہر چیز پر قادر ہے۔“

(آل عمران: 26)

بات صاف ہو گئی۔ اللہ نے نواز شریف کو بادشاہی امانت کے طور پر بخشی لیکن نواز شریف نے شکر گزار بندہ بننے کی بجائے غرور و تکبر سے کام لیا اور امانت میں خیانت کی۔ اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ

نے ذیل کر کے بادشاہی چھین لی کیونکہ وہ اس پر قادر ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا:

”اللہ تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔“ (النساء: 36)

نواز شریف کے قریبی ساتھی خاص طور پر وزیر داخلہ چوہدری ثار ان کو عدالت اور سیوری اداروں کے ساتھ الجھنے سے منع کرتے رہے مگر نواز شریف نے قانون اور انصاف کو ٹھوکر پر رکھ کر ان کے ساتھ رعب اور دبدبے کی پالیسی اختیار کی کہ وہ دھونس دھاندلی سے ان کو دبا لیں گے لیکن یہ پالیسی سودمند ثابت نہ ہو سکی۔

اصل وجہ جو کچھ بھی ہو نواز شریف کی برطرفی میں ان کے خوشامدیوں کا بھی ہاتھ ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ ”سب اچھا ہے“ کا راگ الاپتے رہے اور نواز شریف کے ساتھ بہت بُرا ہو گیا۔

ماضی میں ذوالفقار علی بھٹو نے بھی یہی غلطی کی تھی اور یہی غلطی انہیں لے ڈوبی تھی۔ جس طرح بھٹو کو آخری وقت تک یقین تھا کہ اسے پھانسی نہیں دی جائے گی اسی طرح نواز شریف کو بھی یقین تھا کہ اس جیسے مضبوط وزیر اعظم کے خلاف فیصلہ دینے کی جرأت جوں میں نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عزت سے استعفیٰ نہیں دیا۔ پھر اللہ نے اپنے فرمان کے مطابق ذلیل کر کے ان سے بادشاہی چھین لی۔

ہمارا ایمان یہ ہونا چاہئے کہ ملک ہمیشہ باقی رہے اور ملتِ پاکستان ہمیشہ زندہ، آزاد اور پُر وقار رہے۔ مگر ہوتا کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی ملک و ملت کی باگ ڈور آتی ہے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کے کندھوں پر اللہ نے بڑی ہی نازک اور مقدس ذمہ داری ڈال دی ہے اور وہ اللہ کے حضور اس کا جوابدہ ہوگا۔ خلفائے راشدین اللہ کے خوف سے اس کے آگے روتے اور گڑ گڑاتے تھے کہ ان سے کوئی کوتاہی اور بے انصافی نہ ہو جائے لیکن اپنے وطن کے ہر حکمران کے طور پر طریقے کچھ اور ہی رہے۔ جو بھی آیا اس نے صحیح معنوں میں باگ بھی سنبھالی اور ڈور بھی۔ باگ ایسی پکڑی کہ عوام کو تانگے کا گھوڑا بنا لیا اور ڈور سے سیاسی پیچے لڑانے شروع کر دیئے۔

اب خبر ہے کہ شہباز شریف کو وزیر اعظم لایا جا رہا ہے۔ جو کوئی بھی آئے، اس سے گزارش ہے کہ اقتدار میں آ کر اس کے قدم جم جائیں تو وہ پہلے حکمرانوں کی طرح اپنے آپ کو پاکستان کا بادشاہ نہ سمجھنا شروع کر دے اور نہ ہی اپنی عقل اور فہم و فراست، اپنی آنکھیں اور کان خوشامدیوں کے حوالے کر دے اور نہ ہی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ اس ملک کا مختار مصل ہے۔

یہ یاد رکھیں کہ پاکستان شہیدوں کی سرزمین ہے اور سدا حکایت اللہ کی ہے۔

پاکستان کے منتخب وزراء اعظم اور ان کا انجام دیکھیں۔ آنکھ والوں کے لئے عبرت ہے۔

لیاقت علی خان قتل ہو گئے

برطرف کر دیا گیا	خواجہ ناظم الدین
زبردستی استغنیٰ لیا گیا	محمد علی بوگرہ
استغنیٰ لیا گیا	چوہدری محمد علی
مستغنیٰ	حسین شہید سہروردی
مستغنیٰ	آئی آئی چندریگر
تختہ الٹ دیا گیا	فیروز خان نون
تختہ الٹ کے پھانسی	ذوالفقار علی بھٹو
برطرف کر دیا گیا	محمد خان جونجو
برطرف کر دیا گیا	بے نظیر بھٹو
برطرف پھر بحال پھر زبردستی استغنیٰ	نواز شریف
برطرف پھر قتل	بے نظیر بھٹو
جلاوطن کر دیا گیا	نواز شریف
استغنیٰ لیا گیا	ظفر اللہ جمالی
گمشدہ (تلاش جاری ہے)	شوکت عزیز
عدالتی برطرفی	یوسف رضا گیلانی
عدالتی برطرفی	نواز شریف

کہاں گیا سکندر مرزا؟ کتام ہو گیا۔

ایوب خان نے عقل مندی کی اور عزت سے ایک طرف ہو گئے۔

بھٹو کہتا تھا یہ کرسی میری طاقت ہے۔ پھانسی چڑھا دیا گیا۔

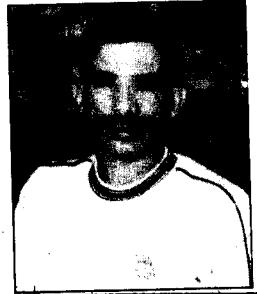
ضیاء الحق نے کہا تھا۔ میں جانے والوں میں سے نہیں۔ سب نے دیکھا وہ کیسے گیا۔

ہم ہر آنے والے حکمران سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنے سے پہلے جانے والوں کے انجام کو یاد

رکھیں اور اس یقین کو ذہن میں نبھالیں کہ حاکم اعلیٰ صرف اللہ ہے اور ایک دن اس کی دی ہوئی چارون کی

حکومت کا حساب دینا پڑے گا۔

یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں!



ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے!

پاکستان کے ان پاناموں، اقاموں اور کاموں کو دیکھ کر لوگوں کو برہم نہیں بلکہ خوش ہونا چاہئے کہ ملکی تاریخ میں پہلی بار اس سکیل پر ان کا اصل، ان کی اصلیت بے نقاب ہو چکی۔ اپنے عوام کے لئے آقا اور فرعون، گھوڑوں اور عربوں کے یہ حقیر اقامے اور کامے سر عام یہ جموٹ بوتے ہیں کہ وہ 22 کروڑ عوام کے دلوں میں بستے ہیں۔ دو تازہ ترین مثالیں دیکھئے کہ یہ اداروں کو کس کس طرح برباد کر کے ریاست کے ملازموں کو ذاتی زرخیز غلاموں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ پہلی مثال: ایس ای سی پی کے قابل فخر سپوت ظفر جازی کی ہے جسے ریکارڈ ٹھہرنگ پر مجبور کیا گیا۔ ورنہ اس نو سر بازی میں اس کا ذاتی مفاد کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اسے خوف اور لالچ کے ہتھیاروں سے سدھایا گیا، سیدھا کر دیا گیا۔ جیسے سیاہ فام سرکشوں کو جنگلوں سے جانوروں کی طرح پکڑ کر لانے کے بعد ان کے سارے کس مل نکال دیئے جاتے تھے۔ ایکس ہیلی کا شہرہ آفاق ناول Roots اس کے جد امجد کی چچی کہانی ہے جس کے ہیرو کلتے کا نٹا کو آزاد سے غلام میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ غلامی نسل در نسل چلتی ہے۔ غلاموں کی شادیاں بھی رچائی جاتی تھیں اور پھر ان کی اولاد کو بالکل ایسے ہی سچ دیا جاتا تھا جیسے کوئی گائے، بھینس، بکری کے بچوں کو سچ دے۔ یہاں بھی ذرا مختلف اور لطیف اعزاز میں بھی کچھ ہو رہا ہے۔ مجازیوں کو زبردستی کلتے کا نٹا بنا دیا جاتا ہے۔

دوسری مثال نہال ہاشمی کیس میں اس کی ویڈیو کوائٹ کر کے عدالت کی آنکھوں میں دھول جمو کھنے کی مذموم کوشش ہے۔ ایسا جس کسی نے بھی کیا اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد ممکن نہیں۔ یہ اداروں کے ساتھ کھلواڑ اور ریاست کے ملازموں کو ذاتی غلاموں میں تبدیل کرنے کے کچھ کی ایک اور جھلک ہے۔ تو یہ ہیں وہ پانامے، اقامے اور فیروں کے کامے جو اپنے ہم وطنوں کو غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور اس بھیا تک واردات کو گورنمنٹ کا عنوان دیتے ہیں۔ کسی دلغراش خبر ہے کہ پراپرٹی کے کاروبار میں ملوث 17 سینیٹرز اور 134 ارکان اسمبلی کی خفیہ انکوائری شروع ہو چکی ہے۔ لہذا مافیہ کے ان شراکت داروں میں 17 سینیٹرز، 32 ارکان قومی اسمبلی، 102 ارکان صوبائی اسمبلی کے ساتھ 28 اعلیٰ پولیس افسر بھی شامل ہیں۔ معلوم کیا جا رہا ہے کہ پراپرٹی بزنس کے لئے

کن کن جرائم پیشہ گروہوں کو استعمال کیا جا رہا ہے اور ان میں سے کتنے افراد کا تعلق کالعدم تنظیموں کے ساتھ ہے۔

اہم حساس اداروں نے کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کرنے اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کرنے والے افراد کے خلاف یہ انکوائری آئندہ سخت احتساب کے حوالہ سے شروع کی ہے۔ 37 عوامی نمائندے ایسے ہیں جو بڑے لینڈ مافیاز کو نہ صرف سپورٹ کرتے ہیں بلکہ اربوں روپے کی سرمایہ کاری بھی کرتے ہیں۔ لینڈ مافیا کے طور پر کام کرنے والے ارکان صوبائی اسمبلی میں پنجاب کے ارکان پہلے، سندھ کے دوسرے نمبر ہیں۔ سندھ کے چاروزار اور ایک سابق وزیر کے حوالے سے تو یہاں تک رپورٹ ہوا ہے کہ دعویٰ میں ان کی اربوں روپے کی پراپرٹی ہے جو کہ ریٹ پر دی گئی ہے اور یہ پیسہ کرپشن سے اکٹھا کر کے وہاں انویسٹ کیا گیا ہے۔ لینڈ مافیا سے منسلک پنجاب کے ارکان اسمبلی میں سے 6 کا تعلق لاہور، 4 کا گوجرانوالہ، 5 کا فیصل آباد سے ہے۔ ملتان، راولپنڈی اور سرگودھا سے تعلق رکھنے والے 16 معزز ارکان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بھی مختلف لینڈ مافیا سے ملے ہوئے ہیں اور ان کی بے شمار جائدادیں ان کے ملازموں اور رشتہ داروں کے نام پر ہیں۔

(ن) لیگ کے ایک وزیر نے شرف دور میں (ن) لیگ کے اندر رچے ہوئے لاہور میں پراپرٹی کا بے تحاشا کاروبار کیا اور اس کے اس کاروبار میں پیپلز پارٹی کے ایک سابق وزیر اعظم کا بیٹا بھی حصہ دار ہے اور اس وقت بھی اس کا شمار بڑے لینڈ مافیا میں ہوتا ہے اور اس نے بھی فرنٹ پر کسی اور کو رکھا ہوا ہے۔ پولیس سے تعلق رکھنے والے 28 لوگوں کے بارے میں بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف لینڈ مافیا کو سپورٹ کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد حصہ دار بھی بنایا ہوا ہے۔ پاکستان ایک ایسے بدن کی مانند ہے جس کے آدمے جسم میں تیزے گڑے ہیں اور باقی آدمے جسم میں سڑا ڈال کر کچھ لوگ مسلسل اس ملک کا خون پی رہے ہیں۔

جس کا آغاز میں نے دیکھا تھا

اُس کا انجام دیکھنا ہے مجھے

تو انجام سامنے ہے۔ برسوں پہلے استاد محترم صوفی تبسم نے کہا تھا۔

”آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی“

بھی زندگی ہے اور بھئی اس کا سبق بھی۔ اگر کوئی سیکھنا سمجھنا چاہے کہ کانٹے کاشت کر کے کوئی کنول نہیں کاٹ سکتا۔ تم بدی چ کر نیکی کی فصل نہیں اٹھا سکتے۔ تم شر پھیلا کر خیر نہیں سیٹھ سکتے اور انکارے دھماکا کر اس کی

آس؟

دوستو! آپ کو وہ وزیر یاد ہوگا جو خود کو لوہے کا چنٹا بتایا کرتا تھا۔ اس نااہلی کے بعد اس کے دانت اور

سوڑھے ہی نہیں جیزے بھی ٹوٹ گئے ہوں گے۔ سو اسلام آباد میں بندوبست پورا تھا۔ ریڈارٹ، رینجرز اور ایف سی تعینات تھے اور ریڈ زون سیل، سخت سیکیورٹی، 3 ہزار اہلکار تیار تاکہ کوئی گلوبٹ ماضی کی تاریخ دہرانے کی حماقت کرے تو اسے عبرت کا نشان بنا دیا جائے۔

نواز شریف وہ شاہ بخت ہیں جو تین مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہوئے اور وہ تینوں مرتبہ اپنی مدت پوری کرنے سے قبل عہدے سے ہٹا دیے جاتے رہے۔ پہلی بار صدر اسحاق نے ان کے خلاف B-58/2 استعمال کرتے ہوئے گمر بھیجا۔ دوسری مرتبہ وہ دوتہائی اکثریت لے کر ناقابلِ تغیر وزیر اعظم کے طور پر سامنے آئے مگر جنرل مشرف نے ان کا تختہ الٹ دیا۔ اس بار نواز شریف عدالت سے نااہل ہوئے ہیں۔ ان کے ملاف عدالت کے پانچ رکنی فل بینچ نے فیصلہ سناتے ہوئے انہیں وزارت عظمیٰ سے نااہل قرار دے دیا ہے۔

فیلڈ مارشل ایوب خان، جنرل یحییٰ، جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف کا احتساب بھی نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری طرف سولین صنوں میں دیکھا جائے تو لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی، محترمہ فاطمہ جناح، ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو، آصف زرداری، یوسف رضا گیلانی اور نواز شریف میں سے کچھ کا احتساب ہوا اور بعض نے زندگی کا مقدمہ ہار کر رہائی پائی۔ پانامہ کا فیصلہ آچکا۔ نواز شریف اینڈ کمپنی جنرل ضیاء الحق کی اینٹ ہٹ سکیم کا نتیجہ تھے۔ بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد اسمبلی شمس کی زمریوں میں خاص لیڈر شپ مینوفیکچر کی گئی۔ نواز شریف کی طرح محمد خان جو نجو کو بھی وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برخاست کیا گیا تھا۔ جو نجو کو اس وقت وزارت عظمیٰ سے محروم کیا گیا تھا جب وہ بیرونی دورے سے وطن واپس لوٹے تھے کہ جو نجو کو ازپورٹ پر ہی جنرل ضیاء الحق کا حکم نامہ تھما دیا گیا تھا جس پر درج تھا کہ آپ کو برخاست کیا جاتا ہے۔

ضمیر مردہ نہ ہو، ذہن بخت نہ ہو، روح میلی نہ ہو اور ملک سے بھی محبت ہو تو آدمی اس فیصلہ کو برکت کے لئے گھر میں آویزاں کر کے ان شاء اللہ ملک کی سمت تبدیل کرے گا۔ سرغننے گئے تو ان کے پیچھے پیچھے ان کے پالتو بھی جائیں تاکہ دھرتی کا یہ حصہ کرپشن سے پاک ہو سکے کہ اس مافیائے توہر قسم کی کرپشن کو کچھ، دے آف لائف اور سکھ رائج الوقت بنا دیا تھا لیکن وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اس کی لاشی بے آواز ہوتی ہے اور آت خدا دا دیر، سودن چور کا ہو بھی تو قدرت ایک آدھ دن سادھ کے لئے وقف کر دیتی ہے اور فیصلہ کا دن ایسا ہی ایک روشن دن تھا۔ یہ مایاب ملکی قانون نہیں قانون قدرت کی زد میں ہے۔ جس کی ضرب شدید بڑے بڑے فرعونوں، نمرودوں، شہدادوں کو پاش پاش کر دیتی ہے، یہ تو کسی کھاتے میں ہی نہیں۔ عوام نے برف فردشوں کو بادشاہ بنا دیا، عوام نے دست کار، مزدوروں کو مہابلی بنا دیا، پاتال سے اٹھا کر اوج کمال تک پہنچا دیا۔ جوا بانہوں نے عوام کو کیا دیا؟ دھوکا اور دھوکا، فریب و فریب، جھوٹ و جھوٹ۔

”گنہگار اپنے چہرے ہی سے پہچان لئے جائیں گے۔ تو پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ لئے جائیں گے“ (سورۃ الرحمن: 41)۔ ”یہ لوگ جرم کرتے ہیں، ان کو اللہ کے ہاں ذلت اور عذاب شدید ہوگا، اس لئے کہ مکاریاں کرتے ہیں“ (سورۃ الانعام: 124)۔ ”جو لوگ اپنے ناپسند کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور جو کرتے نہیں ان کے لئے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے، ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے، انہیں درد دینے والا عذاب ہوگا“ (سورۃ آل عمران: 188)۔

وقت بدل چکا، اب اپنی 60 کروڑ روپے کی کمزری سے کھواسے تبدیل کرنے کی کوشش کر دیکھے کہ قیمتی ترین کمزری بھی بد وقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ نواز فیملی سے بھی بڑا امتحان ان کے سیاسی اور فکری ورکرز کا ہے کہ وہ شخصیت پرست ہیں یا وطن پرست؟ ہڈیاں جمچھڑے مراعات کافی ہو گئیں۔ ان کی تاریخ گواہ ہے کہ نہ یہ عوام کے دوست ہیں، نہ افواج سے ان کی جنتی ہے اور عدلیہ پر یلغار بھی ان کے چہرے پر چپک کے بدنما داغوں کی طرح ہمیشہ نظر آتی رہے گی۔ ادارے انہوں نے روند کے رکھ دیئے۔

دیر آید درست آید۔ کاش! نظام ایسا ہو کہ چور پکڑنے میں پینتیس سال نہ لگیں۔ کیسا خاندان تھا جو پاکستان کے تقریباً پینتیس سال کھا گیا۔ نہ صادق ہے نہ امین۔ جموٹا ہے اور خائن بھی۔ گاڈ فادر گیا لیکن بچے بلوگڑے ابھی باقی ہیں اور صرف سیاست میں نہیں ہر شعبہ حیات میں ان کے جڑوے باقی ہیں۔ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔

ابھی تو مال مسروقہ کی واپسی کا بندوبست شروع ہوتا ہے۔ نواز شریف ضیاء الحق کی باقیات تھا لیکن نواز شریف کی باقیات ابھی باقی ہیں لیکن یہ سیپا گروپ اور چنڈال چوکرزی کب تک؟ آج جشن منانے سے زیادہ شکر منانے کا وقت ہے۔ بے شک وہی ہے جو عزت دیتا ہے اور ذلت بھی۔ عوام کو مبارک ہو! جے آئی ٹی اور عدلیہ کو سلام اور عمران خان کو.....

ہاتھوں میں ہاتھ پکڑے ہوئے یوں کھڑے تھے لوگ
دیر یا کو بھی گزرنے کا رستہ نہیں ملا

دستگیر شہزاد

سالگرہ نمبر میں محترم دستگیر شہزاد کی خصوصی تحریر
”میں اور میرا تخلیقی عمل“ پیش کی جائے گی۔

پھندوں اور شکنجوں کا وقت آچھنچا

- کرپشن کی انکوائری پروا دے یا کیوں؟
- جمہوری چیمپئن بھٹو نے کرپشن کا آغاز کیا۔
- جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کی کرپشن اور لوٹ مار کو آگے بڑھایا۔
- بے نظیر اور نواز شریف نے کرپشن کو چار چاند لگا دیئے۔
- جنرل مشرف نے احتساب کے عمل کا بیڑہ غرق کر دیا۔
- چودہ جماعتیں پاس نہ کرنے والا ملک کا صدر بنا دیا گیا۔
- مفاد پرست اور گونا گونا بھرہ میڈیا اور کرپشن۔

afzaalmazhar@gmail.com

☆ انصاف مظہر اعظم

میں واسطہ پڑتا ہو یا کوئی شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی بجائے کام چوری کر رہا ہو یا چوری یا کوئی جرم کرتا پایا جائے لیکن اپنا جرم ماننے یا غلطی تسلیم کرنے کی بجائے وہ دلائل دیتا ہے، جہتیں پیش کرتا ہے کہ جرم تو اس نے نہیں کیا۔ اس غلطی یا غفلت میں وہ ملوث نہیں ہے۔ یعنی اس کے من (اندر) میں تو چور ہے یا بدتمیزی لیکن اپنے آپ کو پاک صاف ثابت کرنے کے لئے وہ جتوں پہ جہتیں پیش کر رہا ہے۔

پاکستان جب وجود میں آیا تو یہ خرابیاں انفرادی طور پر تو نظر آتی تھیں لیکن اس وقت کے لیڈر، حکومتی اہل کار حقائق تسلیم کرنے یا غلطی ماننے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ شاید یہ دو سو سال تک انگریزوں کے بہتر ماحول کا اثر تھا۔ ابتدا میں ان شخصیات کو اہم ترین گورنر جنرل، وزیراعظم، گورنر جیسے عہدوں پر رہنے

پنجابی کی ایک کہادت یا ضرب المثل ہے۔ لوگوں کی فطرت، عادات و اطوار کو سامنے رکھتے ہوئے سینکڑوں سال کے تجربے کے نچوڑ کے بعد اس طرح کی ضرب المثل ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگوں کے بارے میں ہم سنتے رہتے ہیں اور آج بھی لگتا ہے کہ یہ ضرب المثل ہزاروں سال پرانی نہیں تازہ واقعات کی روشنی میں کہی گئی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے واقعات ہم اپنے قرب و جوار میں دیکھتے رہتے ہیں اور اس قسم کے لوگوں سے ہمارا پالا پڑتا رہتا ہے۔ کسی ایک شخص کی اس قبیح عادت سے تو چند افراد ہی متاثر ہوتے ہوں گے لیکن جب ملک کی اعلیٰ ترین مسندوں پر، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر اس قسم کے افراد متمکن ہوں تو ملک و قوم کو اس سے ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ آپ کو کسی بھی شخص سے لین دین کے سلسلہ

اور اقربا پروری کی ابتدا کی اور ملکی بیوروکریسی کے علاوہ قانون کی دجیاں اڑانے میں بھی منفی کردار ادا کیا۔

تیرہ سالہ فوجی ڈکٹیٹر کے بعد اس جمہوری چیمپئن کو قوم کے لئے مثال بننا چاہئے تھا۔ قوم کا قبلہ درست کر کے اسے درست سمت لگانا چاہئے تھا۔ معاشرے میں موجود خرابیوں کو دور کرنا چاہئے تھا لیکن ہوا اس کے برعکس ہی۔ بعض حضرات بھنڈو دور کو کرپشن سے پاک قرار دیتے ہیں۔ کرپشن پر میری کتاب ”ملک لوٹنے والے والے چہرے“ کے نئے ایڈیشن میں بھنڈو کے اپنے دستخطوں سے آپ حقائق سے باخبر ہو سکیں گے۔ اس ملک میں سچے رائٹر کی کمی ہے۔ سب مفادات کے بندے ہیں اس لئے سچ کبھی سامنے نہیں آ سکا۔

جنرل ضیاء الحق نے کرپشن کے کام کو

مزید بڑھا دیا

بھنڈو کے بعد آنے والی فوجی حکومت کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے بھنڈو دور کی کرپشن اور لوٹ مار کو مزید آگے بڑھایا۔ فوجی افسروں کو پلاٹ دینے کی ریت تو بھنڈو دور میں شروع ہو چکی تھی۔ ضیاء الحق نے اپنے حواری جرنیلوں کے علاوہ سیاست میں اپنا ساتھی بننے والوں کو بھی لوٹ مار کی کھلی چھٹی دیئے رکھی۔ اپنی تقاریر میں جلسوں اور ٹی وی پر موصوف قرآن مجید کی آیتیں سنا کر لوگوں کو اللہ رسول کی تعلیمات پر چلنے کی ہدایت کرتے لیکن کرپشن کا آغاز اپنے خاندان یعنی خود کو فائدہ پہنچا کر ہی کیا۔ حالانکہ جنرل ضیاء الحق کو تھوڑا بہت نہیں گیارہ سال کا طویل وقت ملا تھا۔ اسی دور میں فوجی حکومت کے زیر سایہ بننے والی جمہوری حکومت کے کرتا دھرتا محمد خان جو نیو نے ارکان اسمبلی کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اربوں روپے کے فنڈز کی ایسی

کا موقع ملا لیکن انہوں نے ان عہدوں پر رہ کر کبھی ایثار اور کفایت شعاری کی مثالیں پیش کیں اور قومی خزانے پر کسی قسم کا ناجائز بوجھ اپنی ذات کے لئے نہیں ڈالا۔ قائد اعظم، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشت نے ان عہدوں پر رہ کر نہ خزانے کو بے وردی سے استعمال کیا، نہ ہی پلاٹ اور لائسنس وغیرہ لئے اور نہ ہی اپنے عزیز واقارب پر نوازشات کی بارش کی۔ اس دور کی سیاست میں دو بیوروکریٹوں غلام محمد اور سکندر مرزا کو بھی غیر آئینی طور پر اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا لیکن ان دونوں نے بھی مالی کرپشن نہیں کی۔ یہ ضرور تھا کہ دونوں اقتدار کے رسیا تھے اور جوڑ توڑ کی سیاست کے ماہر کیونکہ سکندر مرزا کو ملک بدر ہونے کے بعد لندن کے ایک ہوٹل میں نیجری کرنا پڑی اور غلام محمد اپنے بیٹے کو گورنر جنرل ہاؤس میں رہائش اختیار نہیں کرنے دیتا تھا اور تو اور جنرل یحییٰ خان جو شراب و کباب کا رسیا ضرور تھا لیکن مالی کرپشن سے اس نے بھی اجتناب کیا۔

13 سالہ ڈکٹیٹر شپ کے بعد جمہوری

چیمپئن بھنڈو نے کرپشن کا آغاز کیا

1958ء سے 1971ء تک ملک 13 سالہ فوجی ڈکٹیٹر شپ کے زیر سایہ رہا۔ اس کے بعد 1972ء میں آنے والی جمہوری حکومت جس میں ذوالفقار علی بھنڈو 1977ء تک اقتدار میں رہے، کے دور میں کرپشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے گو فوجی ڈکٹیٹر سر اقتدار رہے لیکن رشوت خال خال تھی۔ کرپشن بھی برائے نام حد تک تھی۔ بھنڈو نے ایک تو اراکین اسمبلی کو اربوں روپے کے پلاٹ الاٹ کئے، دوسرے مختلف محکموں میں کرپشن کی ابتدا بھی ہو چکی تھی۔ ساتھ ہی بھنڈو نے میرٹ کی دجیاں خوب اڑائیں

اشخاص کے زمینوں پر ناجائز قبضہ کا سلسلہ اسی دور میں شروع ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہو رہا تھا کہ کرپشن کرنے والے ٹیکس چور، غشیات فروش، ناجائز قبضہ کرنے والے ملک کے اعلیٰ ترین قانون ساز اداروں پارلیمنٹ میں بیٹھے تھے۔

بے نظیر بھٹو نے اپنے آپ کو صاف ظاہر کرنے کے لئے اپنے خاندان کو کھل کر لوٹ مار کرنے کا موقع دیا حالانکہ یہ لوگوں کی نظروں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھا۔ خاندان لوٹ مار کر کے جو دولت کمائے گا وہ گھر میں نہیں آئے گی؟ یا اس کے بچے یہ حرام مال استعمال نہیں کریں گے؟ نواز شریف نے خود اور سارے خاندان کے لئے قرضے لے لے کر اپنے صنعتی یونٹ دو سے 26 تک بڑھائے تھے۔ بہر حال ملک کا سارا معاشی ڈھانچہ ان دونوں جمہوری لیڈروں نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ لیڈر تو مشکل وقت میں اپنی قوم کو اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر اجالے کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ اپنی لیڈرانہ صلاحیتیں دکھاتے ہوئے دنیا میں قوم کو ایک عظیم مقام دلاتے ہیں۔ یہ کیسے لیڈر تھے جو اپنے ہی ملک کو لوٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ ملک کو اغیار کے ہاتھوں اتنا موقوف بنا دیا گیا کہ ملک 20 ہزار ارب روپے کے قرضوں تلے جکڑ گیا۔

جنرل مشرف نے بھی احتساب کے عمل کا

بیڑہ غرق کر دیا

اپنے پیٹرو لیڈروں کی حکومت کے بعد اقتدار سنبھالنے والے جنرل پرویز مشرف نے نیب جیسا ادارہ بنا کر ضرور احتساب کا عمل پہلی مرتبہ شروع کیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ قومی دولت لوٹنے والے

ہڈی ڈالی جو آج تک ان کے منہ سے نہیں نکل سکی۔

بے نظیر، نواز شریف کرپشن کو چار چاند

لگانے کے لئے میدان میں آئے

ان دونوں جمہوری لیڈروں کو بھی گیارہ سالہ طویل ڈکٹیٹر شپ کے بعد اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا اور اتنی ہی طویل مدت یعنی گیارہ سال تک دونوں نے باریاں لگا لگا کر ملک پر چار مرتبہ حکومت کی لیکن انہی کے دور میں کرپشن اور لوٹ مار کے وہ ریکارڈ قائم ہوئے، ملکی خزانے لوٹ کر کھانے کے نت نئے طریقے استعمال کئے گئے کہ اس سے پہلے نہ کئے گئے ہوں گے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو نے خود اپنے خاندان کے لئے بھی اربوں کے قرضے حاصل کئے بلکہ اپنے سیاسی حواریوں کو بھی قومی بینک لوٹنے کا موقع کھلم کھلا فراہم کیا گیا۔ نوبت یہ آگئی کہ قومی بینک تباہی و بربادی کا شکار ہو گئے۔ ملک کے اہم ادارے واپڈا، پی ٹی سی ایل، ریلوے، پی آئی اے، مشیل ملز بھی تباہی کے کنارے پہنچ گئے کیونکہ کوئی کسی کو لوٹ مار کرنے سے روک نہیں رہا تھا۔ ملکی خزانے بے تحاشا لوٹنے کا نوٹس عدلیہ سمیت کوئی بھی ادارہ نہیں لے رہا تھا۔ پورا معاشرہ سیر تاپا کرپشن میں لتھڑ چکا تھا۔ جب سیاسی، پٹواری، تحصیلدار سے لے کر گورنر، وزیر اعلیٰ، وزراء، صدر، وزیراعظم تک خود کرپشن میں ملوث ہوں تو کسی کو غلط کام سے کون روک سکتا تھا۔

اسی دور میں ہر شخص کے ذہن میں ہر جائز ناجائز طریقے سے مال بنانے، اٹانے بڑھانے کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ غشیات یا دیگر اشیاء منگول کرنے والے متعلقہ اداروں یا کسٹمر والوں کی مٹھی گرم کرنے کی وجہ سے بچتے رہے۔ ٹیکس چوری کرنے والے، انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کی وجہ سے قابو نہیں آتے رہے۔ بااثر

تیسری مرتبہ ملک کے اقتدار پر بٹھا دیا گیا۔ گزشتہ 32 سال سے سیاست میں وارد اور حکومت کے مزے پینے والے یا عوام کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھا کر انہیں الٹی پاپ دینے والے نواز شریف ہمیشہ ہی عدالتوں کے ٹیکوں سے بچتے رہے۔ نیب کے شکنجے میں آنے سے بچتے رہے۔ اب ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یعنی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی جس طرح سے سامنے آ رہا ہے دنیا دیکھ رہی ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ کیا ہمارا انتخابی سسٹم کرپٹ اور خرابیوں خامیوں سے بھرپور ہے کہ ہر غلط شخص نے سیاست میں پناہ لی ہوئی ہے۔ پڑھے لکھے، ایماندار، مخلص حضرات معاشرے میں بڑی تعداد میں موجود ہیں جو بیرونی ممالک میں جا کر بھی وہاں کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن یہاں قابل، مخلص اور ایماندار لوگ سیاست میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ شکنجے میں آنے والے نواز شریف سچ کہتے ہیں کہ ان کے پاس سب سے بڑا مینڈیٹ عوام کا ہے۔ پانچ سو سال بھی الیکشن ہوتے رہیں تو یہی لوگ منتخب ہو کر اسمبلیوں کی زینت بنتے رہیں گے۔ نہ عوام اپنی فطرت بدلے گی نہ انتخابی سسٹم میں تبدیلی آئے گی تو نظام یونی چلنا نظر آئے گا۔

کرپشن کے خاتمے کے لئے عدلیہ کا

مابین کن کردار

معاشرے میں قانون کی حکمرانی ہو، ہر مجرم، قصوردار، ظالم شخص کو سزا ملتی رہے تو ایسے معاشرہ میں کرپشن، لوٹ مار ناپید ہوتی ہے۔ جرائم کی کمی ہوتی ہے لیکن جس معاشرے میں قومی خزانے لوٹنے والے بھی آزاد پھر رہے ہوں، قتل و غارت میں ملوث اشخاص پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے ان کا حال ہماری

بجروں کو اپنا ساتھ دینے کی وجہ سے کلین چٹ دیئے جانے کی وجہ سے احتساب کا سارا عمل ایک مذاق بن کر رہ گیا بلکہ اس دور میں لوٹ مار کرنے والوں کا ایک نیا ٹولہ متعارف ہوا۔ سیاست دانوں، صنعت کاروں کے علاوہ مشرف کے جرنیل ساتھیوں نے بھی کھل کر لوٹ مار شروع کی اور یوں احتساب کا ایجنڈا لے کر میدان میں آنے والا خود اپنے ہی ایجنڈے پر عمل کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔

کرپٹ اعظم آصف زرداری مسندِ اقتدار

پُر مشرف کے جانے کے بعد پھر آصف زرداری جیسے کرپٹ ترین شخص کو ملک کے اعلیٰ ترین صدارت کے عہدہ پر بٹھا دیا گیا۔ شیلٹمنٹ نے اس کی توضیح یہ پیش کی کہ بے نظیر کے قتل کے بعد سندھ میں لگی آگ کو بجھانے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ چودہ جماعتیں پاس نہ کرنے والے اور ایک دور میں اپنے باپ کے سینما بینو کراچی میں ٹکٹیں بلیک کرنے والے اور بے نظیر کے دور میں بھتہ وصول کرنے والے کو ایٹمی طاقت کے حامل ملک کی باگ ڈور تھما دی گئی۔ اسی پارٹی کے یوسف رضا گیلانی کو جو کرپشن کے جرم میں سزا کاٹ چکا تھا، وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ یعنی دونوں بڑے عہدوں پر کرپشن میں ملوث اور سزا یافتہ مجرموں کو بٹھا دیا گیا۔ اس سے بڑی قوم کی بد قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔

شہنشاہ کرپشن تیسری مرتبہ وزارتِ عظمیٰ

کی مسند پر

آصف زرداری کے بعد الیکشن جیت کر آنے والا شخص سرتاپا کرپشن میں ملوث نواز شریف تھا جس کو

کاموں کے لئے حکم امتناعی جاری کرنے اور کرپشن کیسوں کو سالہا سال تک لٹکانے کی وجہ سے ملک وقوم کو شدید نقصان پہنچتا رہا ہے۔

مفاد پرست اور گونا گوا بہرہ

میڈیا کرپشن کو دوبار تارہا

ویسے تو موجودہ دور میں میڈیا کو معاشرے کی آنکھ اور کان قرار دیا جاتا ہے لیکن ہمارے ملک میں دیگر طبقوں یا اداروں کی طرح میڈیا بھی مفاد پرستی کی انتہا پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے اصل کام یا مقاصد کی راہ میں مالی، سیاسی مصلحتیں آڑے آتی رہی ہیں۔ بڑے بڑے اخباری گروپ یا چینلوں کے مالکان نے چونکہ حکومت وقت سے اربوں روپے کے اشتہارات لینے ہوتے ہیں لہذا انہیں اس کی پروا نہیں کہ مسند اقتدار پر سرتاپا کرپشن میں ملوث شخص بیٹھا ہے۔ اس کے ماضی

طریقہ کا ہوتا ہے۔ یہ کام ملک کی عدلیہ کو انجام دینا ہوتا ہے لیکن اس ملک میں عدلیہ کا کردار بھی ہمیشہ مایوس کن رہا ہے۔ جب ملک کا وزیراعظم تک کرپشن میں ملوث ہو تو اس پر کون ہاتھ ڈالے گا؟ عدلیہ ہی ایسا ادارہ رہ جاتا ہے جس کو ایسے نازک موقع پر اپنا کردار ادا کرنا چاہئے لیکن یہاں جج حضرات ہی دھڑکیوں میں بے نظر آتے رہے۔ چند ججوں کی ہمدردیاں ایک پارٹی کی طرف دوسروں کی دوسری پارٹی کی طرف۔ جج حضرات لوٹ مار اور کرپشن کو مالیاتی خورد برد کا کیس قرار دیتے رہے اور کہتے رہے کہ ”عدلیہ تحقیقاتی ادارہ نہیں“ حالانکہ ملک کی ایف آئی اے، پولیس، کرپٹ ہو، احتسابی ادارہ نیب مصلحت کی وجہ سے کسی بڑے کرپشن کی وجہ سے ہاتھ نہ ڈال رہا ہو تو باقی صرف اعلیٰ عدالت ہی رہ جاتی ہے جس کو اپنا آئینی کردار ادا کرتے ہوئے اس کا نوٹس لینا چاہئے۔ عدلیہ کے غلط

پروفیسر ریاضت منجر کی اساتذہ کرام ہنگامہ شکر پر حق پرستوں کا دلکش عالم

کاغذ پر دست کرنے والی کتاب ام کتاب ”تجوید تلفظ“ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

پروفیسر ریاضت منجر نے 15 سال کی ریاضت کے بعد 21 ہزار مشکل ترین الفاظ پر لغات ”آؤ ہم دریافت کریں“ تیار کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں 95% اساتذہ کرام کا اردو تلفظ درست نہیں ہے انہوں نے درست تلفظ کی ادائیگی کیلئے ایک خوبصورت کتاب ”تجوید تلفظ“ تیار کی ہے۔ آرٹ پیپر 3 جلدوں پر خوبصورت انداز سے شائع کی ہے۔ اس کتاب پر محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان، علامہ عبدالستار عاصم، محمد فاروق چوہان کی آرا شامل ہیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا ہے کہ یہ کتاب ہر صحافی، اسکالر، پرنس، اساتذہ کرام، خصوصاً تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو ضرور پڑھنی چاہیے اور پروفیسر ریاضت منجر نے 15 سال کی ریاضت کے بعد اس قدر رسک بند علمی کام کیا ہے کہ انہیں اہل وطن کو سونے میں تولنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا علمی فی کارنامہ ہے بلکہ یہ کتاب تمام تعلیمی اداروں کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ کتاب کا ہدیہ: 500 مئی آرڈر یا چیک ارسال کر کے کتاب حاصل کر سکتے ہیں شکریہ

منصفانہ فیضانِ علم، دانش و تبحر، امن و امان، سکھ و سچ، سچ و سچ

میں اس کی ساتھی اور شریک اقتدار رہی اس کے بعد جنرل مشرف دور کی کرپشن پر بھی صوبہ خیبر پختونخوا میں اپنی حکومت بچانے کی خاطر ان کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ مذہبی جماعتوں کی اسی منافقانہ روش اور بکاؤ مال بننے کی فطرت نے معاشرے میں کرپشن کو فروغ دینے میں گھٹاؤ نا کردار ادا کیا۔

کرپشن کی انکوائری پر واویلا کیسا؟

ملک کے تحقیقاتی ادارے جن کے فرائض میں شامل ہے کہ اگر کسی نے ناجائز اثاثے ملک میں بنائے ہیں یا بیرونی ممالک میں بنائے ہیں اس کی مکمل تحقیق کرے۔ ناجائز کاموں میں ملوث ہو کر، غیر قانونی کاموں میں ملوث ہو کر اگر کسی نے اپنی دولت غیر قانونی طریقے سے یعنی سٹیٹ بینک کی اجازت لئے بغیر منی لانڈرنگ کے ذریعے باہر منتقل کی ہے تو یہ سنگین جرائم میں شامل ہے۔ اگر ایک شخص کی دولت صاف شفاف کمائی سے حاصل کی گئی ہے تو پھر اسے چھپانا کیسا؟ اسے دوسرے ممالک میں کیوں منتقل کیا گیا؟ ہمارے لیڈر غیر ملکی سرمایہ کاروں کو تو کہتے نہیں تھکتے کہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کرو لیکن اپنی ساری دولت اپنی فیکٹریاں بند کر کے باہر منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یہ کیسی حب الوطنی ہے؟ امریکہ یورپ کا ایک عام شخص ہو یا ملک کا صدر اس کا بینک اکاؤنٹ اس کے اپنے ملک میں ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے ایمان داری اور جائز طریقے سے یہ کمائی کی ہوئی ہے۔ اب جبکہ اللہ کی لاکھوں کے چلنے کا وقت آ چکا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیات کے اثاثوں اور کمائی کی چھان بین کا وقت آ پہنچا ہے تو اس پر واویلا کیسا؟ اگر آپ نے یہ دولت صاف شفاف طریقے سے کمائی ہے تو پھر آسمان کیوں سر پر اٹھایا جا رہا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے

کے جرائم کیا کیا ہیں بلکہ وہ ان جرائم کو سامنے آنے سے دبائے گا۔ یہی حال نام نہاد اور بکاؤ صحافی، کالمسٹ، اینکر پرسن کا بھی ہے جو کبھی ایک شخص کے حق میں اور دوسرے شخص کی مخالفت میں اپنا زور قلم استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی کسی نے ایک گروپ کی طرف سے پیسے پکڑے اور کبھی دوسرے گروپ کی نوازشات سے لطف اندوز ہوئے۔ میڈیا کی اس مفاد پرستانہ پالیسی کی وجہ سے کرپشن اور لوٹ مار کو فروغ حاصل ہوتا رہا اور اصل حقائق سامنے نہیں آتے رہے۔ کبھی آپ مختلف حکومتوں کی ان نام نہاد ”صحافیوں“ پر کی گئی نوازشات کی لسٹ دیکھیں یا بحریہ ٹاؤن والے کی طرف سے صحافیوں کو ڈالی جانے والی ہڈی کو نیٹ پر تلاش کریں تو آپ کے بکھرے جائیں گے۔

بکاؤ مذہبی لیڈر کرپشن کے ساتھی بنتے رہے
عام سیاست دانوں کا تعلق تو زیادہ تر جاگیردار، سردار، صنعت کار خاندانوں سے رہا ہے لیکن مذہبی لیڈر تو مدارس سے فارغ التحصیل اشخاص ہیں جو مساجد و مدارس میں قرآنی تعلیمات کا درس بھی دیتے رہے اور ساری عمر یہی تعلیمات بھی حاصل کرتے رہے، ان کا کرپشن اور لوٹ مار بڑھانے میں کردار ہمیشہ شرمناک اور گھٹاؤ نا رہا ہے۔ جمعیت العلماء اسلام کے مولانا فضل الرحمان ماضی میں ہر دفعہ کرپٹ بے نظیر کے ساتھ رہے، اس کے بعد کرپشن کے بادشاہ آصف زرداری اور اس کے بعد کرپشن کے شہنشاہ نواز شریف کے دامن سے ایسے چمکے کہ اب تک یہ دامن چھوڑ نہیں رہے۔ ان چند علماء حضرات نے اپنے ذاتی اور سیاسی مفاد کی خاطر ان کی لوٹ مار اور کرپشن پر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے رکھیں۔ اسی طرح سے جماعت اسلامی نواز شریف کے پہلے دور

بنانے والے سرکاری افسران کی گلو خلاصی ہو سکے گی۔ جب قدرت ہی اپنے شکنجے کس چکی ہے تو کس کس کی گردن اس شکنجے میں آئے گی سب کچھ جلد سامنے آ جائے گا۔

جناب نے بنایا پاکستان، ہم نے بنا دیا

ہڑپستان، تاریکستان، بیمارستان

بانی پاکستان نے اس کماری سے لے کر خیر تک کے لوگوں کو اکٹھا کر کے اسے ایک قوم بنا دیا اور پھر اسے ایک نیا ملک پاکستان لے کر دیا اور یہ کبھری ہوئی قوم پاکستان کے نام سے پوری دنیا میں جانی جانے لگی لیکن آپ دیکھیں کہ خصوصاً ان 46 سال کے عرصہ میں جس میں کرپٹ لوگ برسرِ اقتدار رہے ایک تو ملک کے خزانے لوٹ کر اسے ہڑپستان بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ عوامی فلاح کا کوئی بھی بڑا منصوبہ توانائی کی فراہمی کے لئے ڈیم وغیرہ مکمل نہ کیا جا سکا اور آج پورا ملک تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ انگریز کے جانے کے بعد کراچی تالا ہو تو کجا ایک انچ پٹری کا اضافہ بھی نہ ہو سکا۔ ہسپتال بیماروں سے بھرے ایسا منظر پیش کر رہے ہوتے ہیں کہ شاید یہ بیماروں کا ملک ہے۔ ایک تو خوراک کی کمی اور وہ بھی ناخالص تو بیماریاں تو طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوں گی۔ عرصہ 46 سال سے غیر ملکی قرضوں کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے والے ملک کو کوئی دوسرا ان بیساکھیوں سے نجات نہیں دلائے گا۔ اسی ملک کے ایماندار قابل اور مخلص لوگ جو بے لوث بھی ہوں جب تک ملک کی باگ ڈور نہیں سنبھالیں گے کروڑوں عوام غربت، جہالت، ناخواندگی کی چکی میں پستے رہیں گے۔



خلاف سازش ہو رہی ہے، کبھی آواز بلند ہوتی ہے کہ صرف ہمارا ہی استحصال ہو رہا ہے یعنی چور ہی شور مچائے جا رہے ہیں۔

جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں بلکہ پاک

صاف ہو جائے گی

کرپشن اور لوٹ مار کی انکوائری پر جو ملک کی اعلیٰ ترین عدلیہ سپریم کورٹ کی زیر نگرانی ہو رہی ہے حکومت وقت دوغلی پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ عدالت کے ہر فیصلے کو من و عن تسلیم کیا جائے گا۔ دوسری طرف ایسے بیانات سامنے آ رہے ہیں کہ فیصلہ خلاف آیا تو تمام آئینی و قانونی آپشنز استعمال کریں گے۔ یہ مضحکہ خیز بیانات شکنجے میں پھنسنے والوں کی بھلاہٹ کا ثبوت ہیں۔ روز بروز یہ کہا جا رہا ہے کہ جمہوریت کو خطرہ ہے۔ حالانکہ کرپشن سے پاک جمہوریت سے ملک و قوم کو جو فائدہ پہنچے گا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور آئندہ بڑے سے بڑے عہدے پر کسی کو کبھی غلط کام کرنے کی ہمت نہیں ہوگی اور قومی خزانہ اور بیرونی ممالک سے آئی امداد لٹنے سے بچائی جاسکے گی۔

پھندوں اور شکنجوں کا وقت آ پہنچا

اس ملک میں بنیادی تبدیلیوں، عوام کی فلاح کے لئے قدرت سارا انتظام اپنے ہاتھ لے چکی ہے اور صرف ایک ہی پارٹی مسلم لیگ نہیں، پیپلز پارٹی، قائد اعظم مسلم لیگ، ایم کیو ایم، اے این پی کے کرپشن میں ملوث لوگوں کے انجام کا وقت قریب آ پہنچا ہے اور آصف زرداری، آفتاب شیر پاؤ، چوہدری شجاعت حسین سمیت ہزاروں ایم این اے، ایم پی اے بھی اس شکنجے سے نچ سکیں گے۔ نہ ہی ناجائز اثاثے

Pakistanpoint Waqar احمد

چیزیں فروخت کرتے ہیں) میں نے اس مچھلی کو کوڑے میں بھینکنے کی بجائے ایک درخت کے نیچے رکھ دیا کہ کتے بلیاں کھالیں گے۔ میں نے مچھلی والا شاہرہ درخت کے نیچے رکھا ہی تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے نیچے بہت سے بچے پلٹ گئے ہیں لیکن مجھے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ مسجد کے امام صاحب نے کہا کہ اس پیڑ پر جنوں کا بسیرا ہے اس لئے اس پیڑ کے نیچے غلاطت پھینکنا ٹھیک نہیں۔

محترم ضیا کمال صاحب جو کہ بحری جہاز کا کپتان تھا۔ اس نے اپنی والدہ کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ ضیا صاحب جب اپنی کار میں داخل ہوئے تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کار کو کوئی پیچھے سے دھکا دے رہا ہے، موصوف نے پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ کار سنارٹ کی تو اس نے محسوس کیا کہ جیسے کار کے اوپر کوئی کود رہا ہو۔ اس نے کار سے اتر کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسی دوران اس کی والدہ بھی آ گئیں۔ جب وہ کار میں بیٹھی تو پھر اچھل کود کا طوفان کار پر برپا ہو گیا۔ کار کی چھت کو کوئی نقصان نہیں ہوا کہ کوئی ان دیکھی مخلوق اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔

عقل و بصیرت کی توہین

جون 2017ء کا ”حکایت“ مجھے بہت تاخیر سے۔ اس شمارے میں محترم شاہد لطیف کی لکھی ہوئی عقل و فکر سے عاری باتیں پڑھ کر ”لاتوں کے بھوت“ (اسرا ریات) پڑھ کر بڑا تعجب ہوا کہ پاکستان کے لوگ اس قدر تو ہم پرست بن کر ابھی تک پتھر کے زمانہ میں رہ رہے ہیں اور غیر مسلم چاند ستاروں پر کندیں ڈال رہے ہیں جبکہ مسلمانوں کے صحن خانہ میں آفتاب عالم تاب روشن ہے (قرآن کریم) لیکن پاکستان کے نام نہاد مسلمان لوگ ابھی تک اندھیرے میں ٹانک ٹوئیاں کھا رہے ہیں۔

ایک سولہ سال کے لڑکے کو دورہ پڑ گیا اس کے گھر والے اسے مسجد کے مولوی صاحب کے پاس لے گئے لیکن مولوی صاحب کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی لڑکا ٹھیک ہو گیا۔ مولوی صاحب نے لڑکے سے پوچھا کہ تجھے تکلیف ہونے سے پہلے تم نے کیا کیا تھا۔ لڑکے نے کہا کہ امی بازار سے مچھلی لائی تھیں جو کہ کسی وجہ سے خراب ہو گئی (کیونکہ پاکستانی اکثر دکاندار خراب ہی

کی شاید ہی دنیا کی کسی قوم نے آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہو۔

کیا آج ہم نے کبھی سوچا ہے کہ اس امانت میں کیا خیانت کر رہے ہیں کیونکہ ہم آزاد ہیں۔ اخلاقی قدروں سے آزاد وقار اور غیرت سے آزاد، شرم و حیا سے آزاد، جشن مناؤں، بھگڑنے والوں، انڈین گیت گاؤں کیونکہ ہم آزاد ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے انگریزوں اور ہندو بننے کی غلامی کی زنجیریں توڑی تھیں ہماری آج کی نسل نے کوئی زنجیر سلامت نہیں رہنے دی۔

جولائی کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل موجودہ حالات کی صحیح عکاسی کر رہا ہے۔ اظہار خیال میں برادر امجاز حسین شہار صاحب نے دماغ کو شگفتگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے والے قدرتی مناظر اور صنف نازک کو اپنے انداز فکر میں شائع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ محترم جواب عرض یہ ہے کہ قدرتی مناظر والا خیال تو آپ کا اچھا ہے لیکن صنف نازک کی تصویر ٹائٹل پر لگانا ”حکایت“ کا مشن نہ ہے۔ صرف ایک بار اگر مجھے صحیح یاد ہے 1975ء یا 76ء میں کشمیری لڑکی جو زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، والا ٹائٹل آیا تھا۔ ویسے شہار صاحب! اس عمر میں آپ کو صنف نازک والے ٹائٹل کی کیا ضرورت محسوس ہوئی ہے؟ ادارے دونوں اچھے ہیں لیکن مدیر ”حکایت“ نے ”صبح کے تخت نشین شام کو مجرم ٹھہرے“ میں خوب لکھا ہے۔

”ستاروں بھری رات“ یہ مقناطیسی کہانی، اسراریات، رومانی کیفیات اور عمدہ منظر نگاری کی بدولت دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ موصوف کچھ زیادہ ہی پڑھے لکھے اور تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ الاؤ، پل پل رنگ بدل رہی ہے، محترم رمضان قیوم صاحب کی ایک اچھی کاوش ہے۔ ”چودہ رانی جی“ کو میں بے غیرتی کی انتہا نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ محترم خادم حسین کی

میری والدہ نے کار سے اتر کر جوتی ہاتھ میں لے کر کہا کہ تم جن ہو یا بھوت، جو بھی ہوا اپنے گھر میں ہو گے۔ دکھائی نہیں دیتے ہو تو کیا ہوا موجود تو ہو۔ میری یہ جوتی دیکھ رہے ہو مار مار کر دنبہ بنا دوں گی یہ گہہ کر اور جوتی لے کر کار کی چھت کی طرف لپکی اور ساتھ ہی غصے میں بڑبڑا رہی تھی اور پھر ایک دم سکون ہو گیا یعنی جن یا بھوت جوتی سے ڈر گئے۔

یہ کہانی سن کر علم روتا ہے اور عقل ماتم کرتی ہے کہ یہ ہیں پاکستان کے نام نہاد مسلمان لوگ جو ابھی تک پتھر کے زمانہ میں رہ رہے ہیں، صد حیف در حیف پاکستانی نام نہاد مسلمان لوگوں پر۔

✽ ایم اے جاوید۔ انگلینڈ

آزادی کا سفر

اگست آزادی اور قیام پاکستان کا مقدس مہینہ ہے۔ پاکستان کی طرف ہجرت کا یہ سفر اس قدر کٹھن، پرخطر، دردناک واقعات سے پُر ہے کہ آج بھی اس دور کے لوگوں سے ان واقعات کی تفصیل سنتے ہیں تو جسم لرزنے لگتا ہے۔ اگست ہماری غفت تاب بہنوں، بیٹیوں کا مہینہ ہے نے کی عصمتیں 1947ء کی جینٹ چڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے کتوؤں میں کود کر اور اپنی جانوں کے نذرانے دے کر یہ پاک وطن ہمیں دیا تھا۔ اگست معصوم پھول جیسے بچوں کا مہینہ ہے جن کو ان درندے ہندوؤں اور سکھوں نے برچھیوں میں پردر کر قہقہے لگائے تھے۔

اگست ان لہو لہان قافلوں کا مہینہ ہے۔ جو راستے میں اپنے پیاروں کی لاشیں بکھیرتے اور لہو بہاتے ہوئے اس پاک وطن کی سرحد میں داخل ہوئے تھے۔ ہندوستان کی دھرتی ان قافلوں کے خون سے لال ہو گئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے آزادی کی جو قیمت ادا

لیکن کتنے شرم کی بات ہے کہ پورے ملک وقوم کے لئے بدنامی اور جگ ہنسائی کا باعث بن رہی ہے اور اپنی قبر الگ دیکھتے انگاروں سے بھرتی جا رہی ہے۔ ”کفر توڑ“ میں غازی محمود دھرم پال واقعی عجیب دور کی عجیب شخصیت تھے جس راہ کا انتخاب کیا، سوچ، سمجھ، غور و فکر اور تحقیق کے بعد چلنے کا فیصلہ کیا اور نتیجہ کی پروا کئے بغیر ڈٹ گئے۔ اب ایسے کھرے انسان چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔

”زمانے کو برا نہ کہو“ تک بات ٹھیک ہے یہ رہیں، رواج، اقتدار اور معاشرے کا چلن ہمارے ردیوں، چلن اور برتاؤ کے مرہون منت رہے ہیں پھر قریب رہنے والوں نے جو آسان جانا اور کچھ وسیع کی مجبوری میں اپنا لیا جس سے معاشرہ کی ایک شکل بن گئی اور زمانہ کو قدم بڑھانے کو سمت میسر آ گئی اور معمولی بگاڑ سنوار کے ساتھ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ جہاں تک عزت بچانے کے لئے کنواں میں کودنے والی بات ہے اس پر علمائے بہت کچھ لکھا اور تقریباً ایک ہی فیصلہ سامنے آیا لیکن یہاں ابہام کی صورت پیدا کی گئی ہے، ایسی صورت حال میں عورت کا کیا اقدام ہو اس کا جواب مختصراً کیا ہو؟ کوئی بتا سکتا ہے یا متبادل کیا حکمت عملی اپنائی جائے؟ حتمی رائے آنا چاہئے۔

”خدا دیکھ رہا تھا“ میں شانمات نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا لیکن پیار کا جذبہ خود رو جھاڑی کی طرح دل کی زمین میں جڑیں پھیلانے لگا جس کا اس کے بھائیوں نے قلع قمع کر دیا، سوچنے کی بات ہے سات آٹھ دہائی گزر گئی ہیں اس جرم میں کتنی لڑکیوں کا قتل ہوا، لڑکوں کو سرعام لہولہاں کر دیا گیا، خاندان تباہ ہوئے، زمینیں، جائیدادیں بک گئیں، گھر چھوڑنے پڑے، گھروں جھانسی چڑھے اور جیل میں خواب دیکھنے کی عمر ضائع ہو گئی لیکن آج بھی ویسے حالات ہیں، کسی نے سبق نہ سیکھا۔ آرزو

تحریریں گو چھوٹی ہیں ”تبسم بیجو“، ”خلافت اور امارت“ اور قلم قتلے لیکن سبق آموز ہیں۔ ”دیوار حرم کو چلے“ ایک مشاہداتی سفرنامہ ہے۔ اسے ترتیب دینے اور لکھنے میں ستار صاحب کی محنت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ یہ انہوں نے میری گزارش پر لکھا ہے۔ دعا ہے کہ رب کریم سب پڑھنے والوں کو یہ سعادت نصیب فرمائے۔ آمین!

----- محمد صدیق - جند والا تحصیل چویناں

پرکھ پرچول

برادر م عارف محمود صاحب، السلام علیکم! محترم پروفیسر فلک شیریل نے مخاطب کیا ہے شکریہ قبول کیجئے۔ میں سالہا سال سے مختلف رسائل میں تبصرے لکھ رہا ہوں ایک انداز تحریر بن گیا ہے کوشش رہتی ہے کہ برائی اپنانے والے کرداروں کو لتاڑا جائے اور مثبت سوچ رکھنے والوں کو سراہا جائے۔ کسی ناسور اور نفل انسانیت کی تقلید کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ ”ستاروں بھری رات“ میں ناہید پرندوں کو بارنے کی وجہ سے روکھ گئی تو میلہ کی رونق پھینکی پڑ جائے گی؟ مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جب پرندے حلال کئے گئے ہیں اور انسان کے لئے پوری زمین پر نعمتیں پیدا کی گئی ہیں روزانہ صرف پاکستان میں لاکھوں جانور ذبح ہوتے ہیں پھر اعتراض کرنا اور ناراض ہونا مناسب بات نہیں ہے البتہ پرندوں کا فطرت کا حصہ اور قدرت کا حسن ہونے میں کیا شک ہے۔

”وہ طوائف بن گئی“ میں افضل کو اپنے کرتوتوں، بیوی سے زیادتی اور اولاد سے بے توجہی کی سزا ملے گی بلکہ وہ کافی حد تک بھگت چکا ہے لیکن عذرا کی موجودہ عادتوں اور مصروفیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شروع سے ہی معاشرتی اور گھریلو پابندیوں سے استثنائی ہوئی تھی اور آزادی حاصل کرنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی

اس کا جوش دلی خواہش اور جذبہ شہادت کا مہر ہونہ تھا، اسے موت کا بھلا کیا خوف تھا۔ اب شازیہ کی اور کھویا رہنا کس زمرے میں آتا ہے۔ کیا شہید روح بے چین نہ ہوگی؟ محترمہ بہن شاہدہ شاہ نے کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کسی شہید کی ماں کو اداس اور طرہ پیش نہیں کرنا چاہئے۔ کہانی کا آخری پیرا گراف پڑھ فیصلہ کیا جائے کہ میرا موقف کہاں تک صحیح ہے۔ ”ماقدم“ میں واضح سبق موجود ہے کہ انسان منصوبہ بناتا ہے پوری جزویات کے ساتھ معمولی بات کا خیر رکھتا ہے، کسی کمزوری کے حل پر شروع میں ہی نظر رہے لیکن تقدیر ساری کارروائی دیکھتے ہوئے مسکراتی رہا ہے۔

”قلم قلم“ پڑھ کر جسم پر لپکی طاری ہو گئی، گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے مکافات عمل کا سوچ نہیں ہیں۔ جب عبرت کا نشان بن جاتے ہیں تو احساس کرنا شروع کرتے ہیں لیکن تب تک زخم ناسر بن چکے ہوتے ہیں۔ ”گناہ اور گرفت“ میں ناصر جس بیچ پر جذبات کو پکلا میں اسے دور حاضر کا ولی کامل کہوں گا۔ جوان لڑکی، رات، تنہائی اور خود لڑکی کی پیش قدمی کے باوجود شیطان کو عبرت ناک شکست دینا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

”دیار حرم کو چلے“ شائع کرنے کا شکریہ قبول کیجئے۔ جن احباب نے موبائل سے مبارک باد دی میں سب کا شکر گزار ہوں۔ سفر نامہ پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جو دیکھا وہ سچ لکھا ہے اور زیب داستان کے لئے اور سنی سنائی باتیں شامل نہیں کیں اور ہماری بیگم نے پڑھنے کے بعد سراہا ہے اور اپنا ذکر اتنے ادب احترام سے کرنے پر شکر یہ ادا کیا ہے۔

بھی دوسروں کی عزت و غیرت سے چھیڑ چھاڑ، باوجود انجام سے مکمل آگاہی ہونے کے رک نہیں سکی۔ کیا انسانی فطرت کے تقاضے پتھر پر لکیر ہیں، ہم ایک ہی منظر زندگی بھر دیکھتے رہیں گے؟

”الاؤ“ میں عبدالرحمان اپنے گناہوں کی وجہ سے گئے گوڈے تک خطروں میں پھنس چکا ہے پھر اپنی بزدلی کی وجہ سے منافقوں کے ہاتھوں میں بلیک ہو رہا ہے جو اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں وہ اس کی بریت کے لئے کتنے مخلص ہیں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مجھے سارا قافلہ ہی غدار دکھائی دیتا ہے جو بچ بچا کر منزل پر پہنچ گیا۔ یہ اس کی غلطی نہ ہوگی بلکہ قسمت پر فخر کرے۔

”موت نے فیصلہ کر دیا“ پڑھنے اور زبانی حد تک داد دینے میں آسان ہے لیکن جنگل میں شیروں، رینجیوں اور بھیڑیوں کا مقابلہ کرنا اور مست بھیمنوں کی لڑائی میں مداخلت سیدھا موت کی نکت کٹوانے کے برابر ہے۔ اب وہ جذبہ حب الوطنی، جوان مردی اور خطروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا دل کہاں سے لائیں؟ ”جنت گم گشتہ“ میں صنوبر کو من پسند زندگی اور ماحول مل گیا۔ حسن کو سراہنے والے فرشی سلام کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی لیکن خلوص دل سے من کا کھرا اور صحیح مقام دینے والا حسن ہی تھا جو شوہر کی صفات پر پورا اترتا تھا لیکن جب عورت کو ڈال ڈال بیٹھنے، بھد کئے اور چھپانے کا چسکا پڑ جائے تو وہ اپنے گھونسلے، حقیقی گھر کی طرف کم ہی لوٹ کر آتی ہے۔ صنوبر کے لئے پہلی اڑان ہی آخری ثابت ہوئی۔ جب نئی دنیا دریافت کر لی تو سارے رشتے، عزت، احترام اور عورت کا اصل مقام بھول گئی۔

”کمانڈو“ میں حوالدار طارق کی رگوں میں پارہ بھرا ہوا تھا، وہ دشمن کے مشن کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

”سائیں مست“ (جون کے صفحہ 66 پر) آپ نے لکھا ہے ”حتیٰ کہ بھارت آزاد کشمیر میں بھی کئی مریض دیکھے“۔

مجھے اپنی لاعلمی پر شدید حیرت ہوئی۔ ہم تو آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ سمجھے بیٹھے ہیں مگر آپ نے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اس الجھن سے نجات دلادیں۔ ممنون رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کاتب صاحب کی کسنی کی غلطی ہو۔

☆ ----- محمد ادریس انور۔ چکوال

☆ محترم ادریس انور صاحب! حسب سابق آپ کا خط تنقید کے ساتھ طے لے ہوئے ہے تبھی تو آپ الجھن میں پڑ گئے ہیں وزنہ بات تو آپ کو سمجھ میں آگئی ہے۔ بھارت کے بعد لفظ ”اور“ تھا لیکن کمپوزر سے رہ گیا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں جو آپ خود سائنٹہ الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ (مدیر)

استحصال اور استیصال

عزیزم عارف محمود، السلام علیکم! آپ نے میرا قلم برداشتہ تحقیقی مضمون ”پیری مریدی کا کھیل“ شائع کیا۔ شکریہ! ہو سکتا ہے کہ پیری مریدی کے قائل لوگ اس تحریر پر جربز ہوں تو وضاحت کر دوں کہ اقبالؒ نے پیری مریدی کو ہدف تنقید نہیں بنایا بلکہ اس کھیل کو خلاف اسلام قرار دیا ہے۔ ہمارے ملک میں وہ کون سا مقام ہے جہاں یہ کھیل نہ کھیلا جا رہا ہو۔ آئے دن بے شمار واقعات پڑھنے اور دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو استحصالی قوتوں کو تحفظ دیتا ہے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہائے زندگی تو اسلام سے متضاد ہیں، انہیں کس نے جائز سمجھ کر فقاوے جاری کئے ہیں؟ ہمارے ملک میں جو کرپشن، اقربا پروری اور سفارش کا کلچر عام ہو گیا۔ واللہ! اس کا واحد علاج

اصل ایڈیٹر کون؟

جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ گزارش ہے ”حکایت“ میں کافی مدت سے پڑھ رہا ہوں۔ تقریباً 1973ء پہلی بات تو یہ ہے کہ رسالے کا اصل ایڈیٹر کون ہے جو بھی ہیں پہلا صفحہ وہ لکھا کریں۔ کبھی کوئی صاحب ہوتے ہیں اور کبھی کوئی۔ رسالے میں کبھی کبھی کوئی اسلامی کہانی بھی شائع کریں۔ ہم گاؤں کے لوگ ہیں ہمیں گاؤں کی کہانیاں پسند ہیں۔ صابر حسین راجپوت کی کہانی بھی دیا کریں۔ ایک رسالہ ہمیں کافی لیٹ ملتا ہے ہر ماہ کی 10 تاریخ کے بعد۔ رسالے کا معیار اچھا ہے، اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں صرف ”حکایت“ پڑھتا ہوں۔ شاید یہ میرا آخری خط ہو کیونکہ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا۔ ”حکایت“ میں نذیر صاحب اور افضل رحمانی کی کہانیاں مجھے پسند ہیں اور ان کا انتظار بھی رہتا ہے۔ امید ہے میرا یہ خط ضرور شائع کریں گے۔

☆ ----- محمد اشرف دڑاج۔ منڈی بہاؤ الدین

تجاہل عارفانہ

محترم برادرم عارف صاحب، السلام علیکم! جون کا ”حکایت“ موصول ہوا۔ فہرست مضامین پر نظر پڑی تو آپ کی جدت پسندی بے حد پسند آئی اسے برقرار بھی رکھئے گا۔ شکریہ!

محمد افضل رحمانی صاحب اصل عاشق رسولؐ تو آپ ہیں جو تاجدار مدینہؐ نے آپ کو اپنی زیارت کا شرف عطا فرمایا ہے۔ آپ کو بہت بہت مبارک۔

رحمانی صاحب کا بڑا پین ہے جو انہوں نے اپنی غلطی (جون صفحہ 162) تسلیم کر کے قارئین سے معذرت کر لی ہے۔ محترم رحمانی صاحب مضمون

بات“ کے زیر عنوان آپ کا ادارہ کافی عرصہ کے بعد پڑھ کر بے حد خوش ہوئی۔ آپ کا شعر اور تبصرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کی بالکل صحیح عکاسی کرتا ہے۔ بلکہ درست ثابت ہوا ہے۔

افضال مظہر انجم کا خصوصی فیچر ”ایک خوفناک سازش پڑھ کر روکنے کھڑے ہو گئے۔ مظہر صاحب نے اس خوفناک سازش کو بے نقاب کر کے ”حکایت“ کے قارئین پر احسان عظیم کیا ہے۔ ”ستاروں بھری رات“ میں گلیمر ضرورت سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے جبکہ ”الاد“ جو شیلے انداز میں اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے۔

طویل کہانیوں میں موت نے فیصلہ کر دیا۔ ”خدا دیکھ رہا تھا“ اور ”جنت گم گشت“ بہترین کہانیاں ہیں اور اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے بھرپور تاثر کی حامل ہیں۔

”دیبا حرم کو چلے“ ایک معلوماتی سفرنامہ ہے۔ گو یہ سادہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے مگر مصنف نے اپنے سفر کے تسلسل کو قائم رکھا ہے اور یہی ایک اچھے سفرنامے کی خوبی ہوتی ہے۔ بہر حال شہار صاحب یہ مقدس سفرنامہ لکھنے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سیدہ شاہدہ شاہ کا ”کمانڈ“ پڑھ کر دل پیسج گیا اور آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ ”وہ طوائف بن گئی“، ”چوہدرانی“، ”زمانے کو بُرا نہ کہو“، ”گناہ اور گرفت“ بھی اچھی اور پُر اثر کہانیاں ہیں البتہ غزلیں اس بار کوئی خاص نہ تھیں۔ سکندر خاں بلوچ کا ”سو لہجہ نامہ“ اور خادم حسین مجاہد کے ”قتلے“ کافی دلچسپ ہے۔

چوہدری اصغر علی جیدی۔ اوکاڑہ

جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہے۔ جب تک کوئی جری حکمران ایک قلم اس کو ختم نہیں کرتا، سب کچھ چلتا رہے گا اور حساس لوگ کڑھتے، جلتے اور ترپتے رہیں گے۔

آج پیروں کے پاس جاگیریں، گاڑیاں اور کٹھیاں دیکھ کر انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا کاروبار ہے جس میں گھانے کا شائبہ تک نہیں کیونکہ ابھی جہالت عام ہے۔

بندۂ آزاد کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ حکومت انسان کے لئے زہر قاتل ہے۔

حکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا

ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

اور اب کچھ اصلاح ادب کی بات ہو جائے۔

لفظ استحصال اور استیصال کے معنی میں واضح فرق ہے۔ استحصال یعنی مکاری اور جبر کے ذریعے کسی چیز کو حاصل کرنا اور استیصال کسی چیز کو جڑ سے اکھیر دینا، بنیاد ہی ختم کر دینا، جیسے انگریز نے ہمارا استحصال کیا اور ہم نے تنگ آ کر ان کے نظام کا استحصال کر دیا۔ واضح ہو کہ پچھلے ماہ کے ”حکایت“ میں کسی صاحب نے استحصال کے بجائے استیصال کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اقبال کے ایک شعر میں لفظ ہرتا (ہارنا سے) کے بجائے کرتا کمپوز ہو گیا ہے۔ جو یقیناً طباعی غلطی ہے لیکن اس سے شعر کا مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آ سکتی ہے۔

”ہو کھیل مریدی کا“ ہوتا ہے بہت جلد“ مجھے امید ہے کہ قارئین کرام میرے اصلاحی ذوق کو دل آزاری سے تعبیر نہیں کریں گے۔

پروفیسر فلک شیریل۔ بھکر

ستاروں بھری رات میں گلیمر

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! ”کہنے کی

بھارت، افغانستان اور ایران مل کر ایک گریٹر پلان پر عمل کر رہے ہیں جس کا مقصد پاکستان کے خلاف ایک محدود جنگ ہے

سی پیک منصوبے کی حفاظت کا انتظام



gulzarakhter@gmail.com

☆ گلزار اختر کاٹھیری

بٹالین اس کے علاوہ ایف سی کے کئی ونگ، بارہ ہزار چاک و چوبند اہلکاروں پر مشتمل الگ ہے۔ اس ڈویژن کو جدید قسم کے جدید قسم کے ہتھیاروں کے علاوہ گاڑیوں اور ہیلی کاپٹروں کی سہولتیں میسر ہیں۔ ذرائع کے مطابق اسی دوران ایف سی کے کئی اور ونگ بھی تیار ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ونگ خیبر پختون خیز کور کو بھی دیئے گئے ہیں۔ خصوصی ٹریننگ کے ذریعہ یہ ونگ تیار کرنے کا مقصد انہیں فانا اور سوات سمیت خیبر پختونخواہ کے دیگر علاقوں میں تعینات کرنا ہے تاکہ وہاں سے فوج کو نکال کر فرنٹ لائن ڈیوٹی دی جاسکے۔

اس پلان پر 2008ء میں اس وقت کے آرمی چیف جنرل کیانی نے منصوبہ بنایا تھا۔ جب بلوچستان میں فوج کو پیچھے کر کے ایف سی کو آگے لایا گیا تھا۔ اب بلوچستان میں ایف سی نے ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ بغاوت کو بری طرح چل دیا گیا ہے۔ جس کے جواب

سی پیک منصوبہ اب اہم مرحلے میں داخل ہو جانے کے سبب فوج کے علاوہ چین بھی پاکستان میں اس طرح کی افراتفری نہیں چاہتا لہذا چین جو کہے گا۔ پالیسی میکر اس پر بھرپور توجہ دیں گے۔ چین نے سی پیک منصوبے پر سرمایہ کاری کرنے سے قبل گارنٹی مانگی تھی۔ اور پاکستان آرمی نے اس کی تعمیر اور حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کے بعد چین نے یہاں سرمایہ کاری شروع کی تھی۔ فوج جب کوئی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ تو اس میں وقت ضائع نہیں کرتی۔ جب پروجیکٹ کے لئے مسائل بھی مہیا کر دیئے جائیں تو کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔

لہذا سی پیک کی لمبائی کے لئے پہلا سیکورٹی ڈویژن ریکارڈ وقت میں ڈبیل دے دیا گیا ہے اور اس ڈویژن نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ اس کا سربراہ ایک میجر جنرل اس کے نیچے تین بریگیڈیئر، نو

بھارت کی پاکستان کے خلاف محدود جنگ کی کوشش

بی۔ بی۔ بی۔ حکومت اور اس کے اداروں سے آنے والے تمام بیانات اور حقائق صاف عندیہ دے رہے ہیں کہ بھارت اب پاکستان کے ساتھ ایک ”محدود“ سرحدی جنگ (صرف آزاد کشمیر میں) کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تمام جنگوں کی تاریخ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سرحدوں پر طویل کشیدگی بالآخر باقاعدہ جنگ پر منبج ہوتی ہے۔ کشمیر کی سرحدوں کی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ بھارتی قوم پرستی کے لئے نئے نئے خدا ایک طرف دنیا اور ملک کو جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف کشمیر میں فوج کی تیاری کے لئے ضروری وقت بھی دے رہے ہیں۔ یہ جنگ بی بی کے نظریاتی انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری سمجھی جا رہی ہے۔ بالخصوص 2019ء میں مکمل انتخابی جیت کے لئے پاکستان جیسے ملک کو سبق سکھانا اب سیاسی مجبوری بننا جا رہا ہے۔

موجودہ حکومت اپنے ہندو تناظر سے مجبور بھی ہے۔ کیونکہ وہ گزشتہ پچاس سال سے آر۔ ایس۔ ایس کے 30 ہزار سکولوں اور لاکھوں طلبہ کو یہی پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ اس کا عزم بھی دوہرا چکے ہیں۔ وزیر اعظم مودی کی عالمی دوڑ بھاگ ہو یا سفارتی مہم ہو یا پھر بھارتی میڈیا ہر طرف جنگ کا بلنگ رہا ہے۔ آئے روز جنگ بندی لائن پر شدید گولہ باری، ہلاکتوں اور پھر ویڈیوز اور جوابی ویڈیوز کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے جو بیانات دیے جا رہے ہیں۔ وہ معنی خیز بھی ہیں اور لرزہ خیز بھی۔ کشمیر کے بارے میں بھارتی حکومت بار بار اعلان کر رہی ہے کہ جلد کشمیر کا حتمی حل ہو

میں بھارت کی مدد سے انتشار اور دہشت گردی پھیلانے والے آئے دن معافی مانگ کر سکیورٹی اداروں کے سامنے ہتھیار ڈال کر معمول کی زندگی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی جارحیت کے پیش نظر فوج کے متبادل کے طور پر ایف سی کو تیار کر کے فانا اور پنجتون خواہ کے مختلف علاقوں میں بھیجا اس لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ان علاقوں میں ایک لاکھ اسی ہزار فوج کے مستقل قیام سے توازن خراب ہو رہا تھا۔ بھارت کی پوری کوشش ہے کہ پاکستان کے اندرونی حصوں میں خطرات پیدا کر کے فوج کو اندرونی علاقوں میں فکس کر دیا جائے۔ دوسری طرف پاکستان کی سرحدوں پر محدود جنگ شروع کر کے پاکستان کو شدید دباؤ میں مبتلا کر کے سی پیک منصوبے کو تباہ کیا جائے۔ اس طرح پاکستان چین اور روس کے اتحاد کو ختم کیا جائے۔

لیکن اب ایف سی نے اندرونی تمام علاقوں میں ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ اور فوج دوبارہ فرنٹ لائن پر منتقل ہونا شروع ہو گئی ہے۔ اس طرح بھارت کے عزائم خاک میں مل گئے ہیں۔ اسی طرح چین کے ساتھ لگنے والی بھارتی سرحد پر چین نے دباؤ بڑھانا شروع کیا ہے۔ اس میں پاکستان کے ساتھ مشاورت شامل ہے۔ کیونکہ سی پیک کے مشترکہ پراجیکٹ کے لئے دونوں ممالک کے مفادات کو ایک کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر اعظم نریندر مودی نے پاکستان کا پانی بند کرنے کی بڑھک ماری تھی۔ تو چین نے جواب میں ارونا چل پردیش میں بھارتی پانی بند کرنے کا سخت اعتباہ کیا۔ جس پر بھارت فوری طور پر سیدھا ہو گیا۔ اور مودی نے اپنے ہی تھوک کو چاٹنے میں عافیت جانی اس کے بعد کبھی بھی دوبارہ اس دھمکی کا ذکر کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

انڈین نیوی موجود ہے۔ نیول ہیڈ نے 09 کور ہیڈ کوارٹر کا دورہ کیا۔ انہوں نے عملی تیاریوں کا جائزہ لیا۔ اس سے قبل 30 مئی کو فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل ہری کمار نے جموں کا دورہ کیا اور عملی تیاریوں کا جائزہ لیا۔ اس طرح بری، بحری اور فضائیہ کے سربراہوں کی عملی تیاریوں کا جائزہ کس جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس صورت حال کے بارے میں اقوام متحدہ کا فکرمند ہونا فطری امر ہے۔

امریکہ کے قومی انٹیلی جنس کے سربراہ ڈیپیل کولس نے پاک بھارت جنگ کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ سی پیک کے حوالے سے اقوام متحدہ کی حالیہ رپورٹ میں بھی صاف طور پر کہا گیا ہے کہ بھارت سی پیک کی شدید پریشانی کے حوالے سے دہشت گردی سے منہ کے نام پر پاکستان کے زیر قبضہ علاقہ آزاد کشمیر پر حملہ کر سکتا ہے۔ اگرچہ بھارت کو چینی رد عمل سے بچنے کی زبردست کوشش کرنی ہو گی۔ چین نے بھارت کو 1962ء کی جنگ کی یاد دلائی ہے۔ اصل میں اس جنگ کے خدخال 2004ء میں ہی ”کولڈ سٹار“ جنگی حکمت عملی سے ترتیب دیئے جا چکے ہیں۔

1998ء میں پہلے ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے جوہری دھماکوں کے بعد روایتی جنگ ناممکن ہو چکی ہے۔ البتہ 1999ء کی کرگل جنگ کے بعد یہ ضرورت بڑھ گئی کہ پاکستان کو جوہری قوت کے سائے میں ہندوستان کے خلاف ”پراکسی وار“ سے کس طرح روکا جائے۔ اور بالآخر ”کولڈ سٹار“ کا فوجی نظریہ بنایا گیا۔ ”کولڈ سٹار“ کے مطابق نہایت ہی محدود پیمانے پر جنگ بندی لائن کے قریب چند علاقوں پر تیزی سے حملے کر کے قبضہ کیا جائے تاکہ جنگ طویل نہ ہو۔ اور جوہری ہتھیاروں کی نوبت نہ آئے۔ یوں لگتا ہے کہ بھارتی حکومت کا مودی نے تجربہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ کشمیر

انہی ہی زبان بھلنے نے یہودیوں کے بارے میں استعمال کی تھی۔ راجناتھ سنگھ اور اردن جیٹلی جب بیان دیتے ہیں تو اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا بیان اپنا بیان نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ حکومت اور ریاست کا پالیسی بیان ہوتا ہے۔ 28 مئی 2017ء کو نئی دہلی میں راجناتھ سنگھ نے کہا کہ ہم نے کشمیر کے بارے میں مستقل حل تیار کر لیا ہے۔ اور اس بارے میں اقدامات شروع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ وضاحت نہیں کی وہ اقدامات کیا ہیں۔ پھر 3 جون 2017ء کو نئی دہلی میں میڈیا کو بتایا کہ ہم کیا کریں گے بس آپ دیکھتے جائے۔ پھر 4 جون 2017ء کو حیدر پور ہماچل میں کہا کہ کشمیر میں آری کو صورت حال سے منہ کے لئے کھلی چھوٹ دے دی ہے۔ اسی طرح کے بیانات وزیر دفاع اردن جیٹلی بھی دیتے رہے ہیں۔ یہ بیانات ایک خوفناک صورت حال کا پیش خیمہ ہے۔ اور کشمیری دوستوں کے خیال میں سرحدوں پر محدود سی جنگ کی تیاری بھی ہے۔ اس جنگ کی آڑ میں اندرون کشمیر انہیں سب کچھ تباہ و برباد کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ جو ان کے خیال میں ان کے لئے رکاوٹ ہے۔

یہ کوئی تعجب یا اتفاق کی بات نہیں ہے بلکہ یکم جون 2017ء کو بھارتی آری چیف رات نے مقبوضہ ریاست کا دورہ کیا اور فوج کی جانب سے جاری کیے بیان میں صرف یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے کشمیر کی صورت حال کا جائزہ لیا بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے حکمت عملی کی تیاری (Operational Preparedness) کا جائزہ بھی لیا۔ 02 جون 2017ء کو بحریہ کے سربراہ ایڈمرل سنبل لامبانے بھی جموں و کشمیر کا دورہ کیا۔ حالانکہ کشمیر میں بحریہ کا زیادہ کردار نہیں ہے لیکن بھیل دور سے لے کر جموں تک

رپورتاژ

جواد حسن جواد

وہ تیری جستجو کا سہانا رپورتاژ
برسوں کرے گا یاد زمانہ رپورتاژ

چہرے سے جان لو میرے دل کے تاثرات
مشکل ہے آرزو کا سنا رپورتاژ

گو اس میں واقعات میری زندگی کے ہیں
لگتا ہے پھر بھی تیرا فسانہ رپورتاژ

کیا کیا عجیب اس میں ہیں رنگین واقعات
اپنا شباب بھی ہے سہانا رپورتاژ

ہر شخص کی زبان پر دونوں کا نام ہے
کیا بن گیا ہمارا فسانہ رپورتاژ

جواد میں نے کہہ دیا شعروں کے روپ میں
منظور تھا غموں کا چھپانا رپورتاژ



حتمی حل نکال سکیں اور 2019ء میں ہندو عوام کو بتائیں
کہ انہوں نے پاکستان کو سبق سکھا دیا ہے۔ اس سلسلے میں
کارروائیاں ممکنہ طور پر در اس سیکٹر نیٹوال کیرن وادی نیلم
میں درہ حاجی پیرا وڑی ضلع باغ آزاد کشمیر میں ہجیرہ مدار
پور ضلع پونچھ میں جہاں بہت مختصر مدت میں بہت ساری
چوکیوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے۔

2004ء کے ”کولڈ سٹار“ ڈاکٹر ائن سے قبل بھی

1965ء اور بالخصوص 1971ء کی جنگ میں سرحدوں

پر یہ تجربات کیے جاسکے ہیں۔ اس دوران جن جگہوں پر

جس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ وہ واپس نہیں ہوا تھا۔ 1984ء

میں سیانچن اور 1998ء میں بٹالک میں بھی یہی حربہ

آزما کر بہت سارے علاقوں پر مستقل قبضہ جمایا گیا۔

ایک بار پھر یہی صورت حال نظر پاتی جوش کے ساتھ

شاید پھر دھرائی جائے اس میں امریکہ اور اسرائیل کی

آشیر باد بھارت کو حاصل ہے۔ اس میں افغانستان بنگلہ

دیش اور ایران کی پالیسی بھی آہستہ آہستہ سامنے آ رہی

ہے۔ البتہ وقت کا تعین ابھی نہیں کیا گیا۔ پاکستانی

حکومت اور اپوزیشن کی محاذ آرائی یا قبل از وقت ایکشن

کے دوران کوئی بھی کارروائی ہو سکتی ہے۔ ایسے میں چین

کا مثبت کردار اور پاکستان کی مخالفت میں اٹھنے والی

آدازوں کا موثر جواب دینے کے لئے تیار ہونے کا

اعلان ہوا کہ ایک خوشگوار جھونکا ہے۔ چین کا یہ اعلان بھی

پاکستان دوستی کا آئینہ دار ہے کہ بھارت کو چین ایسا سبق

سکھائے گا کہ وہ اس کو صدیوں تک یاد رکھے گا۔

پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کا بھارتی دوسرا پلان

بھارت کی طرف سے پاکستان کو عدم استحکام سے
دوچار کرنے کے لئے ایک اور گریٹر پلان سازش کا
انکشاف ہوا ہے۔ انہی جنس اطلاعات کے مطابق اس
سازش کے تحت بھارت، افغانستان اور ایران مل کر ایک

بار پھر پاکستان کے خلاف محدود جنگ کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اس سازش کے تحت بھارت، افغانستان اور ایران پاکستان سے ملحقہ سرحدوں پر خلاف ورزیاں کرتے ہوئے پاکستانی فورسز اور شہریوں کو نشانہ بنائیں گے۔ اس کے نتیجے میں پاکستانی فوج رہبرز اور سیکورٹی ادارے سرحدوں کی طرف توجہ دینے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ افواج پاکستان جوانوں و نوجوانوں کی حفاظت اور دفاع کے ساتھ ساتھ اندرون ملک ردِ فساد اور پریشن میں بھی مصروف ہیں۔ ان پر اضافی اور مؤثر بوجھ اور دباؤ بڑھے گا۔ جس کے بعد مرضی کے نتائج حاصل کرنے میں نہ صرف آسانی ہوگی بلکہ اس خطے میں آئندہ ہونے والی تبدیلیوں کا رخ بدلنے میں مدد ملے گی۔

ذرائع کے مطابق پاک فوج نے اٹلی جنس کی اطلاعات پر ہی ان ممالک کی ”محدود جنگ“ کا منصوبہ جواب دینے کے لئے مؤثر حکمت عملی وضع کر لی ہے۔ ذرائع کے مطابق بھارتی جاسوس کلبوٹن یادو نے گرفتار ہونے کے بعد دورانِ تفتیش اعتراف کیا تھا کہ بھارت پاکستان میں ”محدود جنگ“ کی منصوبہ بندی کر چکا ہے۔ اس سازش میں امریکہ اسرائیل بھارت افغانستان اور ایران کے علاوہ پاکستان کی بعض سیاسی شخصیات بھی شامل ہیں۔ ذرائع کے مطابق بھارت نے اسی پلان پر عمل کرتے ہوئے ستمبر 2016ء سے سرحدی علاقوں پر مسلسل گولہ باری کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ لیکن گریٹر پلان پر تاحال عملدرآمد میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

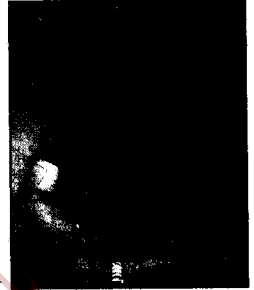
بھارت نے ”را“ کے ذریعے افغانستان سے متعدد حملے کروائے۔ جس پر افغان فورسز نے چمن اور طورخم سرحدی علاقوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے متعدد دہریوں کو شہید اور زخمی کیا ہے۔ پاکستان کی جوابی کارروائی سے افغان فورسز کا بھاری جانی نقصان ہوا

لیکن پاکستان پر ”محدود جنگ“ مسلط کرنے کے بیک وقت تینوں ممالک کی جانب سے ملحقہ پاکستانی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ رہنے کا تو ایسا امکان بہر حال ابھی موجود ہے۔ ایرانی فوج کے سربراہ میجر جنرل باقری کی جانب سے پاکستان کو دی جانے والی دھمکی کہ اگر پاکستان نے اپنی حدود میں دہشتگردوں کے محفوظ ٹھکانے ختم نہیں کیے تو ایرانی فوج پاکستان پر حملہ کر دے گی۔ یہ اسی محدود جنگ پلان کا حصہ ہے۔ ایرانی جنرل نے بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان پر الزام عائد کیا تھا۔ ایران نے پاکستانی بلوچستان کی حدود میں ڈرون طیارے کو بھی بھیجا۔ جس کو ہمارے تھنڈر 7 نے بروقت فوری طور پر گر کر ایرانی حکومت کو واضح پیغام دے کر متنبہ بھی کر دیا کہ آئندہ ایسی کسی بھی حرکت پر سخت جوابی کارروائی ہوگی۔

گزشتہ ماہ بھارتی وزارتِ دفاع اور خفیہ ایجنسی را کا 108 رکنی وفد چمن بارڈر پر مشترکہ فورسز کا جوہلہ ہوا تھا۔ اس کے بعد کابل پہنچا ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر بھارتی اہلکاروں کا یہ دورہ ایک ہفتے کا بتایا گیا ہے۔ بھارتی ہائی کمیشن کابل چمن میں پاکستان اور افغانستان کی فورسز کے درمیان جھڑپ پر مکمل مانیٹرنگ کرتا رہا ہے۔ بھارتی اٹلی جنس ادارہ کی بھرپور کوشش ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان راہداری مکمل طور پر کھل جائے۔ تاکہ ان کے عزائم آسانی سے پورے ہو سکیں۔ نیو اور امریکی حکام بھی چمن کے حوالے سے حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ پڑوسی ہونے کے ناطے روس اور چین نے بھی اس خطے کے امن وامان کے حوالے سے حالات پر مکمل نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ پاکستان کے ساتھ مل کر مشترکہ طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے عملی طور پر سرگرم ہو گئے ہیں۔



ستاوون بھری رات



قسط: 6

waseemrazasyed@live.com

☆ سید وسیم رضا سکر - کینڈا



”ناہید جی! آپ ناراض ہو کر یہاں سے نہ جائیں، اس طرح مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ آپ جانتی ہی ہیں مجھے آرٹس کی کتنی قدر ہے۔ یہ دیکھیں، میں آپ کی سلی کے لئے یہ بندوق اندھے کنویں میں پھینک رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے ملک نے بندوق کنویں میں پھینکی جا ہی لیکن ناہید نے ہاتھ بڑھا کر بندوق پر رکھ دیا اور بولیں۔

”نہیں ملک جی! مجھے آپ کے فیصلے کی سچائی اور الفاظ کے بھرم پر یقین آ گیا ہے۔ بندوق کو کنویں میں ڈبو دینے سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ جب تک یہ احساس زندہ رہے گا، بندوق شعلہ نہیں اگل پائے گی۔ اس کو اسی صندوق، اسی الماری، اسی جگہ پر رکھ دیجئے جہاں سے آپ نے اس کو نکالا ہے۔“

ناہید کے لہجے میں خوشگوار اور تازگی تھی۔
”تو کیا آپ اب ناراض نہیں ہیں؟“ گڈرے نے پوچھا۔
”نہیں اب نہیں۔“ ناہید نے آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

”کیا آپ جشن بہاراں میں اپنے رقص کا فرم پیش کریں گی؟“ میں نے پوچھا۔
ناہید نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور متنبہ لہجے میں کہا۔ ”جی ہاں!“

گڈرے کی آنکھوں کے چراغ روشن ہو گئے ڈانٹا کے چہرے پر بٹاشت دوڑ گئی تھی۔ جہلم مسکرا دی تھی اور ملک نے اطمینان کا مہرا سانس لیا تھا اور بندوق کندھے پر لٹکی لی تھی۔

آج ہی کی رات جشن بہاراں کی رات قرار پائی تھی۔

”زمین یہ رونقیں، یہ زمیں، یہ موسم یہی تو میری جنت ہیں۔ مجھے آج احساس ہوا کہ مجھے تو اسے سینچنا اور سنوارنا چاہئے اور میں کتنا بے حس تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی جنت کے معصوم پنچھیوں پر گولیاں برساتا۔“

ملک کے چہرے پر ندامت اور شرمساری تھی۔ ناہید نے اپنی جھکی ہوئی نگاہیں اٹھائیں اور ملک کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ چھپاتی ہوئی چڑیوں کی ڈار لیلی اڈاریاں مارتی ہوئی سر کے اوپر سے گزر گئی۔ ناہید نے ایک قدم اٹھایا اور کنویں میں جھانکا۔ کھیتوں سے لہراتی ہوئی چڑیاں جھوم کے آئیں اور کیکر کی ٹہنیوں پر اتر گئیں۔ چھپا ہٹوں کی سریلی موسیقی بکھر گئی اور کنویں کے پانی کے ہلکورے لڑنے۔

ٹپ ٹپ ٹپ کچھ بوندوں کے گرنے سے کنویں کے پانی میں دائرے بنتے گئے۔ صبح کا ٹھنڈا میٹھا وقت ہوتا تو شاید یہی لگتا کہ کیکر کی ٹہنیوں سے شبنم نے نیر بہائے ہیں لیکن پہر کی اس دھوپ میں یقیناً ناہید کی آنکھوں سے ہی آنسو ٹپکے تھے۔

”کیا ہوا ناہید جی! یہ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
میری بات سن کے ناہید نے آنسو پونچھے اور مڑ کے ہم سب کو دیکھا اور گلوگیر آواز میں بولیں۔
”کچھ بھی خاص وجہ نہیں بس ویسے ہی دل بھر آیا تھا۔“

”آپ آرٹس ہیں اس لئے آپ کا دل نازک ہے۔“ گڈرے نے کہا۔
”جی ہاں، ایسا ہی ہے۔“ ناہید نے یہ کہتے ہوئے گڈرے کی بات سے اتفاق کیا۔

ملک بندوق کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے ابھی تک خطر تھا، جبران تھا پھر وہ بولا۔

ہاں ستاروں بھری رات میں تو کیا اس کی کہی ہوئی بات سچ ہو رہی تھی۔
کیا اس کی پیشگوئی حقیقت بنے جا رہی تھی؟

☆☆☆

فوجی کدھے پر بندوق لٹکائے اور کارتوس سنبھالے گرتا پڑتا حویلی کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

سب اس کے پیچھے رواں دواں تھے۔ بات بات پہ ہنسی بہہ بہہ جاتی تھی۔ باتوں کی پھلجھڑیوں کے توارے چھوٹ چھوٹ جاتے تھے۔ کچھ دور پتلے پتلے کیکروں کے ذخیرے میں چھوٹے چھوٹے بچے بھیڑ بکریاں اور گائے بھینسیں چرا رہے تھے اور ان کے پس منظر میں بہت دور پیر پتال کے پہاڑوں کا جلوہ تھا۔

حویلی پہنچے تو کھانا تیار تھا۔ بے جی اور پھوپھی نسیم کسی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ وہ آگئیں تو سب نے مل کر کھانا کھایا۔

”بے جی! مجھے لاہور جا کر آپ کی بڑی یاد آیا کرے گی۔ آپ لاہور آئیں گی ناں، میرے پاس تشریف لائیں گی ناں؟“ ناہید نے بے جی کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے پیار سے اصرار کیا۔

”ہاں ہاں، بیٹی! جب کبھی بھی لاہور آئی تو تم سے ملنے ضرور آئیں گے۔ مجھے بھی تمہارا یہاں آنا بڑا اچھا لگا ہے اس حویلی کو اپنا ہی گھر سمجھو، آتی رہنا بیٹی!“ کھانا کھا کر میں، ملک اور گڈر دیا جھپٹ پر آ گئے۔

دن آدھا سے زیادہ ڈھل گیا تھا اور دھوپ کی نرمی گرمی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے چھپتے تھے تازگی تھی۔ سوتری چارپائیوں پہ دھوپ بکھری ہوئی تھی اور کبوتر جھانجریں چمکاتے پھر رہے تھے۔ سر ہانوں اور تکیوں کے غلافوں میں پاکیزگی کی خوشبو تھی۔ ملک کو دیکھ کر کبوتر پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑے آئے اور غمر غوں

”جاؤ فوجو! یہ بندوق، یہ کارتوس انہیں گھر لے جاؤ۔“ ملک فوجو سے کہہ رہا تھا۔ ”بادرچی کو بلا لاؤ اور اسے کہو کہ ایسے پکوان پکائے کہ مہمان واہ واہ کر انھیں۔“

ملک کا حکم نامہ سن کے فوجو کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

”زمینوں کے پیچھے نیوب ویل کے نزدیک پرانی ٹاپلوں کے قریب جو میدان ہے ناں، وہاں قاتلین بچھوانا اور نیکی لکوانا۔“

”جی اچھا“ فوجو نے خوشامدی لہجے میں کہا۔
”اور کچھ ایسا جو آپ چاہتی ہوں کہ ہو؟“ ملک نے ناہید کی رائے لینا چاہی۔

”جی ہاں وہ یہ کہ جیسے انتظام اور جیسے مقام پہ اس جشن بہاراں کے منعقد کرنے کا آپ نے نقشہ کھینچا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ فرمائش چاہوں گی کہ روشنی بس شمعوں کی ہی ہو۔ بلب اور الیکٹرک لیمپ نہ چلیں تو زیادہ خوبانک اور طلسماتی ماحول لگے گا۔ بس شمعیں ہی روشن ہوں۔“ ناہید نے کہا۔

”ویسے بھی رات کو چاند کی دودھیا روشنی میں لطف آ جائے گا۔“ ڈانٹا نے کہا۔

”نہیں، آج چاند کہاں سے نکلے گا؟ آج تو اماؤس کی رات ہے۔ ہاں ستارے بہت ہوں گے تو یہ کہہ لیجئے کہ آج ستاروں بھری رات ہوگی۔“ گڈریے نے ڈانٹا کو بتایا تو میں چونک اٹھا۔

ستاروں بھری رات! وحشی درویش کی آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا جب اس نے ناہید کو دربار میں کہا تھا۔

”تیرا چڑھاوا تو ستاروں بھری رات میں منظور ہو گا۔“

وہی ہوں گے جو میرے اور آپ کے دوست احباب ہیں۔“

ناہید نے مسکرا کے سر ہلایا اور ڈیوڑھی کی جانب بڑھ گئیں۔

شام ڈھلی تو تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، دیگیوں کھگیروں اور برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گجریاں ادھر سے ادھر آ جا رہی تھیں۔ کپڑے استری ہو رہے تھے۔ مغرب کے آسمان پر سب کچھ شعلہ رنگ تھا۔ کوؤں کی ڈاریں ڈھل چکے سورج کی روشنی میں مدغم ہوتی ہوئی اڑی جا رہی تھیں۔ آسمان کے ماتھے پر زہرہ کا ہیرا چم چم دکھ رہا تھا۔

”آؤ جی، آؤ ملک صاحب! تشریف لے چلو،

ذرا چل کے نظارہ تو کرو“ فوجو نے آ کے کہا۔

ملک کی گاڑی، میری جپ اور دو تین تانگے بھر کے مہمان خنص ٹھنڈا کے بیٹھ گئے اور قافلہ چل نکلا۔ فوجو گجریوں کے تانگے پر سوار تھا اور راجا اندر بنا بیٹھا تھا۔ کچی سڑک پر بجکولے کھانا تانگہ لاکھڑا تو گجریوں کے قہقہوں اور چیخ و پکار سے کھیت کھلیاں نیند سے جاگ اٹھتے۔

جب جشن بہاراں کے جلے کے مقام کے نزدیک پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور مغرب کے آسمان کا رنگ دہکتی اور بجھتی ہوئی آگ جیسا ہو رہا تھا۔ گجریوں کے تانگے کے آگے فوجو بندوق تھا سے یوں بیٹھا تھا جیسے راجا اندر حسینوں کی پاکلی کی حفاظت پہ مامور ہو۔ طوطے جیسی تیز ناک اور مکار آنکھوں میں فرافرا کی چمک اور خراٹ چہرے پہ ہیرا پھیری کے تاثرات۔ اس نے نہا کے نیا جوتا پہنا ہوا تھا اور بالوں میں اتنا خوشبودار تیل لگا رکھا تھا کہ میرا سر چکرانے لگا۔ اس کو دیکھ کے وہ کہاوت یاد آ گئی کہ ”چھچھوند

کر ہوئے اس مخصوص جگہ پر جمع ہو گئے جہاں ان کو اس وقت روٹیوں کے ”بھورے“ ڈالے جاتے تھے

مہم نے کبوتروں کے پانی پینے کی مٹی کی ”الٹ“ کو دور کونے میں لگے لٹل کے پانی میں دھویا اور تازہ پانی اس میں بھر کے لا کے فرش پر رکھ دیا۔ اس میں چارپائی پر لیٹ گیا اور دوسری چارپائی پر سناٹا بیٹھ کر ملک سے باتیں کرنے لگا۔

اور اچلے نیلے آسمان پر چیلیں دور بہت دور لہلاہ میں منڈلا رہی تھیں۔ کچھ کبوتر محو پرواز تھے۔ وہ آواز دے رہے تھے کہ مشکل سے دکھائی دیتے تھے۔

”ملک! وہ آسمانوں میں جو کبوتر اڑ رہے ہیں وہ لے لے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے ہی ہوں گے جو میں نے اڑائے تھے ابھی ابھی تک بیٹھے نہیں ہیں۔“ ملک ہاتھ میں تھامی روٹی کے ننھے ننھے بھورے کر کر کے کبوتروں کو اڑاتے ہوئے بولا۔

کبوتر روٹی کے بھوروں پہ جھپٹ رہے تھے، پر ہزار رہے تھے، جہاں جہاں چھٹکا رہے تھے، کبوتریاں ہاتھ میں تھیں، کچھ کبوتروں نے ناز سے گردنیں اکڑائی ہاتھ میں۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کس وقت آواز آ نکھ لگ گئی اور میں بے خبر ہو کے سو گیا۔

☆☆☆

جشن بہاراں کے سب کو پیغام پہنچ گئے تھے، اہم کی خواہش تھی کہ بس وہی لوگ موجود ہوں جو پہلی رقص کے آرٹ کے قدردان ہوں یا پھر دوست احباب، تماشا بین اور ہل باز لوگوں کی موجودگی وہ قطعاً اہمیت نہیں کریں گے۔

ملک نے یہ بات سنی تو ہنس دیا اور بولا۔
”ناہید جی! میرے جشن بہاراں کے حاضرین

قالین بچے ہوئے تھے، گاؤں تکیے لگے ہوئے تھے۔ دور بیٹھے سازندے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ آسمان پر ستاروں کے چراغ روشن ہو رہے تھے اور اندھیرے میں ڈوبتے ٹیکروں سے کال کچ کے گیت گانے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ فضاؤں میں ٹھنڈک تھی اور اینٹوں کے بھٹے سے نکلنے والا دھواں اوپر فضاؤں میں جیسے جم سا گیا تھا۔

کھانا پک گیا تھا۔ سیخ کباب، بکرے کی نہیں چاچیں، پلاؤ، گاجر کا حلوہ، دودھ، آلو بخارے کی چٹنی، گلاب جامن اور کشمیری گلابی چائے۔

کھانا کھانے کے بعد آدھا گھنٹہ تک ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ ہیرے اور برتن وغیرہ رخصت ہوئے۔ روشنیاں گل ہوئیں اور شمعدان روشن ہوئے جن پہ شیشے کی چمنیاں تھیں تاکہ ہواؤں سے شمعیں بجھنے نہ پائیں۔ شمعوں کی لرزتی ہوئی خوابناک روشنی میں باغ کا منظر سحر انگیز اور افسانوی ہو چکا تھا۔

گھڑی پہ جونگاہ ڈالی تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

سب گاؤں تکیوں سے لگ کے بیٹھ گئے اور کشمیری چائے پینے لگے تو سازندوں نے ستار، طبلے اور ہارمونیم کے سر چھینڑ دیئے۔

آسمان پہ ستارے یوں آدیزاں تھے جیسے کسی نے مٹھیاں بھر بھر کے ہیرے آسمان پہ ڈال دیئے ہوں۔ لائٹ پولوشن سے دور اس جگہ پہ ستاروں اور کہکشاں کی آب و تاب پہ نظر نہیں ٹک رہی تھی۔

”ابھی تو جوں جوں رات بھیکے گی تو ستاروں کی چمک دمک اور سحر انگیز ہو جائے گی۔“ ملک نے مجھے تاروں میں گم دیکھ کے کہا۔

سازندوں کے ساز کی لے تیز ہوئی تو بلبلوں کی طرح چھبھاتی اور کبوتریوں کی طرح گنگنتی ہوئی گجریوں

کے سر میں چینی کی کاتیل۔ گجریوں کا دوسرا تانگہ فوج والے تانگے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس تانگے میں جہلم، منظوری اور ماسی بھی سوار تھی۔ فوج پہ جو نظر پڑی تو جہلم نے فقرہ کسا۔ ”آئے ہائے خمرہ تو دیکھو، مر جانے کا۔ بندوق تو یوں پکڑی ہوئی ہے جیسے انڈیا سے جنگ کرنے جا رہا ہو۔“

زوردار قہقہوں سے ماحول گونج اٹھا۔ فوج کسمسا کے رہ گیا۔

اب منظوری نے چلا کے پوچھا۔ ”اوئے یہ ٹو نے بندوق پکڑی تو ہے، یہ بتا چلائی بھی آتی ہے کہ نہیں؟“

ہاہاہاہ اور قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔

فوج نے منظوری کی بات سن کے تھلا کے کہا۔ ”آنا سامنے کھڑی ہو ابھی چلا کے دکھاتا ہوں۔“

”اوئے جا اوئے برساتی چو ہے۔“ منظوری نے ترکی پہ ترکی جواب دیا۔

”وے مر جانیاں کیساری چوبیا، مجھے تو یہ لگتا ہے کہ تجھے بندوق پکڑانا ہی غلطی ہے، کوئی چور ڈاکو دیکھ لے تو تجھ سے ہی بندوق چھین کے تجھے ہی لوٹ لے۔“

ماسی کی بات پہ قہقہوں کا طوفان بلند ہوا۔ ”اوئے آرام سے بیٹھ ماسی!“ فوج چلایا۔

ناہید، ڈانٹا اور سب کا ہنس ہنس کے برا حال ہو چکا تھا۔ جب ملک کے باغ کے نزدیک پہنچے تو کھانوں کی خوشبوؤں نے ہوا کے دوش پہ استقبال کیا۔

باغ کے نزدیک جا کے گاڑیاں اور تانگے رکے اور سب نیچے اترے۔ باغ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

نزدیک ہی آگئے تھے۔

اور عورتوں کا شور دھیمہ ہوا۔

میں نے اس شک کا اظہار کیا تو ملک ہنس کے بولا۔

”ارے بھائی! گیدڑ یہاں عام ہیں، تم اس وقت گاؤں میں نہیں بلکہ گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں کے پار میرے اس باغ میں ہو جو کہ دیرانے میں ہے۔“

شمعوں کی روشنی ہلکورے لے رہی تھی اور باد شب کے جھونکوں میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔

”لگتا ہے کہ جیسے وقت تھم گیا ہو۔“ میں نے کہا۔

”سرحدوں کے نزدیک وقت تھا ہی رہتا ہے۔“ ملک نے کہا۔

”سرحد..... کون سی سرحد؟“ میں نے پوچھا۔

”کہاں ہے سرحد؟“

”بھائی پاک و ہند کی سرحد کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“ ملک نے کہا۔

آسمان پر ایک ٹوٹا ہوا تارہ پھلچھڑیاں بکھیرتا ہوا دور نکل گیا تو اس کے شراروں کا عکس نزدیک سے گزرتی ہوئی نہر کے پانی میں دکھائی دیتا گیا۔

گھڑی پہ نگاہ ڈالی تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔

ڈانکا کی آمد ہوئی تو لگا جیسے آسمان سے کوئی پری اتر آئی ہو۔ اس کی جج دھج اور رقص کرنے کا لباس ایسے تھے کہ عورتوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور سماں بندھ گیا۔ ڈانکا نے طلبہ کی تھاپ اور ستار کے میٹھے سروں ایک ایسا دلکش رقص پیش کیا کہ تعریفوں کے پل بندھ گئے۔

اس کی خوبصورتی اور دلربائی نے ایسا ماحول طاری کیا کہ دم سادھ لئے گئے۔ گذر کیاں کھو گیا تھا۔ مجھے احساس تھا اس کے دل اور دماغ میں کیا تھا۔

ساز پر رقص کے بعد ایک ایسی کیسٹ چلائی گئی جس میں میٹھے سریلے راگ تھے۔ وہ راگ مشہور کلاسیکل استاد گلوکاران فتح علی خان اور برکت علی خان وغیرہ کی آوازوں میں تھے۔ ان راگوں نے، سازندوں کے سازوں نے اور ڈانکا کے خوبصورت رقص نے سب کو عیش عش کرنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ ڈانکا نے رقص کا اختتام کیا تو مجھے دور شمال کی جانب سے گزر گڑا ہٹ سی سنائی دی، ہلکی سی گزر گڑا ہٹ، گرج جیسی، جیسے بادل اُتر رہے ہوں۔

آسمان پر نگاہ ڈالی تو ستارے آب و تاب سے روشن تھے۔

”بادل کا تو نام و نشان نہیں لیکن گزر گڑا ہٹ سی سنائی دی ہے۔“ میں نے ملک سے کہا تو وہ بولا۔

”ہاں مجھے بھی سنائی دی تھی، میں سمجھا شاید میرا وہم ہے۔“

ساز کچھ دیر خاموش ہو گئے تھے اور نزدیک ہی کسی کھیت سے گیدڑوں کے چیخنے اور پکارنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ شاید بیروں نے ہڈیاں وغیرہ کہیں پھینک دی تھیں اور ان کے لئے گیدڑ وہاں

لئے بے قرار تھیں۔ رقص کے سفید لباس میں ناہید پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔

ان کا باریک آپٹیل زمین کو چھو رہا تھا۔

ہاتھ اور پاؤں لال رنگ سے رنگے تھے۔

پنڈلیوں پر گھنگھر لپٹے ہوئے تھے۔

آنکھوں میں کبرے کی دھاریں تھیں۔

بال سیاہ اور چمکیلے تھے جن میں سسویوں کے

گجرے بندھے ہوئے تھے اور چال میں رقص کی

نزاکت اور متوالا اپن تھا۔

شاید ناہید آج صرف اپنے فن کی گرفت میں

تھیں۔

ہر قدم کے ساتھ گھنگھر وؤں کی چھکار سنائی دی

چھم چھم چھن چھن.....

شمعدان کی بلوریں چمنیوں میں مقید شمعیں

آدھی سے زیادہ جل چکی تھیں اور ان کے لمبے شعلے

تھر تھرا رہے تھے۔

راگ میگلہ مہار میں استاد فتح علی خان کی گرجتی

ہوئی آواز سنائی دی۔

گھن گرجت بادل آئے

اٹھ گمڈ کر بادل چھائے

طلیے پر تھاپ پڑی۔

ستار کی تار تھنچتی گئی۔

اور ناہید نے جھوم کے رقص کے لئے قدم اٹھا

لیا۔

ہم جو ڈانٹا کے رقص کے سحر میں گم تھے، اس کے

رقص کی جادوگری سے ہی اتنے متاثر تھے کہ اسے ہی

سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر ناہید رقصاں ہوئیں تو معلوم

ہوا کہ استاد اور شاگرد کے درجہ اور مہارت میں کیا فرق

ہوتا ہے۔

بس یوں لگا گویا ساز، الفاظ اور شاعری سب

ISO 9001:2008

النورین رجسٹرڈ

النور لیکچرک انڈسٹریز B-75، شمال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات

053-3530447, 0300-9702203, 0345-6333393

<http://www.alnoorfans.com>

ماں جی اور ان خواتین کو جورات جلد سو جانے کی عادی ہیں، جگائے رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ بہتر ہو گا کہ ان کو شب بخیر کہہ کے آرام کرنے کے لئے بھیج دیا جائے۔

سب نے ناہید کی بات سے اتفاق کیا۔ ملک اور شچوان خواتین کو گھر چھوڑنے گئے جو نیند سے مدہوش ہو رہی تھیں۔

میرے، ناہید، ڈانٹا، گذریا، جلم اور سازندوں کے سوا سب چلے گئے۔ تانگے رخصت ہو گئے۔ گاڑی اور جیب بھی چلے گئے۔ بس کچھ دور ملک کے گھوڑے بلیک بیوٹی اور وائٹ بیوٹی استھان پہ بندھے تھے۔

رقص کرنے سے ناہید کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ناہید قایلین پر لیٹ گئیں اور سر گاؤں تکیے پہ رکھتے ہوئے ایک سانس بھر کے بولیں۔

”اف، یہ شبنم گرنے سے تکیہ اور قایلین کتنے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ ٹھنڈک میرے ہاتھوں اور پیروں سے جسم میں سرایت کر رہی ہے اور یہ بہت خوبصورت احساس ہے اُف.....“

ایک جلتا ہوا شہاب ثاقب پھلھڑیاں چھوڑتا ہوا شہل کی جانب نکل گیا اور ہم سب کی آنکھوں نے اس کا تعاقب کیا۔ شہاب ثاقب جل کر خاکستر ہو گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

دور کی کھیت میں ٹیری چلا اٹھی ٹی ٹی ٹی..... ڈانٹا بھی قایلین پر نیم دراز تھی اور شمعداؤں کی شمعیں آدھی آدھی سے بھی زیادہ جل چکی تھیں۔

”میں نے آج سے پہلے ایسی رات نہیں

دیکھی۔“ یہ کہتے ہوئے ڈانٹا نے ستاروں پر نگاہیں ڈالیں اور پھر بولی۔ ”اتنے سارے ستارے اور ان کی ایسی جگمگاہٹ، ایسی دودھیا ٹھنڈی روشنی پہلے کبھی نہیں دیکھی، اس پہ یہ گرتی ہوئی شبنم، یہ ٹھنڈی پروانی، یہ رقص، یہ محفل، یہ قدردانیوں کی انتہا، یہ فن کا عروج،

ایک طرف ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ سیاہ رات، وہ آسمانوں پہ جگمگاتے ہوئے ستاروں کی جھلجھلاہٹ، وہ پروانی کی ٹھنڈک، وہ شبنم کا برسا اور دھیمے دھیمے ہر شے کو نم کرتے جانا۔ وہ نہر کے پانی کی گنگناہٹ اور اس سے دل میں اترتی ٹھنڈک، وہ شمعوں کی بجھتی ہوئی، مدہم ہوتی ہوئی روشنی۔

وہ کیکروں اور شیشموں کا سرسراہٹ، وہ آسمانوں پہ ٹوٹتے ہوئے تاروں کا چلتے ہوئے دور نکل جانا، وہ کال کلچ اور ٹیری کی سُریلی اور مدھر صدائیں اور گیت۔

اور ان سب پہ ناہید کے کھٹک رقص کے فن کی انتہا..... انداز و ادا کا عروج، بس ایک ایسا طلسم سا طاری ہوا کہ زمان و مکان کی بے خبری ہو گئی۔ دل دھڑک اٹھے اور دنیا کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ناہید کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھر وں کی چھنکار میں میں نے دیکھا کہ گذریے کی بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

سب ناہید کے فن میں کھو گئے تھے، اس کی خوبصورتی میں گم ہو گئے تھے۔

راگ میگہ لمہار کے آخری بول گونجے اور طبلے پہ زوردار تھاپ پڑی تو ناہید نے اس انداز سے اس راگ پہ رقص کا اختتام کیا کہ ایک ہاتھ ماتھے پہ سلام کے انداز میں تھا تو دوسرے سے آجکل کو ایک ادا سے سہارا دیئے ہوئے تھیں۔

واہ واہ کے شور میں ہر طرف سے ستائش کی گویا بوجھاڑ ہو گئی۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ ماں جی، پھوپھی نسیم اور کئی گجریوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ناہید نے دیکھا تو بولیں۔

”ابھی تو محفل جو بن پہ آنا شروع ہوئی ہے مگر

”ہاں تو ہو جائے ذرا درباری راگ اور اس کے بعد گوند ملہار۔“

سازندوں میں ایک بہت بزرگ بھی تھے جو ہارمونیم سنبھالے بیٹھے تھے۔ ناہید ان کے پاس گئیں اور بڑے فخر سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

”یہ بخشی صاحب ہیں۔ یہ مہاراج کے زمانے سے ہی میرے ساتھ ہیں۔“

بخشی صاحب نے ہارمونیم کے سر چھیرے، ٹیپ ریکارڈر کا بن دبا دیا گیا اور استاد فتح علی خان کی گونج دار آواز میں راگ درباری کے بول بلند ہوئے طلبے پہ تھاپ پڑی اور ناہید نے دونوں ہاتھوں سے آنگلی کو پوں سمجھیرا جیسے کوئی بالوں کو کھیرے۔ چوڑیاں کھٹک انھیں۔ ستار کے میٹھے سر کھیرے اور ناہید نے رقص کے لئے قدم اٹھائے اور گھٹکھرو چھن چھن چھنک اٹھے۔ کچھ ایسا ماحول تھا کہ ہم ہر چیز سے بے خبر ہو گئے۔

ناہید نے فن کی جادوگری سے کچھ ایسا افسوس پھونک دیا تھا کہ نگاہیں اسی سے بندھ کر رہ گئی تھیں۔ پردائی کے ہلکے ہلکے جھونکے اک دم سے تیز ہو گئے اور ایک جھونکا تو اتنا تیز آیا کہ شمعداؤں کی شمعیں بجھ گئیں۔ زمین پہ رکھا ہوا نازک شمعداں اوندھا ہو گیا اور بلور کی چمنیاں ٹوٹ گئیں۔ چھنکے کی آوازیں گونج اٹھیں تو سازندوں نے گھبرا کر ہاتھ روک لئے اور صرف گھٹکھروؤں کی چھکار کی صدا پانی رہ گئی۔

یہ سب دیکھ کر ناہید نے بھی رقص کا اختتام کر دینا مناسب سمجھا مگر اس وقت بھی اس انداز سے اختتام کیا کہ ہاتھ ایک خاص انداز سے آسمانوں کی طرف بلند ہیں اور نرت کو دھیرے دھیرے یوں روکا کہ گھٹکھروؤں کی چھکار آہستہ آہستہ مدہم پڑ گئی۔

مجھے تو لگ رہا ہے جیسے آج رات خود رقصاں ہو۔
ڈانکا کے لہجے میں سرشاری ہی سرشاری تھی۔

گڈریے نے یہ بات سنی تو بولا۔ ”اسی کو تو میڈیٹیشن کہتے ہیں۔“
ناہید نے گڈریے کی بات سے اتفاق کیا اور بولیں۔

”بے شک گڈریا نے سچ کہا ہے، یہ موسم یہ قدرت کا حسن اور یہ فن کی مدد ہر یقیناً فن کے دلدادہ اور آرٹسٹ لوگوں کے لئے میڈیٹیشن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ یہ رات نہ تھمے، میں کس کس چیز کی تعریف کروں؟ ٹھنڈی ہوا اور شبنم کی؟ یا کہ کوٹے ہوئے ہیروں جیسے ستاروں کی، یا اس بے قرار چپھی کی جس کے گیت کی صدا ابھی سنائی دی تھی؟ یا ان بجلیوں کی جو میرے رگ و پے میں کوند رہی ہیں اور مجھے رقص کرنے پر مجبور کر چکی ہیں؟ میں کہانی کدھر سے شروع کروں؟“

قائیں پر دراز ناہید یہ سب کہتے ہوئے نگاہیں آسمانوں پہ جمائے ہوئے تھیں۔

دور کہیں سے گرج اور کڑک کی آواز سنائی دی تھی۔ ناہید چونک کے بیٹھ گئیں۔ آسمان پہ نگاہ ڈالی اور پھر لیٹ گئیں اور ستاروں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”اللہ تیری شان، آسمان پہ تو بادل کا نام و نشان نہیں ہے مگر کہیں سے بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سنائی دی ہے۔ خیر میں اب دوبارہ سے اپنے رقص کا فن پیش کرنا چاہوں گی۔ ملک جی تو شاید کچھ دیر میں لوٹیں گے لیکن نہ تو آپ انتظار کی سولی پہ لٹنا پسند کریں گے اور نہ ہی اس وقت میرے ہاتھ پیروں کا ردھم وقفہ پر آمادہ ہے۔“

یہ کہتی ہوئی ناہید مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں، اک نگاہ سازندوں پہ ڈالی اور بولیں۔

”مگر میں نے تو کوئی ندی نہیں دیکھی۔“ ڈانا نے کہا۔

”جی، وہ اس موسم میں سوکھی ہوتی ہے۔ اسی لئے آپ کو پتہ نہیں لگا، اس میں سے گزر کے ہی آئے ہیں یہاں۔“ جہلم تیز ہوتی ہوئی ہوا میں اپنا آچل گرفت میں کرتے ہوئے بولی۔

ناہید کے چہرے پر تشویش دوڑ گئی تھی۔

دور سے بجلی کی خوفناک کڑک سنائی دی۔

”ہائے ہائے۔“ جہلم گھبرا کے بولی۔ ”ملک جی کا تو اتنا پتہ نہیں، آندھی سر پر پہنچ گئی تو پھنس جائیں گے۔ سڑک پر چلتے ہیں حویلی جانے کے لئے، راستے میں ملک جی مل گئے تو مل گئے، نہ ملے تو بھی بھمبر پار کے دوسری طرف چلے گئے تو سمجھو پھر سب خیر ہے۔ لگتا ہے کہ طوفان کے ساتھ طوفانی بارش آئے گی۔“

جہلم کی پیش گوئی سن کے سب سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اس کی بات ٹھیک تھی۔ اس دیرانے میں کھڑے رہنا غلط تھا۔ نظریں اس طرف تھیں جہاں سے کچی سڑک حویلی اور گاؤں سے ہو کے سوکھی ہوئی بھمبر ندی میں سے گزرتی ہوئی، سرکنڈوں سے گزرتی ہوئی یہاں ان زمینوں اور باغ تک آ جاتی تھی۔

دور بجلی کڑکی تو گھوڑوں کے نہہنانے کی آواز آئی۔

گڈرے نے چونک کے گھوڑوں کو دیکھا۔ پھر بھاگا بھاگا گیا اور گھوڑوں کی رسیاں کھول کے ان کو لگاموں سے تھامے ہوئے لے آیا اور بولا۔

”آئیے، ناہید جی! آپ لوگ گھوڑوں پر بیٹھیں، ہم آپ کو لئے چلیں گے، فکر نہ کریں، طوفان آ بھی گیا تو ہم لوگ ساتھ ہیں، حویلی تک پہنچ ہی جائیں گے۔ آئیے بیٹھیں۔“

ناہید نے ایک نظر گھپ اندھیرے میں ڈوب

دور شمال کی جانب آسمانوں پہ بجلی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ جہلم گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

”ہائے رہا یہ تو آندھی اور طوفان آ رہا ہے۔“ ملک جی کہاں رہ گئے ہیں؟ ہمیں فوراً حویلی چلے جانا چاہئے، اس موسم کی آندھیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔“

”آندھی اور طوفان؟“ حیرت زدہ ناہید نے حیران پریشان ہو کے دور کی سمت دیکھا۔

دور بجلی چمک رہی تھی اور ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔

”کڈا سوہنا (کتنا خوبصورت) ماحول تھا، یہ آندھی مصیبت پتہ نہیں ایک دم سے کتھوں آ مر گئی ہے۔“ طبلہ نواز نے دور طوفان کی سمت نگاہیں جمائے ہوئے افسوس سے کہا۔ اس کے کھر دے بال ہوا سے بکھر رہے تھے، پان سے رنگے ہوئے ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سرخ دلدل جیسی آنکھیں طوفان کی سمت دیکھتے ہوئے جیسے پتھر اچکی تھیں۔

جہلم نے تشویش ناک آواز میں پھر کہا۔

”بی بی! ہمیں یہاں سے ابھی کے ابھی چلے جانا چاہئے۔ آپ کو نہیں پتہ یہاں اس موسم کی آندھیاں بڑی دہشتناک ہوتی ہیں۔ درخت جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ ہر چیز الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔“

”لیکن ملک جی آتے ہی ہوں گے، ان کو معلوم تو ہے کہ ہم یہاں ہی ہیں۔“ ناہید نے کہا۔ ناہید کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”اوہو، یہاں اور حویلی کے درمیان بھمبر ندی گزرتی ہے ناں جس میں سے گزر کے ہم یہاں آئے ہیں۔ پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو اس میں سیلاب آ جاتا ہے۔ ندی میں پانی آ گیا تو یہیں پھنس کے رہ جائیں گے۔ نہ آگے نہ پیچھے۔“ جہلم نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

دوسرے گھوڑے پر ڈانٹا سوار ہوئی تو گڈ ریا جہلم سے بولا۔

”جہلم! تم بھی ڈانٹا کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔“
 ”نہ بابا، مجھے تو ڈر لگتا ہے، آپ کو پتہ ہی ہے۔“
 جہلم نے انکار کیا تو گڈ ریا بولا۔
 ”ضد مت کرو، بیٹھ جاؤ۔“

ناہید نے دیکھا تو بولیں۔ ”آؤ جہلم میرے ساتھ آ جاؤ۔ وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہیں گرنے نہیں دوں گی۔“

چار و ناچار جہلم کو مجبوراً ناہید کے پیچھے بیٹھنا پڑا اور ہم سب تیزی سے حویلی کی سمت روانہ ہو گئے۔ ہمیں راستہ ڈھونڈنے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑی کیونکہ گھوڑے جیسے حویلی کی سمت بھاگتے جا رہے تھے۔ ناہید کے گھوڑے کی لگام میرے ہاتھوں میں تھی جبکہ ڈانٹا کے گھوڑے کی لگام گڈ ریے نے تھامی ہوئی تھی۔

ہوا تیز ہو رہی تھی مگر ابھی تک طوفان اور شدید آندھی یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ سرخروں کے لمبے پتے شاں شاہ کی آواز کے ساتھ سرسرا رہے تھے۔

سازندے اور بخشی صاحب بھی گرتے پڑتے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ حویلی کا راستہ پیدل کوئی ایک گھنٹے سے بھی زیادہ کا تھا۔

لمحہ بہ لمحہ ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہرجھونکے کے ساتھ پتوں کی سرسراہٹ شدید ہو رہی تھی۔ ملک کی گاڑی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔
 ”یا اللہ! تو کبھی ہے، یا اللہ! اس آندھی کو ٹوٹاں۔“ گرتے پڑتے طلبہ نواز نے ایک ادا کے ساتھ دعا کی۔

ہوئی اس سمت کو ڈالی جس طرف سے ملک نے آنا تھا اور اس کی گاڑی کی روشنیاں دکھائی دینی تھیں۔ مگر وہاں اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔

”اللہ خیر کرے! ملک جی ایسے غیر ذمہ دار انسان تو ہرگز نہیں، نہ ہی حویلی سے یہاں کا فاصلہ لاہور جتنا ہے مگر گھنٹہ کے قریب تو ہونے کو ہے اور کسی گاڑی کی کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی۔“ ناہید نے تشویش سے کہا اور پھر اپنے بزرگ ہارمونیم نواز بخشی صاحب سے مخاطب ہو کے بولیں۔

”آئیے، بخشی صاحب! آپ بزرگ ترین فرد ہیں، گھوڑے پر سوار ہو جائیے، میرے لئے پیدل چلنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔“

بخشی صاحب کے سفید بال ہوا سے بکھر رہے تھے، ناہید کی بات سن کے وہ بولے۔

”نہیں بیٹا! پیدل تو میں جیسے تیسے چل ہی لوں گا۔ کچھ مضائقہ نہیں ہے مگر گھوڑے پر سوار ہوا تو کسی جگہ گھوڑا بدک گیا یا میرا توازن بگڑ گیا تو ضرور گر پڑوں گا اور میرا اس عمر میں گھوڑے سے گرنے کا مطلب ہے ہڈی پھلی تڑوا لینا۔ نہ بیٹا نہ مجھے تو معاف ہی رکھو۔“

بخشی صاحب نے صاف انکار کر دیا تو ناہید نے ایک آہ بھر کے سر جھکا لیا۔

”بیٹھے، ناہید جی! وقت باتوں کا نہیں۔“
 گڈ ریے نے زور دیا۔

چار و ناچار ناہید گھوڑے پر سوار ہوئیں۔ گھوڑے بدک بدک جا رہے تھے۔ ان کے بال اُڑ رہے تھے اور نگاہیں دانتوں میں کھٹکتا رہی تھیں۔ آسمانی بجلی چیز ہی ایسی ہے کہ ہر جاندار کو دہشت زدہ کر دیتی ہے اور اس معاملے میں جانور کی حس بڑی خاص ہوتی ہے۔ وہ طوفانوں کے آنے کا اور شدت کا اندازہ لیتے ہیں۔

بجلیوں کی چمک اب واضح ہو رہی تھی۔ بجلی چمکنے کے ساتھ ہی ماحول پہ جھماکے سے ہو رہے تھے۔ کھیت کھلیان اور دیرانے پار کر کے ہم ایک دم ڈھلان سی سے نیچے پہنچے۔
”یہ ہم بھمبر ندی میں پہنچ گئے ہیں۔“ جہلم نے بتایا تو سب چونک پڑے۔

”بس دوسری طرف پہنچ جائیں تو پھر آگے حویلی تک ہی جانا ہے۔“ جہلم نے کہا۔

”بڑی چوڑی ندی تھی، اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے جاتے پندرہ منٹ سے بھی زیادہ چلنا پڑتا تھا۔ ابھی پانچ منٹ ہی طے کئے تھے کہ تیز ہوئی ہوئی ہوا نے شدید آندھی کا روپ دھارنا شروع کر دیا۔ سوکھی ہوئی بھمبر ندی کی مٹی بگولوں کی طرح اڑ رہی تھی۔ اتنی مٹی اڑنا شروع ہو گئی کہ مٹی کے سوا کچھ محسوس نہ ہو رہا تھا۔

”ہودو..... ہودو..... ہودو۔“ آندھی کی شکاٹ سنائی دی۔

گھوڑے بڑی طرح گھبرا رہے تھے۔

جس گھوڑے کو میں نے پکڑ رکھا اس نے بدک کے اچھلنا شروع کر دیا اور اگلی ٹانگیں ہوا میں اٹھا اٹھا کے نہنہنا شروع کر دیا۔ جہلم اسی گھوڑے پر تھی، خوف کے مارے وہ چیخنے لگ گئی۔ یہ صورت حال ہو گئی کہ گھوڑا کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔
ناہید الگ جہلم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ساتھ میں خود کو بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ گھوڑا ان کو نیچے گرا دیتا، گذر یا ڈانٹا کے گھوڑے کی لگام طبلہ نواز کے ہاتھ میں پکڑا کے میری مدد کو دوڑا آیا اور گھوڑے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

شدید آندھی آچکی تھی۔

خوفناک گرج کے بعد شدید کڑک کے ساتھ بجلی پمکی کہ زمین لرز اٹھی۔ ناہید والا گھوڑا تو ایک طرف، اب ڈانٹا جس گھوڑے پر سوار تھی، اس گھوڑے نے بڑی طرح نہنہنا کے اپنی لگام چھڑانے کی کوشش کی اور پھر اچھل کے ایک دلتی ایسی ماری کہ طبلہ نواز کا گویا منہ دوسری طرف لگ گیا۔ وہ تو اپنا پیٹ پکڑ کے چیختا چلاتا زمین پہ لوٹ پوٹ ہو گیا مگر گھوڑا یوں بدک کے سر پیٹ بھاگا کہ لگام زمین پہ گھسکتی ہوئی چلی گئی، وہ نہنہنا ہوا سر پیٹ بائیں سمت کو بھاگا جا رہا تھا۔

گھوڑے پر سوار ڈانٹا کی چیخ نے دہشت ناک آندھی کے باوجود ہمارا تعاقب کیا، کڑکتی ہوئی بجلی کی چمک میں ہم نے دیکھا کہ وہ بمشکل اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھی اور گھوڑا سر پیٹ بھاگا جا رہا تھا۔
”نہیں نہیں، میرے خدا نہیں۔“ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے یہ منظر دیکھتے ہوئے ناہید کے لبوں سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلنے چلے گئے۔

”ادہ، میرے خدا! یہ گھوڑا تو وہیں بھاگا جا رہا ہے جس طرف ہے ہم آئے ہیں۔ ادہ، میرے خدا نہیں! ڈانٹا ڈانٹا.....“ ناہید نے چلا چلا کے ڈانٹا کو آوازیں دیں۔

”نہیں جی نہیں۔“ جہلم گھبرائی ہوئی دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ”گھوڑا اس طرف نہیں بھاگا جا رہا جدھر سے ہم آئے ہیں۔ یہ تو نوگز بیر صاحب کا دربار جس طرف ہے، اس طرف کو بھاگا جا رہا ہے۔“

یہ سن کے ناہید کی آنکھوں میں خوف سالہرا گیا۔ بجلی خوفناک کڑک کے ساتھ گرجی کہ سب نے انگلیاں کانوں میں دے ڈالیں۔

(یہ سحر انگیز داستان جاری ہے)

سوفیصد درست تجزیے لکھنے والے رائٹر کا لمسٹ تجزیہ نگار

افعال مظہر انجم کے تہلکہ خیز قلم سے

پھٹا پائیکسی

نئی 500 روپے

☆ نواز شریف کا سیاست سے آؤٹ ہونا سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا آپ سیٹ ہوگا۔

☆ مسلم لیگ نواز ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی؟

☆ الطاف حسین کا انجام کب اور کیسے ہوگا؟

☆ نواز شریف کے بعد بھی عمران خان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا؟

☆ آصف زرداری، شجاعت حسین، چوہدری ثار، فاروق ستار، لیاقت بلوچ، الطاف

حسین، جنرل مشرف، اسحاق ڈار، مولانا فضل الرحمن، جہانگیر ترین، آفتاب شیر پاء

سمیت 7000 افراد سیاست سے آؤٹ۔

☆ عدلیہ، جرنیلوں، حکمرانوں، صنعت کاروں اور صحافیوں پر بے لاگ تبصرہ

☆ سیاسی، مذہبی اور قوم پرست جماعتوں کا حقیقی روپ بے نقاب

مکتبہ داستان ”حکایت“ لاہور

روبی پبلی کیشنز - اردو بازار، لاہور

”حکایت“ کے ہر عزیز قلم کار محمد افضل رحمانی کے بے باک قلم سے لکھی تحریر

داستان ایک عامل کی

چھپ کر تیار ہے، اپنے آرڈر سے مطلع کریں۔

میں عامل کیسے بناؤں؟



- ◎ ایک عامل کا اعتراف جرم
- ◎ عاملوں کی زندگی کے شرمناک گوشے
- ◎ کالا علم اور کالے کرٹوٹ
- ◎ جعلی آستانے جہاں عورتیں آبرو کھو بیٹھتی ہیں
- ◎ جعلی پیروں، عاملوں اور شاہ صاحبوں کی بدمعاشیاں
- ◎ معصوم بچوں کے خون سے غسل کرنے والے

قیمت: 300

صفحات: 256

مکتبہ داستان ”حکایت“ - لاہور

کیا یہ قرآن کا پاکستان ہے؟

”پاکستان کے جھنڈے میں ہزاروں لڑکیوں کی عصمت کا خون شامل ہے اور اس جھنڈے سے کھینے والوں سے کہو کہ بے غیر تو! تم اپنی ہزاروں بیٹیوں کی عصمتوں سے کھیل رہے ہو اور یہ نہ بھولو کہ عصمت کا خون شہید کے خون جتنا پاک ہوتا ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب یہ خون سر چڑھ کر بولے گا۔“

☆ محمد طاہر بٹ



14 اگست

کس دن کی یاد دلاتا ہے؟
پاکستان کسے کہتے ہیں؟

لاہور بادشاہی مسجد کے قریب ایک
خانہ صورت اور بلند مینار ہے اس کا کیا نام ہے؟
پاکستان کی آزادی سے کیا مراد ہے؟
آزادی حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں
کے کیا جذبات تھے؟

کیا مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرنے
کے لئے قربانیاں دیں؟
پاکستان کا تصور کس نے پیش کیا؟
علامہ اقبال کون تھے؟
قائد اعظم کون تھے؟
ہم سب کون ہیں؟

پرائمری سطح کے سوالات بچے یاد کرتے ہیں
تاکہ امتحانات میں انہیں نمبر مل سکیں اور وہ پاس ہو
جائیں۔ بڑے ہو کر وہ یہ سوالات فراموش کر دیتے
ہیں جس طرح آج کے بڑے یہ سوالات فراموش کر
چکے ہیں کیونکہ انہیں اب پاس ہونے کے لئے نمبروں
کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ آج کا المیہ ہے۔ یہ
سوالات اور ان کے جوابات کا ایک ایک لفظ اپنے
اندر داستان چھپائے ہوئے ہے۔ جنہیں آج ہم یاد
نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ایسا کرنے سے ہم روشن خیال
نہیں رہتے۔ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں
ہمیں روشن خیالی کی نہیں بلکہ اپنے خیالات پر روشنی
ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اپنی سوچوں کا رخ ایک دفعہ
درست کر لیں۔ روشن خیال، صحت مند معاشرہ خود بخود
وجود میں آجائے گا۔ جو قومیں اپنے ماضی کو فراموش کر
دیتی ہیں اور اس سے نظریں چرائی ہیں وہ اپنی منزل
سے بھٹک جاتی ہیں۔ بھٹکے ہوئے لوگ اپنی سوچ کا
رہنما منزل کی جانب نہیں کر پاتے۔

ہمارا ماضی ہمیں کیا بتلاتا ہے؟

جو قومیں آج بڑا یا ترقی یافتہ ہونے کی
دعویٰ دار ہیں ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قابض،
لیرے، ظالم اور جابر رہے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور
ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارا ماضی بے داغ ہے۔
مسلمان نے جب بھی تلوار اٹھائی اللہ کی حاکمیت کو قائم
کرنے کے لئے یا پھر مظلوم کو ظالم کے ظلم سے نجات
دلانے کے لئے اٹھائی۔ کسی کو ناحق قتل نہیں کیا۔
قیدیوں سے سلوک دنیا میں بہترین انسانیت کی مثال
ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا الگ سے خطہ
ارض حاصل کرنا ایک معجزہ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے
لئے ایک مثال بھی ہے۔ بہترین قیادت، بہترین
سیاست، بہترین جذبہ ایمان اور ایثار و قربانی کی وہ
مثال جو دیکھنے میں نہیں ملتی ہے۔
وہ کیا حالات تھے کہ پاکستان بنانے کی
ضرورت پیش آئی؟

اسلام دین کا نام ہے جس میں حاکمیت اللہ
تعالیٰ کے سوا کسی کی نہیں۔ اسی کے بتائے ہوئے
اصولوں پر زندگی بسر کرنے کا نام اسلام ہے۔
ہندو دھرم اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ
لوگ (مسلمان، ہندو) آپس میں شادی بیاہ نہیں کر
سکتے۔ نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھا سکتے ہیں۔
دونوں دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان
تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی
ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متضاد
ہوتے رہے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں
اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے
سے مختلف ہیں اور رہیں گے۔

یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمان مل

ایک مشترکہ قومیت تخلیق نہیں کر سکتے۔ پس ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں زچ کرنا شروع کر دیا۔ کسی اہم سرکاری عہدے پر مسلمان کو تعینات کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی جھگڑے شروع کر دیئے۔ مسلمان نماز پڑھ کر نکلتے تو ان کے راستے میں مسجد کے باہر سوار کر پھینک دیئے جاتے۔ ہر قسم کی رعایت اور سہولت میں مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا جاتا۔

برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔

(قائد اعظم: سندھ مسلم لیگ کانفرنس۔ اکتوبر 1928ء)

اس تاریخی جدوجہد کے دوران جرأت و جسارت کی ایسی ولولہ انگیز مثالیں دیکھنے میں آئیں کہ جن پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔ حصول پاکستان کی تمنا دل میں لئے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا عزم لئے خواتین کی اس تاریخی جدوجہد میں شرکت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ کس طرح انہیں طرح طرح کی سختیاں اور اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کے قدم مضبوط و مستحکم رہے۔ ہر شہر قصبے اور گاؤں میں خواتین نے جلے اور مظاہرے کرنے کے علاوہ جانی اور مالی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ پورے ہندوستان میں ایوان بھی کانپ اٹھتے تھے۔ جگہ جگہ سے یونین جیک اتارے گئے، اس کی جگہ مسلم لیگ کا سبز جھنڈا لہرایا گیا۔ اس کام میں مردوں کے علاوہ خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ تحریک کمزور پڑنے کی بجائے روز بروز زور پکڑتی رہی اور کسی بھی مرحلے پر حکومت اس پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو

سکی۔ اس دوران لاکھوں افراد نے جن میں مرد و زن، بیرو و جوان سبھی شامل تھے۔ بے مثل صبر و تحمل اور جرأت و بہادری سے حکومت کے صبر و استبداد کا مقابلہ کیا۔ گولیاں کھائیں، لاٹھی چارج اور آنسو گیس کو برداشت کیا۔ کئی جانباڑوں نے شہادت پائی، ہزاروں زخمی ہوئے، بے شمار زندگی بھر کے لئے معذور ہو گئے لیکن ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی اور وہ پورے نظم و ضبط اتحاد و اتفاق اور یقین محکم کے ساتھ اپنی منزل کے لئے کوشاں رہے۔

ہندوؤں کی تشدد پسندی میں مذہبی منافرت کے ساتھ ساتھ سیاسی تفرقات کا عنصر بھی شامل تھا۔ کلکتہ، بہار، یوپی اور دوسرے ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں نے جس شرمناک وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا اور جس بے دردی سے ہزاروں معصوم و مظلوم افراد کو انتہائی درندگی کا نشانہ بنایا۔ ان کا مال اسباب لوٹا، گھر بار جلائے، عورتوں کی بے حرمتی کی اور کسٹن بچوں کو روتی بیٹی ماؤں کے سامنے ذبح کیا۔ اس کی اہم بنیادی وجہ ہندوؤں کا وہ جذبہ انتقام تھا جو ان کے دلوں میں مطالبہ پاکستان کے خلاف موجزن تھا۔

بعض شہروں میں مردوں کو ختم کر کے نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رخ دہلی کی طرف اور پھر ہندوستان کے دارالسلطنت میں پورا ستمبر کا مہینہ اس قسم کے قتل عام میں گزرا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشے میں بھارت میں تقریباً دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے اور تقریباً ایک کروڑ مسلمان انتہائی کسمپرسی کے عالم میں کسی نہ کسی

میں تمہیں مجھ جیسی ہزاروں کنواری بیٹیوں کی عصمتوں کا خون نظر آئے گا۔“

”ابھی اگست کی چودہ تاریخ نہیں آئی تھی کہ ہمارے سبز جھنڈے خون سے لال ہو گئے۔ ہمارے بچوں کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں بچوں کے خون میں تیرنے لگیں۔“

”پاکستان بننے سے پہلے میں کنواری تھی پھر میں نے اپنا کنوارہ پن اس جھنڈے پر قربان کر دیا۔ اس جھنڈے کی قدر و قیمت کا اندازہ مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں ہی کر سکتی ہیں جو اپنا کنوارہ پن اس جھنڈے پر قربان کر آئی ہیں۔“

”ستاروں کی روشنی میں میں نے دور دور تک لاشیں ہی لاشیں دیکھیں جنہیں کتے اور گیدڑ کھا رہے تھے۔ لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر کیا حشر ہوا ہو گا۔۔۔۔۔ بس اتنا سن لو اور دوسروں کو سناؤ کہ یہ پاکستان کے نام پر قتل ہونے والوں کی لاشیں تھیں جن کی ہڈیاں ہندوستان کی مٹی میں مل گئی ہیں اور جو پاکستان کو دیکھ بھی نہیں سکے جس کی خاطر وہ کٹ مرے اور انہیں نہ لفن نصیب ہوا نہ قبر اور نہ ہی ان کا کسی نے جنازہ پڑھا۔ پاکستان کے لوگوں کو بتاؤ کہ جس ملک میں تم آج عیش و عشرت کر رہے ہو اس کی جڑوں میں غریب کسانوں کی ہڈیاں دفن ہیں اور تم نے اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کر کے ان بد نصیبوں کو بھوکا مار دیا ہے جو اپنے بچے اور بیٹیوں کی عصمتیں پاکستان کے نام پر قربان کر کے موت کے راستوں پر ننگے پاؤں پیہل چل کر یہاں پہنچے تھے۔“

”پاکستان کے جھنڈے میں ہزاروں لڑکیوں کی عصمت کا خون شامل ہے اور اس جھنڈے سے کھینچنے والوں سے کہو کہ بے غیر تو! تم اپنی ہزاروں بیٹیوں کی عصمتوں سے کھیل رہے ہو اور یہ نہ بھولو کہ

طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ پائے۔

جن لوگوں نے قربانیاں دیں، جو لوگ اس خطہ ارض پاک کو حاصل کرنے کی تحریک میں شامل تھے، وہ آوازیں جو کہیں دور سفر کر رہی ہیں یا پھر ہمارے بہت قریب ہیں، ہم اب وہ قوت ساعت کھو چکے ہیں کہ انہیں سن سکیں۔ ان کی آوازیں کیا ہیں؟ وہ صدائے بازگشت کیا ہے؟ جاگتے رہو کا وہ نعرہ کیا معنی رکھتا ہے؟ آئیے اہل کر اس سردخانے میں تھوڑی درق گردانی کرتے ہیں کہ شاید کسی کا ضمیر جاگ اٹھے اور وہ یہ آوازیں دل سے محسوس کر سکے۔

”تمہیں تو علم ہی نہیں کہ پاکستان نے ہم سے کتنی بڑی قربانی لی تھی۔ تم سب تو پاکستان میں پیدا ہوئے ہو جو ہم نے دیکھا اور بھینسا ہے وہ اللہ دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ تم نے بھی دودھ پیتے بچے کی لاش گلی میں دیکھی ہے؟۔۔۔۔۔ میں نے سینکڑوں دیکھی ہیں، لوگوں نے ہزاروں دیکھی ہیں۔ ہندوستان کی گلیوں اور کھیتوں میں۔۔۔۔۔ تم نے پردہ نشین مسلمان لڑکیوں کا ننگا جلوس دیکھا ہے؟۔۔۔۔۔ ان سے پوچھو جو مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔۔۔۔۔ تم نے اتنی چیونٹیاں مری ہوئی نہیں دیکھی ہوں گی جتنی ہم نے وہاں مسلمانوں کی لاشیں دیکھی ہیں۔

”بہت سی لڑکیاں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر پاکستان آ گئی تھیں، پاکستان میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ اتنا ہی دردناک ہے جتنا وہ سلوک جو ان کے ساتھ سکھوں نے کیا تھا۔۔۔۔۔ کوئی بھی گھر انہیں قبول نہ کرتا، سب یہی کہتے کہ لڑکی داغدار ہے۔“

”انہیں صرف اتنا بتا دو کہ پاکستان کے جھنڈے میں میری عصمت کا خون شامل ہے۔ انہیں یہ بتاؤ کہ اس جھنڈے کو قریب سے دیکھو تو اس

انڈین سول سپرویز اور فوج کے جو افسران آئے ان میں سے زیادہ تر نے بیش قیمت مٹرو کہ جائداد وسیع و عریض خدہی اور شہری اراضی پر قبضہ کر لیا اور اپنے عزیز و اقارب کے لئے اعلیٰ ترین ملازمتوں کا بندوبست کر لیا۔ اس کے بعد لاکھوں کی تعداد میں لئے بے عوام پیدل اور بیل گاڑیوں، بسوں، ٹرکوں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے پہنچے۔

موجودہ پاکستان میں ہندو اور سکھ تاجر ملک کی شہری جائداد کے پچانوے فیصد کے مالک تھے۔ ان کے جانے کے بعد ظاہر ہے اس نے تقسیم ہونا تھا اور یہ صحیح تھا کہ اس سارے عمل میں بہتوں کی چاندی ہوئی۔ اس مٹرو کہ جائداد نے قوم کے ضمیر میں بے ایمانی کا بیج بو دیا جو لوگ ہندوستان میں بھی کرپٹ، خود غرض اور لالچی تھے، انہوں نے یہاں آ کر بھی اپنے جیبوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ بے شمار رہائشی الاٹمنٹ میں خرد برد ہوا۔ یہاں کے لوگ جو پہلے ہی صاحب جائداد تھے انہوں نے یتیم، بیواؤں اور نادار افراد کے نام گھروں کی الاٹمنٹ کروا کر خود قبضہ جما لیا۔ وہاں سے آنے والے کرپٹ سفید پوش حضرات کی یہ حالت تھی کہ جس شخص نے اپنے عزیزوں سے کہا کہ دیکھو بیٹا میں نے تو اپنے رب کو جواب دینا ہے، میں تو کلیم فارم پر یہی لکھوں گا کہ میں نے وہاں پانچ مرلے کا مکان چھوڑا ہے، اسے پانچ مرلے کا مکان مل گیا۔ جس نے کہا کہ میں دس ایکڑ کی کوٹھی چھوڑ کر آیا ہوں اسے وہ مل گئی۔

چند سالوں میں لاکھوں افراد نے ہزاروں افراد کو امیر بننے دیکھا اور قوم میں یہ پیغام عام ہو گیا کہ ”بچ بولو اور بھوکے مرد“ اس کے برعکس کلیم فارم پر صرف حرف لکھ دو تو اتنی جائداد کے مالک بن جاؤ گے جو تمہارے باپ دادا کے سہانے خوابوں میں نہ تھی۔

عصمت کا خون شہید کے خون جتنا پاک ہوتا ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب یہ خون سرچھڑ کر بولے گا۔
”انگریز جیسی شہنشاہ طاقت کی غلامی کی بیڑیاں توڑنے والی قوم اپنے ہی بنائے ہوئے رسم و رواج کی زنجیریں آج تک نہیں توڑ سکی۔“

”لڑکیوں پر آنسو گیس پھینکی جا رہی تھی، انہیں سڑکوں پر پولیس تھدیٹ رہی تھی اور لڑکیاں برقعوں سے لکل کر پولیس کی لٹھیوں اور گولیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے سرکاری عمارتوں پر جھنڈے لہراتیں اور اپنے بھائیوں کو جائیں قربان کرنے کے لئے مشتعل کئے رکھی تھیں۔“

”پاکستان میں جس طرح دولت انسان کو لیڈر اور دانشمند بنا دیتی ہے اور جس طرح دولت ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے اسی طرح اس وقت بھی ہوتا تھا جب ہم آزاد نہیں تھے۔“

”قوم کے نوجوان طبقے یعنی طالب علموں نے پاکستان کے نام اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جس بہادری، خلوص اور عزم کے مظاہرے کئے وہ ایک تاریخی ثبوت ہے کہ پاکستان ان لڑکوں اور لڑکیوں نے بنایا ہے اور آج انہی کے بیٹے اور بیٹیاں پاکستان کو تباہی سے بچا سکتی ہیں۔ یہ تباہی ہندوستان کی طرف سے آئے، خواہ پاکستان کے اندر سے اٹھے۔ اس کا مقابلہ صرف نوجوانوں کو کرنا ہے۔“

ہجرت کر کے آنے والوں نے قیام پاکستان کے بعد زندگی میں کیا کیا دیکھا یہ ایک الگ داستان ہے جس میں کرب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مہاجرین و انصار کی جو مثال مدینہ میں دیکھنے میں آئی تھی وہ یہاں کم ہی نظر آئی۔ قیام پاکستان سے پہلے جو لوگ خوشامدی اور مخالف تھے وہ یہاں کے حکمرانوں کے ساتھی بن گئے، ان کے ساتھ ساتھ

نہیں بلکہ غریب کو عزت ملے اس سے محبت کی جائے، مسکین اور کمزور کی بھی عزت ہو۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد جو پہلی تقریر کی وہ بڑی پُر معنی ہے۔ انہوں نے کہا..... تم میں جو کمزور ہے وہ میری نظر میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ جب تک میں اس کو اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں جو قوی ہے وہ میری نظر میں سب سے کمزور ہے، جب تک میں اس سے کمزور کا حق نہ لے دوں..... یہ جملہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں کمزور کا حق دلانا پہلا فرض ہے۔

آج پاکستانی معاشرے میں سب کچھ اس کے الٹ ہو رہا ہے۔

تمام پاکستانیوں کو ملک کے وسائل اور سہولیات تک رسائی کے مساوی حقوق کون دے گا؟
بارسوخ اور مقتدر لوگ کمزور اور غریب لوگوں کے حقوق کا استحصال کب چھوڑیں گے؟

سب کو ترقی کے برابر مواقع حاصل ہوں اس کے لئے حقوق کی تقسیم میں نفرت و انتقام کی بجائے محبت اور تعاون سے کام کب لیا جائے گا؟

غریب کا بچہ اعلیٰ ترین درس گاہ میں زیر تعلیم کب ہوگا؟

مفت دی جانے والی تعلیم معیاری کب ہو گی؟

غریب مزدور ملک کے دوسرے شہریوں کی طرح علاج معالجے کی جدید سہولتوں سے فیضیاب کب ہوں گے؟

غربت پریشانیوں اور مشکلات کے سبب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک مسلمان باشندہ اپنی زندگی کے تلخ اوقات سے تنگ آ کر خودکشی کی موت مر جاتا ہے اور ساتھ ہی پریشانیوں سے نجات کے

جب قوم نے یہ سبق سیکھ لیا تو پھر پیچھے مڑ کر منہ دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ حالت ہو گئی کہ وطن عزیز میں سچ نام کی کوئی شے نہ رہی۔

اصل بات یہ ہے کہ 70 برس گزرنے کے باوجود ہم غریب اور امیر کے فرق کو کم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر پائے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے اقرباء پروری، سفارش، قاعدہ قانون کی خلاف ورزیوں اور آئین (بے شک قائد اعظم کے ارشادات اور نظریہ پاکستان کے مطابق نہ سہی) کی بار بار مصلیوں سے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ اب وطن عزیز میں کوئی قانون نہ ہے۔

”میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوموں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپے تخریب ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذب توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آجائیں۔“

(ذہبا کہ مارچ 1948ء)

امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا گیا۔ انصاف وقت کی گہری دھند میں کہیں کھو گیا، ہر صاحب اقتدار و اختیار طاقتور اور محکوم، غلام اور کمزور ہوتا چلا گیا۔

انگریز دور میں جو فاصلہ افسر اور عام شہری کے بیچ رکھا گیا تھا وہ آج بھی قائم ہے۔ اعلیٰ افسر آج بھی درخواست لے کر آنے والے کو اپنا غلام سمجھتے ہیں دور غلامی کی اس منحوس روایت کو ختم کئے بغیر اخوت اور محبت کی بنیاد پر وہ معاشرہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے جسے ہم لانا چاہتے ہیں۔

اسلامی نظام مملکت میں علاقے، رنگ و نسل اور دولت و ثروت کی بنیاد پر قائم تمیز کی کوئی گنجائش

مجرم کہتا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یقیناً حکومت ذمہ دار ہے۔

فرسودہ ٹیلی فون نظام، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ مگر اسلام آباد میں نہیں، جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر اور طرح طرح کی بیماریاں جن میں زیادہ تر دبائی اور مہلک بیماریاں شامل ہیں اور پھر ستم ظریفی کہ سرکاری ہسپتالوں میں دوائیاں ناپید، ہسپتال اور تھانہ کچہری کا ایک جیسا ماحول، انسانیت کے ساتھ ظلم کی انتہا، غریب آدمی کا کسی کیسی میں پھنس جانا یا بیمار ہو جانا دونوں صورتوں میں اس کی موت ہی اسے چھٹکارا دلاتی ہے۔ کیوں کہ اسے نہ انصاف ملتا ہے اور نہ ہی اس کا علاج ہو پاتا ہے۔ سکتی ہوئی انسانیت کی اس قسم کو غریب عوام کہا جاتا ہے اور ان کو دی جانے والی سہولیات کو ”عوامی سزائیں“ کہا جاتا ہے۔

کاہر فرد کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ کہاں جائے، کس سے فریاد کرے؟ جان و تن کا رشتہ کیسے برقرار رکھے اور عزت نفس کو کس طرح قائم رکھے؟ ہر غریب یہ پوچھتا ہے کہ اگر امیر پاکستانی ہے تو مجھے کیوں پاکستانی نہیں سمجھا جاتا؟ حکومتی خرچے پر بیرون ملک علاج کروانے والا پاکستانی ہے تو پھر سرکاری ہسپتال کی ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر یا دوائیاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے جان سے جانے والا پاکستانی کیوں نہیں سمجھا جاسکتا؟ فرسٹ ڈویژن والا سفارش یا رشوت دینے کے قابل نہ ہو تو اسے نوکری نہیں ملتی اسے کیوں پاکستانی نہیں سمجھا جاتا؟ اگر انصاف دینے والا پاکستانی کہلاتا ہے تو جو انصاف کے انتظار میں مر جاتا ہے وہ پاکستانی کیوں نہیں ہے؟ بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والا اور اپنے بیوی بچوں کو ذبح کرنے والا بھی تو پاکستانی ہے۔ جنہوں نے قربانیاں دیں اور اپنے ہی

لئے اپنے بیوی بچوں کے گلے کاٹ دیتا ہے۔ اس طرح کے بیسیوں واقعات آئے روز ہو رہے ہیں۔ اخبارات میں خبریں چھپتی ہیں، پڑھی جاتی ہیں اور نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ ان مقتولین کا بظاہر کوئی قاتل نہیں ہوتا جس کو سزا دی جاسکے۔ کیونکہ قاتل تو خود بھی قتل ہو کر اپنی سزا پا چکا ہوتا ہے۔ بلاشبہ اس صورت حال کے اہم اخلاقی اسباب ہیں لیکن معاشی اسباب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس کی ذمہ داری معاشرے، خاص طور پر حکومت پر آتی ہے جس کے ہاتھوں میں سارا انتظام کار ہے۔

یہ ان تمام دیگر مسائل میں سے ایک مسئلے غربت کا صرف ایک تاریک پہلو ہے ورنہ بے روزگاری، ظلم و ناانصافی، استحصال و طبقاتی نظام، کرپشن، لوٹ مار اور اڑھائی فیصد محدود حکمران طبقے کی عیاشیاں روزانہ سینکڑوں بے گناہوں کی موت کا سبب بنتی ہیں جبکہ ذمہ داری کا کہنا ہے کہ فی کس آمدنی میں اضافہ غربت میں کمی کا واضح اشارہ ہے اور ترقی کے ثمرات عام آدمی تک پہنچنا شروع ہو گئے ہیں۔ مگر کیسے؟ جب روٹی آٹھ آنے کی تھی تب غریب بڑی مشکل سے ایک روٹی خرید پاتا تھا۔ آج وہی غریب جیب میں چھ روپے رکھتا ہے لیکن روٹی پھر بھی ایک ہی خرید سکتا ہے۔ معاملہ تو تب تھا اگر وہ آٹھ آنے کے حساب سے ایک روپے کی دو روٹیاں لیتا تو پھر بھی اس کی جیب میں پانچ روپے بچ جاتے مگر ایسا نہیں ہے اب اس کی جیب میں ایک روٹی کے لئے بھی پورے پیسے نہیں ہوتے۔ وہ بھوک مٹانے کے لئے چھینتا ہے، چراتا ہے، جب قانون کی گرفت سخت ہو جائے اور بھوک بھی برداشت سے باہر ہو جائے تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا ہمارا معاشرہ اور قانون اسے

خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ یعنی معاشرہ ہر شخص کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو گا۔

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جو ذمہ داری لے کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام کرے۔ وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جو ذمہ داری لے کہ ہر شخص کے علاج معالجے کا پورا پورا انتظام کرے۔

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جہاں ہر شخص اپنی پوری استعداد اور محنت سے کام کرے اور یہ نہ ہو کہ کچھ لوگ محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور باقی لوگ ان کی کمائی پر عیش اڑائیں۔

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جو علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر اور قائد اعظمؒ کی انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہو؟

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جہاں شہیدوں کی قدر کی جائے اور ان کی قربانیوں کو رائیگاں نہ ہونے دیا جائے۔

آج وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ کیا جاتا ہے وہ برادرانِ یوسفؑ کی طرح اپنے قافلے کا سب سے قابلِ قدر اور قیمتی ورثہ دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہیں۔ قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بے۔ آج کون ہے جو پاکستان کو دل سے اپنا سمجھے اور یہاں بسنے والوں کو پاکستانی اور پھر اس منتشر افرادِ قوم کو پھر سے ایک مرکز پر جمع کرے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت اور بربادی کے سامان سے بچائے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرے جسے ساری دنیا گھمے۔ ”یہ قرآن کا پاکستان ہے۔“



وطن میں غلاموں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں بھی تو پاکستانی کہلانے کا حق حاصل ہے۔

ایسے بے شمار افراد ہیں جو پاکستان کی شہریت تو رکھتے ہیں لیکن مساوی حقوق کے حصول کے وقت انہیں پاکستانی نہیں سمجھا جاتا۔ ایسے سمجھ دار لوگ بھی ہیں جو عوام کو اڈل درجے، اوسط درجے اور نچلے درجے کا پاکستانی سمجھتے اور پکارتے ہیں۔ کیا تحریک پاکستان کے وقت قربانی دینے والوں سے ہندوؤں اور سکھوں نے قتل کرتے وقت پوچھا تھا کہ آپ کس درجے سے تعلق رکھتے ہیں؟ ہاں پوچھا تھا کہ تم مسلمان ہو یا نہیں اور پھر مسلمان خواہ وہ عورت ہو، مرد، بچہ، بوڑھا یا جوان سب کو بے دردی سے مارا گیا اور جو لٹے پٹے پینچے کچھ کو ان کے انہوں نے مارا جو جگے گئے وہ آج اپنے آپ کو آہستہ آہستہ خود ہی مایوس ہو کر ختم کر رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کو یقین نہیں ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جس میں ہر پاکستانی کی عزت، بلا تمیز، رنگ، نسل، پیشہ کی بجائے بطور انسان ہوگی؟

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جس میں کسی کو بہت یا ذلیل نہیں سمجھا جائے گا بلکہ ہر تری کا معیار اس فرد کی محنت، دیانت اور صداقت ہو گا؟

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جب ہر شخص بے کس و لاچار اور بے بار و مددگار نہیں ہو گا۔ ہر ایک کی بات سنی جائے گی اور تکلیف رنج کی جائے گی۔ ہر شخص کو انصاف ملے گا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملے گا۔ کوئی صاحب، انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکے گا؟

وہ معاشرہ کب قائم ہو گا جس میں کوئی فرد بھوکا، تنگ یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے

اگست 47ء بھول جائے گا

جس روز قوم یہ دن بھول گئی زوال شروع ہو جائے گا

پاکستان بہت زیادہ خون مانگ رہا تھا جو مسلمان دریاؤں اور تالابوں کے حساب سے سبز پرچم کی نذر کرتے جا رہے تھے۔ تاریخ میں شاید ہی کسی قوم نے اپنے ملک کی خاطر اتنے بچے اور بچیاں ذبح کروائی ہوں گی۔



☆ الحاج عبدالرحیم چشتی

1947ء کے بعد 69 اگست گزر گئے ہیں۔ دنیا والوں کے لئے اگست کا مہینہ بہت خوبصورت اور شاعروں کے لئے رومان پرور ہوتا ہے کیونکہ برکھارٹ آتی ہے، پیڑوں سے آم لگتے ہیں، اکھی سہیلیاں جھولے جھولتی ہیں مگر ان پاکستانیوں کے لئے جو 1947ء میں سرحد پار سے ہجرت کر کے آئے تھے، سادوں کی برکھا خون کا مہینہ برساتی ہے۔ خونچکاں یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ یہ یادیں خوں آشام ہی سہی، ہم اس قابلِ فخر حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا کرتے کہ

پاکستان کے سبز پرچم کی ہریالی میں ہم نے کتنے معصوم بچوں، چھیل چھیلے جوانوں اور بہو بیٹیوں کا خون سمویا ہے۔

چھ ستمبر 1965ء کی صبح جب لاکھوں معصوم مسلمان بچوں کے قاتل اور مسلمان بہو، بیٹیوں کی عصمتوں کے لیروں نے پاکستان پر حملہ کیا تو 1947ء کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ سن سینتالیس کو بھول سکتے ہیں نہ پینے لکھ کو۔ جس روز قوم ان دونوں میں سے ایک بھی کڑی بھول گئی اس روز سے قوم کا زوال شروع

گے جو کرفیو لگنے اور کھلنے کا اعلان کیا کرتی تھی۔ یہ آواز انور کی تھی جو قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ میں سی پیک میں متوجہ تھے۔

قتل کی بڑھتی ہوئی وارداتوں کے پیش نظر انکرہ کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ جس محلے میں قتل ہوا اس تمام محلے سے جرمانہ وصول کیا جائے۔ اس طرح حکومت نے کئی بار جرمانہ وصول کیا۔ جرمانے سے ہندوؤں اور سکھوں نے ایک دوسرے کو ہراس دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ کسی علاقے میں کوئی مسلمان قتل ہو جاتا تو قاتل اس کی لاش کسی دوسرے محلے میں پھینک آتے۔ مسلمانوں نے انتقامی کارروائی جاری رکھی۔ جہاں کوئی ہندو یا سکھ تھے چڑھ جاتا اسے لے کر دیتے اور لاش انہی کے علاقے میں پھینک کر برآمد سے بچ جاتے۔

زیادہ تر قتل مسلمان ہو رہے تھے اور ہندو مسلمانوں کے گھروں کی ہی تلاشی لیتی رات کو۔ مسلمانوں کے پاس اسلحہ تو تھا ہی نہیں کہ بلا جاتے۔ اسلحہ ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں جہاں پولیس نے کبھی تلاشی نہ لی۔

ایک روز صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ چوک داس کے تمام مسلمان، عورتوں اور بچوں سمیت مار دیئے گئے ہیں۔ یہ ہندوؤں کا علاقہ تھا جس میں کھڑی ہوئی ایک مسجد اور مسجد سے ملحق مسلمانوں کے گھر انے تھے۔ وہاں کافروں نے ایک بچے کو بھی نہ چھوڑا۔ شہیدوں کی تعداد ایک سو کے قریب تھی، کے مسلمان اتنے بے حس نہیں تھے کہ لاشوں کو مار رہے دیتے۔ مسلمانوں کا وہاں جانا خواہشی تھا۔ ایک وفد فوجی حکام سے ملا جنہوں نے حفاظت میں مسلمانوں کو لائیں لانے کا انتظام کیا۔ شہر کے مسلمان تمام لاشیں اٹھا لائے اور نماز ادا

ہو جائے گا۔ جو قوم اپنے وطن کے جاں نثاروں کو بھول جاتی ہے اسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔

آج سیفالیس کی کڑی سزا رہا ہوں۔ ذرا غور فرمائیے کہ بلوچ رجسٹ نے انوں لڑیوں کو کس طرح ملایا ہے۔

میں اپنے خاندان کے ساتھ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا۔ نومبر 1946ء کا ذکر ہے جب میں حج کافر فیضہ دار کے امرتسر واپس پہنچا تو دیکھا کہ ہندو مسلم کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو دشمن سمجھنے لگے تھے کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب پاکستان بن کے ہی رہے گا۔ مارچ 1947ء میں ہی کشیدگی ہندوؤں کی منظم سازش کی صورت اختیار کر گئی جس کے تحت مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ مارچ میں ایک مشہور سکھ سرجن سنگھ گول ہٹی والے نے امرتسر کے ہال بازار میں ہندوؤں کے ایک جھوم میں کرپانیں تقسیم کیں۔ مسلمان چوکس ہو گئے پھر بھی اکاذ کا مسلمان شہید ہونے لگے اور مسلمانوں کے مکان بھی جلنے لگے۔ کوئی مسلمان بھولے بھٹکے ہندوؤں کے محلے میں چلا جاتا، بھی واپس نہ آتا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان آبادیوں کے قریب آنا چھوڑ دیا تھا۔ مسلمانوں کے جو مکان الگ تھلک تھے وہ نذر آتش ہو رہے تھے۔

حکومت ہندوؤں اور سکھوں کی نہیں تھی۔ پھر بھی قتل اور آتش زنی کی وارداتوں کی طرف سرکاری طور پر ذرہ بھر توجہ نہ دی گئی۔ دفتر میں مسلمان اہلکاروں کو کھلم کھلا پریشان کیا جانے لگا۔ 3 جون 1947ء کی شام ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا تو امرتسر میں قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا جو روز بروز بڑھنے لگا۔ تب حکومت کو کارروائی کا خیال آیا اور کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ امرتسر کے لوگ آج بھی اس آواز کو نہیں بھولے ہوں

مذہب کی طرف سے چوہدری ظہور الدین پال مرحوم ایڈووکیٹ پیروی کر رہے تھے۔ اچانک کسی نے دتی بم پھینکا جو عدالت کی میز پر پڑا لیکن پھٹنے سے پہلے فرش پر جا گرا اور پھٹا۔ اگر میز پر پھٹ جاتا تو بہت نقصان ہوتا۔ ذرا دور پھٹنے سے چوہدری ظہور الدین پال معمولی زخمی ہوئے اور استغاثہ کا ایک گواہ جو ایک گوجر تھا، شدید زخمی ہو گیا۔ وہ ہسپتال میں جا کر مر گیا تھا۔ ہندو شیونگر افرسوسہن لال کو بھی زخم آئے اور چھت کا تھوڑا سا حصہ اڑ گیا۔ یہ بم فقیر سید سراج الدین کو ختم کرنے کے لئے پھینکا گیا تھا۔ اللہ نے کرم کیا کہ وہ بال بال بچ گئے۔ میں بھی محفوظ رہا۔

میں نے اتفاق سے بم پھینکنے والے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کمرہ عدالت سے دوڑ کر نکلا تو میں اس کے پیچھے بھاگا اور تھوڑی دور اسے جا لیا۔ وہ امرتسر کا رہنے والا ایک سکھ بسنت سنگھ تھا۔ اس کے پاس ایک تھیلہ تھا جس میں سے دو اور بم برآمد ہوئے۔ اس نے بتایا کہ مسلمانوں کے قتل عام کے منصوبے کے تحت بم پھینکنے والوں کو ایک بم پھینکنے کا ایک سو روپیہ معاوضہ ملتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ باقی دو بم دوسرے دو مسلمان مجسٹریٹوں کو ختم کرنے لئے تھے۔

بسنت سنگھ کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا بنا۔ ظاہر ہے کہ اسے چھوڑ دیا گیا ہو گا۔

فقیر سید سراج الدین اسی روز جارج دے کر لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ اس روز کے بعد ہم تمام مسلمان الیکاروں نے عدالت میں جانا چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے دفتر میں ہمیں غیر مسلم طنزیہ لہجے میں کہا کرتے تھے کہ مسلمان! بے وقوف نہ بنو۔ پاکستان چند دنوں کا کھیل ہے۔ میاں اصغر علی اور پیر صلاح الدین بھی ایک دو روز بعد لاہور ہجرت کر

رہمیدوں کو دفن کر دیا گیا۔ یہ سب پاکستان کے نام لہمید ہوئے تھے مگر انہیں پاکستان کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ آج وہ پرانے دہس کی مٹی میں دفن ہیں۔ یہ نامہ ایسا تھا کہ مسلمان آگ گولہ ہو گئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ آنے والے جمعہ کی نماز چوک پراگ داس لہمید میں پڑھی جائے گی۔ اس اعلان کا مطلب اصل یہ تھا کہ مسلمان کفار کے ساتھ کھلے میدان میں لڑیں گے۔

جمعہ کے روز فوج پہنچ گئی۔ ہندو اور سکھ بھی ہالوں اور برجیوں سے مسلح ہو کر آ گئے۔ مسلمان ہال اور جوق مسجد چوک پراگ داس میں جمع ہونے لگے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ البتہ ہر مسلمان لہمید میں مٹی کا ایک ایک لوٹا تھا جس میں پانی تھا۔ میں یہ دیکھ چلا کہ بعض مسلمان پانی میں مرچیں پی رہے تھے۔ بہر حال یہی لوٹے مسلمانوں کے ہتھیار

لہمید ہا ماعت پڑھی گئی۔ نعرے لگائے گئے اور لہمید نے اٹھائے ہوئے مسجد سے نکل آئے۔ ہندو لہمید عام کے لئے تیار تھے۔ فوج کی موجودگی میں لہمید گما۔ مسلمانوں نے لوٹوں سے جوابی حملہ کیا۔ لہمید کی ماعت سے زیادہ کشت و خون نہ ہوا۔ لہمید لہمید امرتسر والے آج بھی ”لوٹا پریڈ“ کہتے

ان لوٹ امرتسر میں تین مسلمان مجسٹریٹ لگے۔ فقیر سید سراج الدین ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج۔ میاں اصغر علی سول سپلائی آفیسر و لہمید صلاح الدین بھی مجسٹریٹ تھے۔ میں فقیر سراج الدین کی عدالت میں کلرک تھا۔ میں کرنیو لہمید ہادی لہمید لہمید تھا۔ 10 اگست کا واقعہ ہے کہ لہمید میں ایک مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔

گئے۔ اب کوئی مسلمان مجسٹریٹ نہ رہا۔ تمام غیر مسلم تھے جن کی پشت پناہی میں مسلمان آبادیوں پر رات کے وقت حملے ہونے لگے۔ حملے سے پہلے آبادی کی بجلی بند کر دی جاتی تھی۔ ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر محلے میں نوجوانوں کی پارٹیاں ہر رات پہرہ دینے لگیں اور گلیوں کو اپنی دروازوں سے محفوظ کر لیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی ایسے ہی حفاظتی انتظامات کر لئے۔ امرتسر کے مسلمانوں نے کمال شجاعت سے کفار پر جوابی وار کئے اور ان پر واضح کر دیا کہ مسلمان امرتسر میں بھی پاکستان بنا سکتے ہیں لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو حکومت کا تعاون اور اسلحہ بارود حاصل تھا جس کے سامنے مسلمان بے بس ہو گئے تھے۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ لاہور کا رخ کیا جائے۔ ہمیں آخر یہیں آنا تھا لیکن ہم بھاگ کر نہیں بلکہ ہندوؤں اور سکھوں کو یہ ذہن نشین کرا کے آنا چاہتے تھے کہ ہم تعداد میں کمی اور اسلحہ کے فقدان کے باوجود ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

جب شہر کے مسلمان قافلوں کی صورت میں شہر سے نکلے تو ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ بیشتر گولیاں پولیس اور فوج کی رائلٹوں سے نکلتی تھیں۔ دونوں میں ریلوے سٹیشن تک جانے والی سڑکیں مسلمانوں کی لاشوں سے اٹ گئیں۔

12، 13 اگست کی درمیانی رات میرے محلے کی بجلی بند ہو گئیں ہم مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہمارے محلے میں چند گھر غیر مسلموں کے بھی تھے۔ اندھیرے میں حملے کی صورت میں ان گھرانوں کا بھی نقصان ہو سکتا تھا لیکن مسلمان نوجوان ان کی حفاظت کرتے رہے۔ ان نوجوان کا لیڈر جیرے شاہ تھا۔ وہ ان پڑھ تھا لیکن ذہین اور دلیر۔ اسے لوگ ان پڑھ لیڈر کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

ہم پر گولیاں چلتی شروع ہو گئیں۔ کفار نے محلے کا آگ لگانے کی کوشش بھی کی جو ہم نے کامیاب نہ ہونے دی۔ صرف ایک جگہ انہوں نے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جو نوجوانوں نے وہیں بجھا دی۔ تمام رات گولیاں چلتی رہیں۔ محلے کے مسلمان لاشیوں وغیرہ سے مسلح مقابلے کے لئے تیار رہے لیکن ہندو اور سکھ قریب نہ آئے۔ صبح ہوئی تو سب نے فیصلہ کیا کہ شہر سے بیشتر مسلمان جا چکے ہیں اس لئے یہ محلہ بھی خالی کر دیا جائے۔ شریف پورہ کو پناہ گزین کمپ بنایا گیا اور ہم سب خالی ہاتھ شریف پورہ کو روانہ ہوئے۔ ہم میں سے بعض ایک دوسرے راستے، دروازہ رام باغ کی طرف سے، شریف پورہ کو چلے تو ہم نے انہیں خبردار کیا کہ اس راستے میں رائلٹوں سے مسلح پولیس والے موجود ہیں، ادھر سے نہ جائیں لیکن وہ چلے گئے اور کبھی بھی کمپ میں نہ پہنچ سکے۔ کبھی پولیس کی گولیوں کی نذر ہو گئے۔ دھاندلی تو یہ ہوئی تھی کہ پولیس کے مسلمان افسروں اور سپاہیوں سے ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ وہ بے چارے مسلمانوں کی کیا حفاظت کرتے، شہر کے اندر گورکھار جمنٹ گشت کر رہی تھی اور باہر مرہٹہ انفیٹری گھوم رہی تھی۔ شہر کے اندر اور باہر مسلمانوں کا خون بے دردی سے بہہ رہا تھا اور جگہ جگہ سے جلنے مکانوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ پاکستان بہت زیادہ خون مانگ رہا تھا جو مسلمان دریاؤں اور تالابوں کے حساب سے سبز پرچم کی نذر کرتے جا رہے تھے۔ تاریخ میں شاید ہی کسی قوم نے اپنے ملک کی خاطر اتنے بچے اور بچیاں ذبح کروائی ہوں گی۔

شریف پورہ جاتے ہوئے سندھ سنگھ ہینڈ کاشیبل نے جو میرے ساتھ عدالت میں نائب کورٹ رہا تھا، کہا کہ کل صبح آپ تھانے آ جائیں تاکہ ضروری سامان مکان سے نکلوا دوں۔ لہذا اگلے روز میں سندھ سنگھ کے

14 اگست 1947ء کی صبح طلوع ہوئی جس کی خاطر لاکھوں انسانوں کی زندگی کے سورج غروب ہو گئے تھے۔ شریف پورہ کیمپ میں پناہ گزین مسلمانوں نے بارگاہ الہی کے حضور شکرانے کے بعدے کئے۔ وہ رات گولیوں کی تڑاخ تڑاخ سے گزرتی رہی اور شہر چلتے مکانوں کے شعلوں سے روشن رہا۔ آگ کا سمندر تھا جو امرتسر کو بہائے لئے جا رہا تھا اور آگ اور خون کا یہ کھیل امن پسند بابا نانک کے پجارہیوں کے ہاتھوں کھیلایا جا رہا تھا۔

بشیر بختیار جو بعد میں پاکستان کے مزدور لیڈر بنے، شریف پورہ کیمپ کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ کیمپ میں تقریباً دو لاکھ مہاجرین تھے جن کے لئے خوراک کا انتظام بہت ہی میزھا مسئلہ تھا۔ سابق صدر ایوب خان باؤنڈری فورس میں بڑے افسر تھے جن کی موجودگی اس مہاجرین کو بحفاظت پاکستان پہنچایا جاسکتا تھا اور کیمپوں میں ان کی ضروریات بھی پوری کی جاسکتی تھیں لیکن چند ایک جو وہاں کی بنا پر جو میں لکھنا نہیں چاہتا کہ وہ کیوں ہماری مدد نہ کر سکے، ان کی بجائے ہمیں باؤنڈری فورس کے انچارج ایک انگریز افسر مسٹر ریس کے پاس جانا پڑا۔ اس نے گورکھار جمنٹ کا ایک دستہ دے دیا جس کی حفاظت میں بشیر بختیار چند ایک نوجوانوں کو لے کر گئے اور مسلم راشن ڈپوزٹس سے آٹا، چینی وغیرہ اٹھالائے۔ یہ راشن مہاجرین میں تقسیم کیا گیا۔

26 یا 27 اگست کے روز معلوم ہوا کہ شریف پورہ کیمپ سے ملحق جو پولیس لائنز ہیں وہاں ریاست جیالہ کی فوج آگئی ہے۔ کیمپ کی حفاظت کے لئے مرہٹہ انفیٹری تھی۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ پنیالہ کی فوج اور مرہٹہ فوج مل کر کیمپ کے دو لاکھ مہاجرین کو ختم کرنے کا پروگرام مرتب کر چکی ہے۔ حملہ رات کے وقت ہونا

ہمراہ، دو سپاہیوں اور دو گورکھانویں کے مکان پر گیا۔ ہوکا عالم تھا۔ آگ چند ایک مکانوں کو جلا رہی تھی۔ میں نے ضروری کاغذات کا سوٹ کیس اور کلام پاک کے نسخے اٹھائے اور واپس ان کے ہمراہ چل دیا۔ جب مسجد کے قریب سے گزرا تو اندر سے آواز آئی چشتی میری بات سن جاؤ۔ میں نے حفاظتی دستے کو ذرا آگے کر دیا اور خود مسجد کے اندر گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے محلے کے ہول کی مالکہ مائی نجی جن اپنی بہو، دو پوتوں اور نوکر کے ہمراہ چھپی بیٹھی ہے۔ کلیجہ منہ کو آ گیا۔ جب بچوں نے ہاتھ جوڑ کر کانپتی ہوئی آواز سے روٹی مانگی تو میرے آنسو نکل آئے۔

میں باہر نکلا سمندر سنگھ کو بلا کر کہا کہ ان معصوموں کو کھانا کھائیں سے بھی لا کر دو۔ دیکھنا مار نہ دینا۔ دوپہر کو میں ملٹری کے ہمراہ آ کر ان سب کو لے جاؤں گا۔ آج میری دوستی کا حق ادا کر دو۔ اس نے تسلی دی۔ میں شریف پورہ پہنچا۔ کلام پاک کے نسخوں کو رکھا اور ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچا واقعہ بیان کیا تو ملٹری آفیسر نے اتنا کہا کہ شہر کے باہر کی ملٹری اندرون شہر کی ملٹری کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتی تاہم میں کوشش کروں گا۔ وہ میرے ہمراہ شہری فوج کے پاس آئے اور ان کے حوالے مجھے کر کے خود انتظار میں باہر رہے۔ میں جب مسجد میں گیا تو مائی اور بچوں وغیرہ کا پتہ نہ چلا۔ مسجد بالکل خالی تھی۔ میں نے سوچا اگر انہوں نے مذکوروں کو قتل کر دیا ہوتا تو خون کے دھبے ہی نظر آ جاتے بسیار تلاش کے باوجود وہ نہ مل سکے۔ میں سمندر سنگھ کے پاس تھانہ میں گیا تو اس نے بتایا کہ وہ ان کو کھانا کھانے کے بعد میرے گھر کی جمعدارنی مریم کے ہاں بنجیریت تمام چھوڑ آیا تھا۔ لہذا میں مریم جمعدارنی کے گھر گیا تو وہاں سب موجود تھے۔ جن کو بحفاظت شریف پورہ پہنچا دیا گیا۔

سیکشن کو بلایا۔ مجھے ان مسلمان جوانوں کے ساتھ ٹرک پر بٹھایا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے شریف پورہ پہنچے۔ ریس نے مرہٹہ انفینٹری کو کمپ سے ہٹا دیا اور کمپ کی حفاظت کے لئے بلوچ رجمنٹ کو مقرر کر دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے باقاعدہ مورچوں میں مارٹر اور مشین گنیں نصب کر دیں۔ یہ کافروں کے لئے کھلا چیلنج اور مسلمانوں کی لٹاکار تھی۔ مرہٹوں اور پٹیلہ کے سکھوں کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ بلوچ رجمنٹ نے دو لاکھ مہاجرین کو قتل عام سے صاف بچا لیا۔ اس روز رمضان المبارک کا ستائیسواں روزہ تھا۔

ایک روز بشیر بختیار، چند نوجوان مسلمان اور میں کمپ کے دروازے پر کھڑے تھے کہ ہمیں ذرا دور دروازہ میان سنگھ سے ایک تانگہ ٹکٹا نظر آیا۔ تانگے میں چند ایک عورتیں سوار تھیں۔ انہیں برج نہنگ سنگھ سے گزرنا تھا۔ جب تانگہ وہاں پہنچا تو برج سے چند ایک مسلح سکھ نکلے۔ تانگے والے کو زخمی کیا اور عورتوں کو اٹھا کر برج کے اندر لے گئے۔ ہمارے پاس جو نوجوان مسلمان کھڑے تھے، وہ برداشت نہ کر سکے۔ ہم سب کا خون کھول اٹھا تھا۔ یہ نوجوان برج کی طرف دوڑ پڑے۔ فاصلہ تقریباً دو فرلانگ تھا۔ مسلمان نوجوان خالی ہاتھ تھے۔ وہ برج میں کود گئے تھے۔ ان کے بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ ہمیں برج کے اندر سے گولیوں اور چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ نصف گھنٹے بعد ہمارے تمام نوجوان تمام عورتوں کو ساتھ لئے زندہ و سلامت واپس آ گئے۔ وہ برج کے سارے کمینوں کو ختم کر آئے تھے۔

آخر ریل گاڑی کا انتظام ہو گیا۔ گاڑی آتی رہی اور مہاجرین کو بلوچ رجمنٹ کی حفاظت میں لے جانی رہی۔ یکم ستمبر 1947ء کے روز شریف پورہ کمپ خالی

تھا۔ میں ارین انفینٹری کا فوجی رہ چکا تھا۔ وردی میرے پاس تھی۔ میں نے وردی اپنی اور سائیکل پر گورا بارک کی طرف چل پڑا۔ وہاں باؤنڈری فورس کا انچارج ریس موجود تھا۔ فاصلہ چار میل تھا۔ راستے میں مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ بے بسی کا یہ عالم کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دل ہی دل میں فاتحہ و درود پڑھتا رہتا تھا۔ اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ تم یہاں تک زندہ کس طرح پہنچ گئے ہو؟ میں نے کہا کہ اللہ کا کرم ہے ورنہ بچ نکلنے کی کوئی صورت تو نہیں تھی۔

مجھے آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو روح کانپ اٹھتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ انسانوں کا یہ قتل عام امن کے پرچارک مہاتما گاندھی کے آہنسا کے پجاریوں اور بابا نانک کے بالکوں نے کیا تھا تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ہندو برصغیر میں مسلمانوں کا نام و نشان مٹانا چاہتے ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ ان حالات میں اور ہندو کی ذہنیت کے پیش نظر اعلان تاشقند کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ میں اب بھی یہ سوچا کرتا ہوں کہ باؤنڈری فورس میں بھی سابق صدر ایوب خان اعلیٰ افسر تھے جن کی موجودگی میں یہ کشت و خون ہوا اور اعلان تاشقند پر دستخط کرنے والے بھی ایوب خان تھے لیکن میں اپنی کوئی رائے نہیں دوں گا۔ میں سیاست دان نہیں ہوں، میری حیثیت مسلمانوں کے قتل عام کے معنی شاہد کی ہے۔

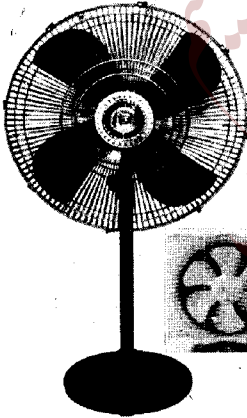
میں نے ریس سے درخواست کی کہ شریف پورہ کمپ سے مرہٹہ انفینٹری کو ہٹا دیا جائے اور اس کی جگہ بلوچ رجمنٹ کو لگایا جائے جو اسی علاقے میں موجود ہیں ریس نے مجھے کہا کہ اب اکیلے واپس نہ جانا ورنہ زندہ نہیں رہو گے۔ اس نے بلوچ رجمنٹ کی ایک

RTM: 71114

N.B.S

FANS

سب اچھا لگا مگر
بات ان سے بنی



U.I INDUSTRY

184-C, Small Industries State
Gujrat PAKISTAN.

PH: +92 53 3535901-2, 3523494-5

Fax: 053-3513307

E-mail: nbsfans@gmail.com

ہو گیا۔ میں اپنے کنبے کے ساتھ آخری گاڑی میں آیا تھا۔ میرے ساتھ بچے بھی تھے۔ جس خلوص اور شجاعت سے بلوچ رجمنٹ کے جوان ہمیں اپنی حفاظت میں لائے، میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آج بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو عقیدت کے آنسو پھلک پڑتے ہیں۔

جب ہماری گاڑی اٹاری سے آگے نکلی اور پاکستان کی سرحد کے قریب پہنچی تو بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے بڑے زور سے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اسی سرحد کی خاطر ہم نے اپنے بچے ذبح کر دائے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہم جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو رہے تھے۔

اٹھارہ سال بعد، ستمبر 1965ء میں، اسی بلوچ رجمنٹ کے یہی نعرے اسی مقام پر گرجے تھے۔ یہ بنالین لاہور کے دفاع میں بھینی کے مقام پر لڑی تھی۔ اس نے 8 ستمبر 1965ء کی صبح دشمن پر جوابی حملہ کر کے اسے سرحدوں سے گیارہ میل بھارت کے اندر تک دھکیل دیا تھا جہاں سے بلوچ رجمنٹ کے جانبازوں کو امرتسر شہر کے برج اور کلس نظر آرہے تھے۔ وہ پھر اس میدان میں جا پہنچے تھے جہاں انہوں نے مہاجرین کے قاتلوں کو ہندو اور سکھ درندوں سے بچایا اور بحفاظت پاکستان پہنچایا تھا۔ آج اس بنالین کے شہیدوں کا یادگاری مینار بی آر بی کے کنارے بھینی کے پل کے ساتھ کھڑا ہے جس پر شہیدوں کے ناموں کے نیچے یہ فقرہ لکھا ہے۔

عزیز ہم وطنو! آپ جب یہاں سے پلٹ کر جائیں تو پاکستانی بہن بھائیوں کو یہ بتانا نہ بھولنے گا کہ ہم نے اپنا آج آپ کے کل کے لئے قربان کر دیا ہے۔



پانی

پانی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ جن علاقوں میں پانی کی قلت ہے، پانی کی قدر کوئی ان سے پوچھے۔ اب تو کراچی جیسے بڑے شہر میں پانی کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ لاہور کے شہری گھروں کا ملا پانی پینے پر مجبور ہیں لیکن خادم اعلیٰ کو اور غنیمت ٹرین چلانے کا شوق چرایا ہے اس لئے پانی بجلی کا مسئلہ ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہمارے حکمران ٹھنڈے سٹکھروں میں رہتے ہیں اور فرانس سے درآمد کردہ منرل واٹر پیتے ہیں اور موج کرتے ہیں۔ یہ ایک تلخ شرمناک حقیقت ہے جسے افسانے کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔

☆ محمد الیاس

کیڑو نے جی بھر کے پانی پیا، ہاتھ، کہنیوں تک بازو، چہرہ، گھٹنوں تک ٹانگیں اور پاؤں مل کر دھوئے۔ دوپٹہ بھی دھویا اور پھر اس کا ایک پلو گھڑوں کے منہ پر پھیلا کر کنوڑے سے ان میں پانی بھرا۔ دونوں گھڑے پانی سے بھر چکی تو واپس اپنی ڈھوک روانہ ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر پانی پیا۔ وہ دریا پر آ کر اتنا زیادہ پانی اپنے معدے میں ذخیرہ کرنے کی کوشش کیا کرتی کہ گرمیوں کا موسم ہونے کے باوجود دیر تک پیاس نہ لگے۔ گیلا دوپٹہ اوڑھ کر سر پر ایک گھڑا بچھایا اور بڑی مہارت سے سر گردن اور اوپر کے دھڑکا توازن قائم رکھتے ہوئے اپنے جسم کو عمودی حالت میں سیدھا رکھے، گھٹنوں کو موڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ دوسرے گھڑے کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لئے جب وہ پورے قد سے کھڑی ہو گئی تو دوسرا گھڑا اس کے بائیں بغل میں سلیقے سے ٹک چکا تھا۔ وہ ڈھوک کی جانب جاتے ہوئے خیالوں میں کھو

نے کئی لوگوں سے سن رکھا تھا کہ دریا کے پار آبادیوں میں گھروں کے اندر لوہے کی کوئی چیز لگی ہوئی ہے جس کا سینگ مردوں تو شر شر پانی نکلنے لگتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اسے تو یہ بھی شک تھا کہ دریا کے پار اور اس ڈھوک کے عقب میں جو پہاڑ آسمان کو چھو رہے ہیں، ان کے پیچھے بھی کوئی دنیا آباد ہے۔ اتنے اونچے پہاڑوں کے پار کوئی کیسے گیا ہو گا؟ یقیناً یہ دھرتی کی آخری دیوار ہے اور اس سے آگے کچھ بھی نہ ہو گا۔

لوہے سے پانی نکالنے والی بات بھی اس کے دل کو نہیں لگتی تھی۔ پانی آسمان سے برے، دریا میں ہے یا زمین میں سے چشمہ، چو آبن کے نکلے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن لوہے کا سینگ مردوں نے سے پانی بننے لگے، یہ ممکن نہیں۔ پھر وہ سوچتی، شاید قیامت نزدیک ہے اس لئے ایسی آن ہونی باتیں ہونے لگی ہیں۔

غزل

محمد سعید رضا

وہ صحیفے جو میرے سینہ صد چاک میں ہیں
تذکرے اب کے وہی وسعتِ افلاک میں ہیں

غور سے پڑھ تو سہی فلسفہ ”مکن فیکون“
سارے اسرار و مفاہیم تیری خاک میں ہیں

طبع و حرص و ہوس کے وہ بہیمانہ ظلم
دل ناداں سنبھلنا کہ تیری تاک میں ہیں

لٹکری دونوں قبیلوں کے نہ تیغ ہوئے
حرف جو وجہ تنازع تھے ابھی ڈاک میں ہیں

اک نہ اک روز وہی حشر کا سماں ہوں گے
وہ ظالم جو میرے دیدہ نمناک میں ہیں

آگئی ورثہ اجداد سہی اہلِ سخن
کیا وہ منصب کے تقاضے تیرے اور اک میں ہیں

مگی۔ کاش! اس سال بارشیں پہلے کی طرح ہوئی ہوتیں تو
نئی (تالاب) نہ سوکھی۔ ڈھوک سے صرف ڈیڑھ کوس
دور پانی سے بھری نئی کے سکھ اسے یاد آنے لگے۔ اس
کے اپنے اور دوسری ڈھوکوں کے مال مویشی جی بھر کے
پانی پیتے تھے اور تمام عورتیں بھی ادھر سے پانی بھرتی
تھیں۔ جنگل اور پہاڑ کے جانور بھی وہاں سے ہی پانی
پیتے تھے۔ گیدڑ تو رات کو غول کے غول آیا کرتے تھے۔

یہاں آباد انسانوں نے ایک طرح سے سمجھوتہ کر
رکھا تھا۔ وہ خود بن (تالاب) کے ایک کنارے سے
پانی بھرتے اور پیتے تو مویشیوں کو دوسرے کنارے
سے پلاتے تھے۔ جس کنارے سے عورتیں پانی بھرتی
تھیں وہاں سے پانی تک رسائی نسبتاً آسان تھی، اس
لئے کئی مرتبہ کتے، گیدڑ یا دیگر جنگلی جانور بھی اسی رخ
سے نئی میں داخل ہو کر پانی پینے لگتے۔ جب ایسے
ہالوروں کو کسی ایک خاص مقام سے اپنی پیاس بجھاتے
تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جاتا تو پھر اس لمحے وہاں
سے چند گز دائیں یا بائیں ہٹ کر پانی بھرایا جاتا تھا۔
نئی کے مغربی کنارے پر جھاڑیوں اور درختوں کے
ٹٹ میں عورتیں ایک دوسرے کے تعاون سے غسل کر لیا
رتی تھیں۔ مرد اس جانب رخ نہیں کرتے تھے۔

عورتیں پانی بھرنے آتیں تو کئی کام یہاں پنپا کر
تھیں۔ ضروری کپڑے یا برتن دھولتیں۔ وہ کوشش
تھیں کہ جھنڈ کے پردے میں رہ کر استعمال کردہ پانی
بارہ تالاب میں شامل نہ ہو، تاہم اگر کبھی ایسا ہو بھی
تا تو بہ امر مجبوری اسے ذہنی طور پر قبول کر لیا جاتا، اس
بنان کے ساتھ کہ پینے کے لئے پانی یہاں سے ہیں
ہٹ کر بھرا جاتا ہے۔

بھیڑ بکریاں، گائے بیل یا گدھے گھوڑے تو اکثر
نئے پیٹ پانی سے بھر کر انہی قدموں واپس ہو لیتے
ن گرمیوں کے موسم میں خاص طور پر بھینس پھڑا ڈال

برتن دھو کر اس کا پانی دوسرے میں اغڑتی جاتی اس طرح سے پہلے مرطے پر لئے گئے تھوڑے سے پانی کے ساتھ بیشتر برتن دھل جاتے تو آخر میں انہیں صاف پانی سے کھال لیتی۔

پچھلے دنوں کیمزد کا بھانجا ملنے آ گیا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ جس قدر ہو سکا، اس کی خاطر تواضع کی لیکن جب دوسری مرتبہ بھانجے نے پانی کا کنورا بھر کر منہ سے لگایا اور کچھ مقدار پی کر باقی ماندہ زمین پر گرا دیا تو کیمزد کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے بھانجے کو یہ کہے بارہ نہ سکی کہ اسے پانی پینے کی تیز کرسی نہیں سکھائی۔

وہ اپنی انہی سوچوں میں گم سوکھے تالاب کے پاس پہنچ گئی تو اس کا دکھ سوایا ہو گیا۔ وہ خدا سے دعا مانگنے لگی کہ اتنی بارش ہو کہ جل ٹھل ہو جائے اور پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانی سے بنی کناروں تک بھر جائے اور وہ جو کئی کوس سے پانی بھر کر ہر روز لاتی ہے تو اس مسلسل عذاب سے اس کی جان چھوٹ جائے۔

وہ اپنی ڈھوک کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بدن کی ایک ایک بوٹی اور جوڑ بند کھٹے لگا تھا۔ اسی لمحے اس کا پاؤں رہٹ گیا اور وہ زمین پر آ رہی۔ سر پہ رکھا گھڑا زمین پر گرتے ہی کٹی کٹوے ہو گیا۔ بغل والا ٹوٹنے سے بچ گیا لیکن اس کے سٹھلنے سے پہلے وہ بھی پانی سے خالی ہو گیا۔ اب وہ پھر ڈھوک جائے اور کوئی برتن لے کر واپس دریا سے پانی بھر کر لائے۔ اس کے جسم پر کہیں کوئی چوٹ لگی تھی یا نہیں، اس کا تو اسے احساس نہ ہوا لیکن زمین پر سبے پانی کو دیکھ وہ بڑے دردناک انداز میں رونے لگی۔

”خدا یا! تو نے مجھے کوئی بڑا دکھ دینا ہی تھا تو سنگھ کو مار لیا ہوتا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں بیوا ہو جاتی لیکن پانی سے بھرا بھرایا میرا گھڑا نہ توڑا ہوتا۔“



دستیں۔ وہ پانی کو ایک نگاہ دیکھ لیتیں تو پینے کی بجائے نہانے کو ترجیح دیتیں۔ کئی بے صبری تو روکتے روکتے پانی میں گھس کر آدھا پونا غسل کر ہی جاتیں۔ دوسری علت جو شاید ان کی فطرت کا حصہ تھی، کوئی کم پریشان کن نہ تھی۔ جوں ہی ٹھنڈا پانی گھونٹ گھونٹ ان کے حلق سے نیچے اترنے لگتا تو دوسری طرف سے شر شر کر کے پیشاب کی صورت باہر آنے لگتا اور اس اثناء میں نوکرا بھر کو بر بھی تالاب میں ڈال چکی ہوتیں۔ یہی دو ہر اتہرا کام وہ بعض اوقات پانی میں تیرتے ہوئے ایک ساتھ شروع کر دیتیں تو ششکار نے یا ڈنڈا سوتا کرنے کے باوجود پوری طرح فراغت حاصل کر کے دم لیتیں۔ یہاں بھی یہ اطمینان دلوں کو طمانیت بخشا کہ پینے کے لئے پانی مخالف سمت سے بھرا جاتا ہے، ویسے بھی بھینسیں حلال جانور ہے اور بھو بھی کیا سکتا تھا۔

کیمزد دبی ہر روز پانی لے کر واپس گھر پہنچتی تو سنگھ مال موٹی باندھ چکا ہوتا۔ وہ اپنی بیوی کے سر اور بغل سے دونوں گھڑے باری باری سفیال کے احتیاط سے گھڑوئی پر رکھ دیتا۔ مرغیوں کے کانوں میں جیسے کوئی فرشتہ پھونک دیتا اور وہ اس انداز میں ان کی طرف لپک کر آتیں کہ دوڑتی تو وہ پنچوں کے بل لیکن کم سے کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے کرنے کے لئے پر بھی پھڑ پھڑاتی ہوئی آتیں۔ سنگھ تغاری ان کے آگے رکھتا۔ کنورے میں پانی بھر کے براہ راست تغاری میں اغڑ لینے کی بجائے چلو میں لے کر باری باری دونوں ہاتھ دھوتا اور پھر نیچے جھک کر دو چار چھینٹے چہرے پر مار لیتا۔ پانی اس کے ہاتھوں، چہرے اور تغاری سے ہوتا ہوا مرغیوں کی چونچوں تک پہنچ پاتا۔ سنگھ تھوڑا سا مزید پانی کنورے میں لیتا، خود پی کر کنورا بیوی کی طرف بڑھایا کرتا جو چند گھونٹ پانی اس میں بچا ہوتا وہ اپنے حلق سے نیچے اتار لیتی اور پھر برتن دھونے بیٹھ جاتی۔ وہ ایک

آگ اور غم کا سمندر



ان کھلم شہیدوں کی داستانِ الم جو آزادی کی جینٹ چڑھ گئے۔ آگ اور خون کا سمندر انہیں گل گیا، انہیں پاکستان دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

☆ رسالدار (ریٹائرڈ) گلزار احمد خان

پاکستان کے ایک سپاہی کی حیثیت سے آپ سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں کہ 1947ء میں تقسیم ہند اور پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے فوراً بعد کے چشم دید مگر انتہائی کرب انگیز حالات و واقعات من و عن آپ کے سامنے بیان کر سکوں۔ وطن عزیز کی آزادی کو 70 برس ہو چکے ہیں۔ ان 70 برسوں میں آپ نے پاکستان کی آزادی کے وقت کی لُخڑاں داستانیں اپنے بزرگوں سے سنی ہوں وہی عمر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کچھ آپ نے نہ پڑھا اور نہ سنا ہو گا جو کچھ ایک سپاہی کی حیثیت سے میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔

میں جنگ عظیم دوم کے اختتام سے چند ماہ پیشتر جون 1945ء میں انڈین آرمرڈ کور (بکتر بند فوج) میں شامل ہوا۔ ٹریننگ کے اختتام تک جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ٹریننگ کے بعد مجھے ایک سوار (سپاہی) کی حیثیت سے ایک ایسی بکتر بند رجمنٹ میں پوسٹ کیا گیا جو پوری انڈین آرمرڈ کور میں جنگی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی اور مختلف جنگوں میں بڑے

یو باہر (احسان اللہ باہر) سے کہا کہ آپ ٹھنڈہ لائن سے پاکستان نہ جائیں کیونکہ اس لائن پر جانے والی پیٹشل ملٹری ٹرینوں پر حملے ہو رہے ہیں اور ان حملہ آوروں میں انڈین ملٹری بھی شامل ہے۔ اس سے پیشتر بھی ایک فوجی پیٹشل ٹرین لاشوں سے اٹی ہوئی لاہور پہنچی ہے۔ اس اطلاع کے بعد کمانڈر نے حکم دیا کہ تمام جوان ہوشیار اور چوکس رہیں۔

ٹرین دہلی سے انبالہ کی طرف جا رہی تھی۔

ٹرین جب انبالہ پہنچی تو معلوم ہوا کہ امرتسر سے ٹرین کا صحیح سلامت کچ کر نکلتا معجزہ ہی ہو گا کیونکہ امرتسر ریلوے سٹیشن پر ہزاروں کی تعداد میں سکھ اس فوجی پیٹشل کا انتظار کر رہے ہیں۔ انبالہ سٹیشن پر کمانڈر کی طرف سے دوبارہ حکم ملا کہ اپنے اپنے ہتھیار لوڈ کر لو اور انتہائی مستعد ہو جاؤ اور جوں ہی ٹرین امرتسر کے نزدیک پہنچے سب جوان دروازوں اور کھڑکیوں سے لگ کر اس طرح کھڑے ہو جاؤ کہ ہر ہاتھ میں سے نکلنے والا شعلہ سکھوں کے لئے موت کا پیغام بن جائے۔ حملے کی جوابی کارروائی کے لئے میرے حکم کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

یہ پیٹشل ملٹری ٹرین ہر سٹیشن پر نہیں رکتی تھی۔ پہلے سے بتا دیا جاتا تھا کہ اب ٹرین کس سٹیشن پر رکے گی تاکہ عام مسافر گاڑیوں کے اوقات میں کمی بیشی نہ کرنی پڑے یا ٹرین کمانڈر کی مرضی پر روکی جاتی تھی چاہے وہ کوئی چھوٹا ہی سٹیشن کیوں نہ ہو۔ صبح روزہ رکھنے کی خاطر سحری سے پہلے کھانا پکانے کے لئے اور شام کو روزہ افطاری اور کھانا پکانے کے لئے کمانڈر وقت کے لحاظ سے کسی بھی سٹیشن پر ٹرین رکو اسکتا تھا۔

انبالہ سے جالندھر اور جالندھر سے امرتسر تک ریلوے لائن کے ہر دو جانب مسلمانوں کی بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سخت گرمی کی وجہ سے

معر کے سر کر چکی تھی۔ ان معرکوں کو سر کرنے پر اسے اتعداد جنگی اعزازات سے نوازا گیا تھا اور جنگ عظیم دوم میں بھی ”ملٹری کراس“ جیسا دوسرا بڑا برطانوی اعزاز حاصل کر چکی تھی اور اب یہ رجنٹ سکندر آباد چھاؤنی (حیدر آباد دکن) میں مقیم تھی۔ اس رجنٹ میں تین سہرے سکواڈرن تھے۔ پنجابی مسلم سکواڈرن، ڈوگرہ سکواڈرن اور سکھ سکواڈرن۔

اگست 1947ء کے اوائل میں ہمارے مسلم سکواڈرن اور ایک اور یونٹ کے مسلم سکواڈرن کو پاکستانی فوج کی حیثیت سے حیدر آباد دکن سے بذریعہ پیٹشل ملٹری ٹرین براستہ دہلی پاکستان کی چھاؤنی رسالپور پہنچنا تھا۔ چلنے سے پہلے ہم دونوں مسلم سکواڈرن سے ٹینک اور دیگر تمام ہتھیار لے کر انڈین کیولری کو دے دیے گئے۔ ہمارے پاس صرف برسل آرمز (ذاتی ہتھیار) جو زیادہ تر صرف پستولوں پر مشتمل تھے، رہ گئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوا ہی تھا کہ ہم دہلی سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ چند فیملیز بھی تھیں۔ ہم پاکستانی پرچم لہراتے اور خوشیوں کے گیت گاتے چند دنوں بعد دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ ہمارے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلمانوں کی خاصی تعداد پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو گئی۔ انہوں نے سمجھا کہ پاکستانی فوج ہمیں پاکستان لے جانے کے لئے آئی ہے مگر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو خود مسافر ہیں تو انہیں مایوسی ہوئی۔ تب انہوں نے بلند آواز سے کہا کہ خدا کے لئے نعرہ بازی بند کرو۔ آپ بھی پہلے والوں کی طرح نعرے لگا کر چلے جائیں گے اور ہمارا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ دہلی میں پہلی بار نعرہ بازی بند ہو گئی اور پاکستانی پرچم اندر کھینچ لئے گئے۔

مسلمانوں کے ایک وفد نے ٹرین کمانڈر میجر آئی

ڈوبی ہوئی نسوانی اور بچوں کی چیخوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ سب مسلمان قتل ہو رہے ہیں۔

ابھی سامنے ہی دیکھ رہے تھے کہ شیشن کے مغرب میں دور دوسرے لگاؤں میں چیخ و پکار سنائی دی۔ بچوں، عورتوں، مردوں کی چیخیں ہمارے کانوں سے نکلاں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاؤں شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا اور پھر بھاگتے ہوئے لوگوں پر یہ شیطان صفت بلوائی ٹوٹ پڑے۔ ہم لوگ شیشن پر کھڑے ہونقوں کی طرح کبھی سامنے اور کبھی پیچھے کی طرف دیکھتے تھے۔ ہمیں یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ کشت و خون میں ڈوبی ہوئی خوفناک چیخیں صرف مسلمانوں ہی کی تھیں۔ ہمارے اندر آتش انتقام بھڑک رہی تھی مگر کمانڈر کے حکم کے بغیر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اتنے میں چند مسلمان ادھر آ نکلے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ پاکستانی فوج ہے تو وہ ہمارے کمانڈر کے پاس گئے کہ ہم مسلمانوں کی مدد کریں۔

”کاش! میں ایسا کر سکتا۔“ میجر بابر نے جواب دیا۔ ”ہم خود مسافر ہیں، ابھی پاکستان کی سرزمین بھی نہیں دیکھی جس کی حفاظت ہمارے ذمے کی گئی ہے۔ اگر میرا ایک سپاہی بھی کام آ گیا تو میں قوم کو کیا جواب دوں گا اور پھر ہمارے ساتھ مستورات بھی ہیں۔ ان کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اگر میں مجبور نہ ہوتا تو آپ کو کبھی مایوس نہ کرتا۔“

”آپ ہمیں راتوں کا ایمونیشن ہی دے دیں۔“ وہاں کے مسلمانوں نے کہا۔

”ہمارے پاس کتنی کی چند راتگلیں ہیں۔“ میجر بابر نے کہا۔ ”اور ان کے لئے ایک ہی پٹی ایمونیشن کی ہے جس میں 1248 گولیاں ہیں یہ آپ لے جائیں۔“ اتنا کہنے کے بعد میجر بابر نے کوارٹر ماسٹر کو حکم دیا کہ تھری ٹاٹ تھری کی پٹی ان کے حوالے کر دو۔

تھفن اور بدبو پھیلی ہوئی تھی اور لاشیں بڑی طرح منخ ہو چکی تھیں۔

جائیدہ گزر چکا تھا اور اب امر تر لہجہ بہ لہجہ قریب آ رہا تھا۔ شیش ٹرین ایک سکھ بلوایوں سے چلاتا آ رہا تھا۔ پلیٹ فارم واقعی سکھ بلوایوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں کرپانیں، برچھیاں، نیزے اور بھالے ہوا میں لہرا رہے تھے اور ”ست سری اکال“ کے نعروں سے شیشن گونج رہا تھا۔ ٹرین رک چکی تھی، ہم ٹرین کے دو طرفہ دروازوں اور کھڑکیوں سے مستعد ہاتھوں میں بھرے ہوئے ریوالور تانے خاموش مگر خونخوار نظروں سے سکھ بلوایوں کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان مجاہدوں کی عقابلی نظروں کی چمک یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اگر کسی ذرندے نے ٹرین کی طرف آنے کی جرأت کی تو اس کے جسم میں لاقعدا و سوراخ کر دیئے جائیں گے۔ یقین کریں چند منٹوں میں امر تر کا پلیٹ فارم سونا سونا ہو چکا تھا اور سکھ بلوائی کھسک گئے تھے۔ اسی اثنا میں کمانڈر میجر بابر سکھ انجن ڈرائیور کی کھوپڑی پر اپنا ریوالور تانے اسے گاڑی چلانے کا حکم دے رہے تھے اور گاڑی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔

شام ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا اور حسب معمول گاڑی کو روک کر روزہ افطاری اور شام کا کھانا پکوانا تھا۔ چنانچہ اٹاری ریلوے شیشن پر گاڑی روک دی گئی اور انجن سے گرم پانی لے کر چائے بنائی گئی اور کھانا پکتنے لگا۔ لاگروں نے فوراً کھانا تیار کر دیا۔ روزہ افطار کیا گیا۔ کھانا کھایا گیا، کچھ جوانوں نے نماز ادا کی اور اندھیرا پھیل گیا۔ اچانک فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ شیشن کے سامنے کی طرف دور ایک گاؤں میں فائرنگ ہو رہی تھی اور ست سری اکال کے نعروں سنائی دے رہے تھے۔ پھر کرب میں

وہ مسلمان میجر کو دعائیں دیتے ایمونیشن لے کر چلے گئے۔

اب ٹرین پاکستان کے دل لاہور کی طرف بڑھ رہی تھی اور اٹاری پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے۔ جب لاہور کی حدود میں داخل ہوئے تو ایک وسیع میدان میں (جہاں آج کل گلبرگ کالونی ہے) مہاجرین کے کیمپ میں مہاجرین کا ایک جم غفیر نظر آ رہا تھا جو اپنا سب کچھ پاکستان پر نچھاور کر کے اب کھلے آسمان تلے پڑے تھے اور زندہ دلان لاہور نے مہاجر بھائیوں کے لئے اپنا تن من وھن وقف کر دیا تھا۔ لاہوریوں کی اس وقت کی قربانیاں کوئی پاکستانی فراموش نہیں کر سکتا۔ لاہور کی سماجی اور دینی تنظیموں کے رکن ان مہاجرین کے لئے خورد و نوش کا بندوبست کرنے کے لئے اور ضروریات زندگی کی باقی اشیاء اکٹھی کر کے گاڑیوں میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔

اس طرح پورے سات دنوں بعد ہماری سینیٹر ٹرین حیدر آباد دکن (انڈیا) سے رسالپور چھاؤنی (پاکستان) پہنچی اور پہنچتے ہی ہمیں حکم ملا کہ بھارت جانے والے ہندو سکھ مہاجرین کو بحفاظت مردان سے نوشہرہ تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ ہم مردان سے نوشہرہ تک ان مہاجرین کو بغیر کسی نقصان کے پہنچاتے رہے اور غیور اور بہادر پٹھانوں کی زد سے انہیں بچا کر یہ فرض پورا کیا۔

ایک ہفتہ بعد حکم ملا کہ ہمارا سکواڈرن، ٹینک اور دیگر اسلحہ حاصل کرنے کے لئے جالندھر چھاؤنی جائے گا اور انڈین ٹینک رسالے کے ایک ہندو راجپوت سکواڈرن سے ٹینک حاصل کر کے وطن واپس آئے گا۔ یہ وہ وقت تھا جب مشرقی پنجاب کے تمام اضلاع میں مسلم کشی کی آگ بھڑکی ہوئی تھی اور قتل و غارت گری کا

بازار گرم تھا۔ مسلمان امرا اپنے اثر و رسوخ اور وھن دولت کے بل پر پاکستان پہنچ گئے تھے مگر عام مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ درندوں اور بھیڑیوں کی طرح سکھ مسلمانوں کے لئے قہر چنگیزی بنے ہوئے تھے۔ ان ضلعوں میں امرتسر، فیروزپور، جالندھر، لدھیانہ، ہوشیارپور، گورداسپور اور انبالہ تک اور دوسری طرف رینک، حصار، کرنال، گڑ گاؤں، ریاست ناٹھ، پٹیالہ، الور اور یہ سلسلہ دہلی اور میرٹھ تک پھیلا ہوا تھا۔ نہتے مسلمان مرد، عورتیں، بچے ان وحشیوں کی کرپانوں، بھالوں اور برجمیوں سے کٹ رہے تھے۔ ہندو پولیس اور ہندو ملٹری ان بلوائیوں کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

مہاجرین کی جو بھی ریل گاڑی لاہور پہنچتی وہ لاٹوں سے بھری ہوئی ہوتی۔ ہندو ملٹری مہاجرین کو یقین دلاتی کہ وہ مسلمان ہیں اور سب مہاجرین کو بحفاظت پاکستان پہنچانے آئے ہیں تو سادہ لوح مہاجرین ان پر بھروسہ کر کے ساتھ ہو جاتے مگر جوں ہی قافلہ کسی ویران جگہ پر یا کسی دریا کے نزدیک پہنچتا انہیں منصوبے کے تحت سکھ درندوں کے حوالے کر دیا جاتا اور یہ سور سے یہ وحشی درندے ان پر قامت بن کر ٹوٹ پڑتے اور مسلمانوں کو کاٹ کر دریا میں پھینک دیتے یا لاٹوں کو وہیں ویرانے میں چھوڑ دیتے اور جوان لڑکیوں کو ساتھ لے جاتے اور یوں پورے قافلے میں کوئی شخص بھی زندہ نہ چھوڑتے۔

ان حالات میں ہمیں جالندھر پہنچنا تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ آگ کے اس دریا میں صرف پستولوں سے مسلح یہ دستہ جالندھر پہنچنے سے پہلے ہی دھر لیا جائے گا کیونکہ امرتسر شہر کے عین درمیان سے گزرتا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے مگر فوجی آرڈر میں پس و پیش کی گنجائش نہیں ہوتی، چاہے وہ سچ ہو یا غلط، اس سے

شاخص پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان گڑھوں میں انسانی لاشیں تیر رہی تھیں۔ درختوں کی شاخوں میں ننھے ننھے بچوں کی لاشیں پھنسی ہوئی تھیں۔ دریا کے بہاؤ کے ساتھ اور پل کے دائیں طرف حد نگاہ تک اسی طرح جگہ جگہ گڑھوں میں لاشیں اُٹی پڑی تھیں۔ درختوں میں پھنسی ہوئی لاشوں کو گلدھ نوچ رہے تھے۔ لاشوں کے ساتھ ہی ان بڑے جوہڑوں میں مہاجرین کا سامان تیر رہا تھا۔ کہیں کہیں سکھ منڈاسا باندھے گڑھوں اور جوہڑوں میں تیرتے ہوئے اس سامان کو اکٹھا کر رہے تھے۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی تنگ دھڑنگ اور بے گور و کفن لاشیں اس طرح سے منبھو چکی تھیں کہ ان کی شناخت نہ ہو سکتی تھی۔ تعفن اور بدبو کا یہ عالم تھا کہ دماغ پھٹے جا رہے تھے اور وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مشکل تھا۔ دور دور تک سوائے پانی اور انسانی اور حیوانی لاشوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ عام زمین جواب تک خشک نظر آ رہی تھی جگہ جگہ انسانی پنجر پڑے تھے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ انتہائی المناک حادثہ چند دن پیشتر رونما ہوا ہوگا۔

میجر بابر نے دور سے ایک سکھ کو پاس بلایا جو جوہڑ میں تیر کر سامان اکٹھا کر رہا تھا، سکھ پاس پہنچا تو میجر نے اس سے پوچھا کہ یہ لوگ کس طرح مرے ہیں؟

”جناب یہ سب پاکستان جانے والے مہاجرین تھے۔“ سکھ نے جواب دیا۔ ”دو لاکھ کا یہ قافلہ جب یہاں پہنچا تو شام ہو چلی تھی۔ انہوں نے رات یہاں کیپ کیا مگر داگورو کو منظور نہ تھا، آدھی رات کو دریائے بیاس میں زبردست سیلاب آیا اور قافلہ غرق ہو گیا۔ یہ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔“

سکھ اتنا کہہ کر ہلٹ گیا تھا اور کمانڈر سمیت ہماری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد کانوائے

زور دوانی ممکن نہیں اور پھر ہمیں ٹینک اور اسلحہ تو ہر حالت میں حاصل کرنا ہی تھا۔ یہ ٹینک اور ایمونیشن پاکستان کے حصے میں آیا تھا۔

دوسو نفری چند فوجی ٹرکوں پر سوار ہوئی۔ ساتھ ایک جیپ تھی جس پر لائٹ مشین گن فٹ تھی۔ رسالپور سے لاہور چھاؤنی پہنچے۔ دوسرے دن بحری کھا کر اور روزہ رکھ کر ہمارا یہ کارواں لاہور سے جالندھر کے لئے روانہ ہوا۔ سپاہیوں کے حوصلے بہت بلند تھے اور پھر ”پاکستانی سپاہی“ کے نئے لقب سے ایک نیا ولولہ اور نیا جوش ملا تھا۔ قیادت اگر دلیر ہو تو سپاہیوں کے حوصلے بلند یوں کو چھوٹے لگتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہماری قیادت ایک انتہائی دلیر شخص میجر احسان اللہ بابر کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے امرتسر پہنچنے سے پہلے کانوائے روک کر ہم سب کو اکٹھا کر کے ایسی ایمان افروز تقریر کی کہ ہر سپاہی کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ ہر سپاہی اسلام کا سپاہی بن گیا۔

امرتسر شہر میں پہنچے تو ہزاروں سکھ سوراؤں کے درمیان سے اللہ کے سپاہی انتہائی پُر وقار طریقے سے گزر رہے تھے۔ سکھ دکانوں اور مکانوں کی چھتوں پر بھی لاقعدا تھے اور نیچے بازار میں ہر طرف سکھ ہی سکھ تھے۔ شہر کے درمیان سے نکلتی ہوئی جی ٹی روڈ کے دونوں طرف بھی سینکڑوں کی تعداد میں سکھ موجود تھے مگر کسی بھی طرف سے کوئی ایسی ویسی طنز بھری آواز بھی نہ سنی۔ ایسے پتہ چل رہا تھا جیسے سکھوں جیسا امن پسند شہری کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

جوں ہی دریائے بیاس کے پل کو عبور کیا، حیرت سے ہماری آنکھیں پھیل گئیں اور کچھ وقت سکتہ کا سا عالم طاری رہا۔ جی ٹی روڈ کا نشان تک نہ تھا۔ سڑک کی جگہ کھڈ نظر آ رہے تھے اور ان گڑھوں میں پانی کھڑا تھا۔ درخت جڑوں سے اکھڑے پڑے تھے اور ان کی

کی میت پر سوگوار نظر آ رہا تھا۔

یہ گناہ مہاجرین اپنی جانوں کا نذرانہ اس طرح پیش کر گئے تھے کہ اس دولاکھ کے قافلے کے غرقاب ہونے کی کسی کو خبر تک نہ تھی۔ کتنا عجیب نذرانہ تھا یہ ایسے ملک کے لئے جس کو یہ دیکھ بھی نہ پائے تھے۔ یہ وطن تو نہ پہنچ سکے مگر وطن کے لئے بہت بڑی قربانی دے چکے تھے۔

اچانک گاڑی کو بریک لگی اور سوچوں اور خیالوں کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سامنے دریائے ستلج کا پل تھا اور اب کانوائے پل پر سے گزر رہا تھا۔ ہم نے ٹرکوں سے تریپال اتار رکھے تھے اور اپنے چاروں جانب دیکھ سکتے تھے اور بوقت ضرورت فائر وغیرہ کر سکتے تھے۔

ستلج کے پل سے نیچے دریا کی جانب دیکھا تو ایک مرتبہ پھر ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ دریا میں تین ایسے نالے تھے جن میں پانی بہہ رہا تھا، ان نالوں کے درمیان خشک ریت تھی۔ ریت کے اندر دھنسی ہوئی لاشیں پڑی دکھائی دے رہی تھیں اور یہ لاشیں بھی یقیناً مسلمانوں ہی کی تھیں مگر یہ لاشیں عام لاشوں سے مختلف تھیں۔ کسی کا صرف سر پڑا ہے کسی کا دھڑ بغیر سر کے ہے۔ کہیں آدھا بدن کہیں الگ الگ کو لہے تک دو ٹانگیں پڑی ہیں۔ کسی کا صرف ایک بازو نظر آ رہا ہے باقی حصہ ریت میں گم ہے۔ کسی عورت کے نازک اعضاء کٹے ہوئے ہیں۔ کسی بچے کی پوری لاش ریت کے اوپر پڑی ہے اور اسی طرح دریا کے بہاؤ کی طرف دور دور تک ریت میں پڑی لاشیں اور ان کے بکھرے ہوئے اعضاء نظر آ رہے تھے۔ یقیناً تشدد کا شکار ہوئے تھے اور سکھوں نے ان مسلمانوں کو قتل کر کے دریا میں ڈال دیا ہوگا۔

یہ دل ہلا دینے والے حالات و واقعات تو انجمر صرف جی ٹی روڈ پر نحو سفر دیکھے تھے۔ دور دراز گاؤں اور

آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا مگر جگہ جگہ گہرے گڑھے تھے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرتے تو لاشیں اور بچر ہمارا راستہ روک لیتے۔ جگہ جگہ معصوم بچوں کے بچر پڑے دیکھ کر دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی جو لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ جب ہم نے آٹھ میل کا سفر طے کر لیا اور موت کی اس بھیانک وادی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے تو خیال آیا کہ اللہ اتنا بڑا امتحان؟ پہلے یہ اپنے گھر بار لٹا بیٹھے، اپنے پیاروں کو پاکستان کی بھیٹ چڑھایا، اپنی عزتیں لٹائیں اور پھر راستے کی کٹھن عزتیں طے کرتے جب یہاں پہنچے تو یہ سب سیلاب کی نذر ہو گئے۔ یہ اپنا پیارا وطن بھی نہ دیکھ سکے اور انتہائی گناہی کی موت مر گئے۔

ان مہاجرین نے پاکستان کے لئے بے پناہ قربانیاں دیں۔ لاکھوں کی تعداد میں بے گور و کفن لاشیں اس طرح جوہڑوں اور کھلے آسمان تلے تک دھڑمک پڑی تھیں کہ ان کا ستر ڈھا پنے والاں بھی کوئی نہیں۔ ان پر آنسو بہانے یا سینہ کو پی کرنے والا کوئی نہیں۔ ان چیختے چلاتے زخموں کو طبی امداد پہنچانے والا کوئی نہ تھا جو سسک سسک کر شاید دم توڑ گئے تھے۔ ان لاکھوں مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کی لاشوں کو جنگلی درندوں اور گدھوں کی خوراک بننے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کو کفن پہنانے اور دفنانے کے لئے کوئی رضا کار یا سماجی ادارہ نہ تھا۔ نہ ماں اپنے جگر گوشے کی لاش پر سینہ کو پی کر رہی تھی، نہ بیٹا اپنی ماں کی لاش پر چھائیں کھا رہا تھا، نہ بہن اپنے دیر کی میت پر بین کر رہی نظر آ رہی تھی، نہ بھائی اپنی ماں جانی کے لئے چیخ رہا تھا، نہ بیٹا اپنے باپ کی لاش پر آنسو بہا رہا تھا، نہ باپ اپنے بیٹے کی لاش پر تڑپتا نظر آ رہا تھا، نہ بیوی اپنے سر تاج کی لاش پر آہ و فغاں کر رہی تھی، نہ خاوند اپنی رفیقہ حیات کی لاش پر ماتم کناں تھا، نہ کوئی رشتہ دار ان

دہلی سے اس طرف ہندوستان میں کوئی اور ٹینک نہیں تھا۔ صرف ہمارے پاس ہی ٹینک تھے۔ چاہے لیتے دیتے وقت بھی راجپوتوں کا طرز عمل نہایت خشن کن تھا۔ انہوں نے اس عرصے میں اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ راجپوت واقعی ہندو ذرا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور جو اپنے وعدے ہر حال میں پاس کرتے ہیں۔

جاندھر پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد ہیڈ کوارٹر راولپنڈی سے ہمیں ایک نیا حکم ملا۔ ٹینکوں کا چارج لینے کے بعد وطن واپسی کے بجائے مہاجرین کے ان قافلوں کو جو پنجاب کے مختلف اضلاع میں کیمپوں میں پڑے ہوئے تھے، وطن پہنچانا ہمارا فرض تھا۔ جب تک تمام مہاجرین وطن نہیں پہنچ جاتے ہم واپس پاکستان نہیں سکتے۔ حکم میں یہ بھی تھا کہ ٹینکوں کو اشد ضرورت کے سوا بالکل استعمال نہ کیا جائے۔

اس حکم کے تحت ہم جاندھر کے گرد و نواح میں مہاجرین کے کیمپوں سے مہاجرین کو قافلے کی شکل میں لے کر چلے۔ یہ قافلے تقریباً دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھے۔ ان میں ضعیف، جوان، مرد، عورتیں اور بچے شامل ہوتے تھے۔ لوگ اپنے سروں پر مختلف قسم کا گھریلو سامان، پونلیاں اور گھڑیاں اٹھائے پیدل چل رہے ہوتے۔ ان کے ساتھ چند بیل گاڑیاں ہوتیں جن پر مختلف قسم کا سامان لدا ہوتا۔ سب سے پیچھے چند فوجی ٹرک ہوتے تاکہ کوئی بیمار ہو یا بہت ہی ضعیف ہو تو اسے بٹھایا جاسکے۔ اس کے علاوہ قافلے والے جوں جوں پیدل سفر کرتے وہ اپنے سروں سے بھاری سامان آہستہ آہستہ پھینکنا شروع کر دیتے۔ ٹرک ڈرائیور ان کا یہ پھینکا ہوا سامان اٹھا کر ٹرک میں ڈال لیتے اور اگر ٹرکوں میں بیماری کی وجہ سے آدی زیادہ سوار ہو جائے تو سامان کو اکٹھا کر کے آگ لگا کر ضائع کر دیا کرتے

قصبوں میں جہاں سکھوں کی اکثریت تھی اور مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی، وہاں کیا کیا نہ قیامتیں ٹوٹی ہوں گی۔

شام کو جاندھر چھاؤنی پہنچے تو ہمارے میزبان ہندو راجپوتوں نے ہمارا شایان شان استقبال کیا، حالانکہ ان حالات میں ہمیں ایسی کوئی توقع نہ تھی۔ فوری طور پر انہوں نے اپنے جوانوں کی پوری بارک خالی کرائی۔ چار پائیاں لگا دی گئیں۔ سامان خورد و نوش مہیا کیا گیا۔ بارک کے چاروں جانب حفاظتی کانٹے دار تاروں کی باڑ لگا دی گئی اور یہ سب کام انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے کئے۔ غرض انہوں نے ہمارے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو امن کے زمانے میں ایک فوجی دستہ کسی دوسرے مہمان فوجی دستے کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ ان کے کمانڈر نے ہم سب سے مسکراتے ہوئے کہا کہ میری التجا ہے کہ آپ کسی بھی صورت اس کانٹے دار تار سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اگر آپ تاروں سے باہر چلے گئے تو کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے اور ایسے حالات میں باہر کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا۔

میجر باہر نے ہم سب کو بارک کے اندر اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں کے حالات اس قدر خراب ہیں کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ بظاہر راجپوت سکواڈرن ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کر رہا ہے مگر دلوں کے بھید صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ رات بھر چوکس رہنا اور ہر وقت ریوالور لوڈ رکھنا۔ کھانا کھاتے وقت اور ہاتھ روم میں بھی ریوالور اپنے پاس رکھنا۔ یہ حکم ملتے ہی ہم سب اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ اپنے ہی لاکھڑیوں نے کھانا پکایا۔ کھانا کھا کر ہم چار پائیوں پر بظاہر لیٹ تو گئے مگر صبح تک آنکھیں کھلی رہیں اور ریوالور ہاتھ میں رہے۔ متواتر تین دنوں تک روزہ رکھے ہم نے ٹینکوں کا چارج لیا۔ کافی مقدار میں اسلحہ وغیرہ حاصل کیا۔ اب

کئی قیمتی اشیاء لے جاتے۔ قافلے والے پہلے ہی خوفزدہ تھے جس طرح بھیڑ یا ریوڑ سے بھیڑاٹھا کر لے جاتا ہے اسی طرح یہ سکھ بھیڑیے بھی انسانوں کے اس قافلے سے جو چیز دیکھتے اٹھا کر لے جاتے تھے۔ جب متاثرہ حصہ ٹینک والوں کے نزدیک پہنچتا تو یہ لوگ رو کر اپنی قیمتی اشیاء کا ذکر کرتے۔ ہمارا دل بہت کڑھتا۔ جب ہم وہاں تک پہنچتے تو سکھ دور نکل گئے ہوتے۔ قافلے کے ساتھ ہم ٹینک چلا نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ صرف جنگی ہتھیار ہے۔ اسے عام گاڑیوں کی طرح ہم استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ کل دو جیپیں تھیں۔ ایک کمانڈر باہر کے پاس جو قافلے کی راہنمائی کے لئے آگے ہوتی، دوسری جیپ اس سے بارہ میل پیچھے قافلے کے آخر میں آ رہی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈوگر کو من مانی کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد پہلی عید الفطر اسی طرح قافلے کے ساتھ گزاری اور جو تنخواہ ملی تھی وہ چار چار آٹھ آٹھ آنے کر کے ہم نے قافلے کے لوگوں میں بانٹ دی۔ اس طرح پہلا قافلہ فیروز پور کے راستے پاکستان پہنچا۔

اس قافلے کو منزل پر پہنچا کر ہم پھر جالندھر کی تحصیل جگراؤں کی طرف اپنی گاڑیوں میں واپس ہوئے۔ جگراؤں میں ہم نے کھلی جگہ دیکھ کر اپنا کیمپ لگایا۔ ٹینک گاڑیاں کھڑی کیں۔ شام ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے اپنے ٹینکوں کے سائڈ میں شیلٹر لگائے اور بستر بچھا کر بیٹھے ہی تھے کہ چند جوانوں نے مجھ سے کہا کہ ہمیں آج خبریں تو سنواؤ۔ ہمارے پاس ریڈیو وغیرہ نہ تھا البتہ جب وقت ملا ٹینک کے وائرلیس سیٹ آن کر لیتے اور ریڈیو مشین کو نیون کر کے خبریں سن لیتے۔ میں نے ٹینک کے وائرلیس سیٹ پر خبریں لگا کر ہیڈ فون نیچے لٹکا دیا تاکہ سب آدمی خبریں سن سکیں اور پھر ہم

تاکہ یہ سامان غیر مسلموں کے تصرف میں نہ جائے۔ دو لاکھ کا یہ قافلہ اس طرح سے چلتا تھا کہ ہر روز بارہ میل کا سفر طے کر کے پڑاؤ کرتا تھا۔ پھر دوسرے دن بارہ میل سفر کرنے پر پڑاؤ کرتے۔ پڑاؤ تقریباً چار مربع میل پر پھیلا ہوتا تھا۔ اس دو لاکھ کے قافلے کا ایک سر بارہ میل سفر طے کر لیتا جب کہ اس کا آخری سر ایکسپ میں ہوتا۔ جی ٹی روڈ انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔

انڈین گورنمنٹ کی طرف سے قافلے کی حفاظت کے لئے ایک ڈوگر کہنی ہمارے ماتحت تھی جو بارہ میل تک قافلے کے دونوں طرف ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ اس کا ہر سپاہی ایک سوگڑ کے قافلے پر مسلح ساتھ پیدل چلتا تاکہ قافلے کی بارہ میل لمبائی میں کہیں بھی بیرونی حملہ آور نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ٹینک تھے۔ ہر دو میل کے فاصلے پر ایک ٹینک کھڑا رہتا جس کا وائرلیس سیٹ ہر وقت آن رہتا اور قافلے کے پیچھے ہماری ایک مشین گن جیپ ہوتی جو کمانڈر کو وائرلیس پر رپورٹ دیتی کہ اب پچھلا حصہ فلاں سبک میل تک پہنچا ہے۔

جب قافلہ پڑاؤ میں بحفاظت پہنچ جاتا تو ڈوگر کہنی کی تمام نفیسی پڑاؤ والی جگہ سے چار پانچ میل پیچھے چلی جاتی تھی اور وہاں اپنا کیمپ کرتے تھے مگر ہمارا سکواڈرن اپنے تمام ٹینک پڑاؤ کے چاروں جانب کھڑے کرتا اور رات بھر کچھ سپاہی اپنی اپنی باری پر پہرہ دیتے۔

ڈوگر کہنی قافلے کی حفاظت پر مامور تھی مگر متعصب ڈوگرے مسلمانوں کے دشمن تھے، انہوں نے سکھوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ قافلے کو نقصان پہنچائیں۔ لہذا سکھ گھوڑوں پر سر پٹ آتے اور قافلے میں لوٹ مار مچا کر سر پٹ بھاگ جاتے۔ لوٹ مار میں

کرنے کی کوشش کی تو ان پر اس طرح سے گولیوں کا سپرے کرنا کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔
گنتر نے فوراً دونوں مشین گنوں کا رخ ادھر کر لیا جس طرف سکھ کھڑے تھے۔ سکھوں کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ نیزے، بھالے، برچھیاں زمین پر پھینک کر کھڑے ہو گئے۔ تمام سکھوں کی تلاشی لی گئی کہ شاید ان میں سے کسی کے پاس آتشیں اسلحہ ہو تو وہ لے لیا جائے مگر کسی سکھ کے پاس سے کوئی اسلحہ برآمد نہیں ہوا۔ تب ٹینک کمانڈر واپس ٹینک کی جانب چل پڑا۔ سکھوں نے انتہائی عاجزی سے واپس جانے کی اجازت مانگی۔ ”تمہیں ٹینک پر پہنچ کر اجازت دیتا ہوں۔“ ٹینک کمانڈر نے بے رحمی سے جواب دیا۔

ٹینک کمانڈر نے جب کیا۔ ابھی وہ ٹینک کے اندر نہیں گیا تھا کہ ایک گولی چلی اور ٹینک کمانڈر کی دائیں ران میں سے گزر گئی۔ یہ گولی بلاشبہ کما کے کھیت سے چلی تھی جو ٹینک کے دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر تھا۔ سکھ ٹینک کے سامنے کی طرف تھے۔ زخمی ہوتے ہی دفعتاً محمد حسین گر جا۔ ”گنتر فار!“ گنتر نے مشین گن کا مٹن دبا دیا۔ ایک منٹ میں چھ سو راؤنڈ فار کرنے والی مشین گن نے سکھوں پر گولیوں کا سپرے کرنا شروع کر دیا اور ایک منٹ سے پہلے ساٹھ ستر سکھ جہنم داخل ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔

فارنگ کے فوراً بعد ٹینک کے پانچوں ممبروں نے ٹینک میں رکھا ہوا فرسٹ ایڈ بکس نکالا اور ٹینک کمانڈر کو فوری طبی امداد دی۔ اس واقعہ کی اطلاع وائرلیس پر میجر باہر کو دی گئی۔ وہ فوراً اپنی جیب میں جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ ٹینک کمانڈر نے تفصیل سے میجر کو سب کچھ بتایا۔ میجر باہر نے کہا کہ یہ فارنگ سکھوں کی طرف سے نہیں بلکہ یہ ڈوگرہ کمپنی کی شرارت ہے۔

خاموشی سے خبریں سننے لگے۔ خبروں کے اس لیٹن میں یہ خبر سنی کہ نوے فیصد مسلم آبادی والی ریاست جوں و کشمیر کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہونے والا تھا کہ کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجا ہری سنگھ نے ریاست کا الحاق پاکستان کے بجائے ہندوستان سے کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

اس ریاست کے اس طرح سے اچانک ہاتھ سے نکل جانے پر ہم تھلا کر رہ گئے۔ اس خبر سے اس قدر دکھ پہنچا کہ کسی شخص نے شام کا کھانا نہ کھایا۔ ساری رات جیسے انگاروں میں گزاری ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ سو سکا۔ لفظ ڈوگرہ سے ہمیں شدید نفرت ہو گئی۔

ڈوگرہ کمپنی کی غدار یوں نے پہلے ہی ہمارے اندر نفرت کی چنگاریاں سلگا رکھی تھیں اور اب رہی سہی کسر ڈوگرہ مہاراجا ہری سنگھ نے پوری کر دی۔ یوں ڈوگرہوں کے خلاف ہمارے اندر ایک انتقامی جذبے نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ اس وقت کمانڈر سے کے کراؤ آخری سہاوی تک کے یہی جذبات تھے اور سب موقع کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک دن آرام کرنے کے بعد ہم نے جانندھر کی تحصیل جگراؤں کے مہاجر کمپ سے مہاجروں کو اٹھایا۔ حسب معمول ڈوگرہ کمپنی قافلے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ قافلے کا تقریباً آدھا حصہ کمپ سے نکل چکا تھا کہ اچانک سکھ جو ساٹھ ستر کی تعداد میں تھے کمپ میں لوٹ مار کی غرض سے پہنچ گئے۔ نئی پالیسی کے تحت اس مرتبہ کمپ میں ایک ٹینک کھلا رکھا گیا تھا۔ ٹینک کمانڈر دفعتاً محمد حسین نے سکھوں کو لالکارا۔ تب سکھوں کی نظر ٹینک پر پڑی اور وہ جہاں تک پہنچے تھے وہیں رک گئے۔ ٹینک کمانڈر ٹینک سے کود کر نیچے اترا اور سکھوں کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ ”گنتر (تو جی) ان سکھوں کو مشین گن کی زد میں رکھو۔ انہوں نے بھاگنے یا حملہ

قافلے کے آخر پر پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور کمانڈر کو نیل (ذم) کی لوکیشن بتائی آ رہی تھی۔

جگراؤں چوک سے یہ کوئی دو میل ابھی جالندھر روڈ پر ہی تھے کہ ڈوگرہ کہنی کا ایک حوالدار اور ایک سپاہی ایک مسلمان لڑکی کو قافلے سے باہر کمانڈوں کی طرف بھیج کر لے جانے لگے تو ایک جوان آدمی لڑکی کا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ یہ میری بیوی ہے اور میں بھی فوجی ہوں، اس لئے میری اور آپ کی عزت سنبھالی ہے مگر ڈوگرے پر شیطانیت سوار تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا، ڈوگرہوں نے رانفل کی گولی مذکورہ جوان کے سینے میں مار دی اور وہ خون میں لت پت تڑپتا دم توڑ گیا۔

گولی چلنے کی آواز قافلے کے آخر پر آنے والے جیپ کمانڈر نے سنی تو اس نے ڈرائیور کو تیزی سے جیپ آگے بڑھانے کو کہا اور خود چاروں جانب دیکھتے ہوئے معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ گولی کس نے اور کہاں چلائی ہے۔ دونوں ڈوگرے لڑکی کے خاندان کو گولی مارنے کے بعد اس کو بھیج کر کمانڈ کی فصل کے قریب لے گئے مگر اس لڑکی کی جگر دوز چنچوں نے جیپ والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ڈوگرہوں نے جب جیپ دیکھی تو وہ لڑکی کو وہیں چھوڑ کمانڈ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیپ سے مح کمانڈر تین افراد اتر کر سڑک کے دوسرے کنارے تک گئے۔ کمانڈر نے چیٹی لڑکی کے سر پر دوپٹہ ڈالا اور باقی دو جوانوں نے کمانڈ میں گھس کر ڈوگرہوں کا پیچھا کیا۔ حوالدار تو نہ ملا مگر ڈوگرے سپاہی کو پکڑ لیا۔ جیپ کمانڈر نے مسلمان نو جوان کی لاش دیکھی تو اس نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ اس ڈوگرے کو اس قدر گولیاں مارو کہ اس کا چہرہ شناخت کے قابل نہ رہے گولیوں کے برست سے اس کا دماغ پھٹ کر باہر آ رہا اور چہرہ اس

گولی کمانڈ میں چھپ کر چلائی گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد انڈین آرمی کے ایک بریگیڈیئر نے موقع دیکھا، اس نے اصرار کیا کہ ٹینک کمانڈر کو جالندھر یا جگراؤں پھاؤنی کے ملٹری ہسپتال میں داخل کر دیا جائے مگر میجر باہر نے کہا کہ نہیں میں اسے پاکستان کے کسی ہسپتال میں بھیجوں گا۔ چنانچہ ایک تیز رفتار گاڑی سے دفعہ دار محمد حسین کو پاکستان روانہ کر دیا گیا۔

چند دنوں بعد ہم ایک اور قافلے لے کر جا رہے تھے۔ جگراؤں کے چوک سے دائیں ہاتھ فیروز پور روڈ پر قافلہ رواں دواں تھا۔ جگراؤں چوک سے ایک سڑک انبالہ کی طرف جاتی تھی۔ اسی سڑک کا پچھلا حصہ جالندھر کی طرف دوسری سڑک کا ایک سرا تحصیل نکودر (جالندھر کی ہی تحصیل) اور اس کا پچھلا حصہ فیروز پور روڈ کہلاتا تھا۔ جگراؤں ہندوستان کی پھاؤنی بھی ہے۔

قافلے کا اگلا حصہ جگراؤں چوک سے فیروز پور روڈ پر چار میل ہی چلا تھا کہ انہوں نے کل بارہ میل فاصلہ طے کر لیا تھا جس کی وجہ سے حسب روایت وہاں کھلی سی جگہ دیکھ کر کمپ یا پڑاؤ کر لیا گیا۔ قافلے کا تین چوتھا ہی حصہ پڑاؤ میں پہنچ چکا تھا اور اس حصے کے ڈوگرہ سپاہی اپنے کمپ میں جا چکے تھے۔ قافلے کا بہت تھوڑا حصہ ابھی جالندھر روڈ سے آ رہا تھا۔ اس سڑک کے دونوں طرف کمانڈ کے لگاتار کھپتے تھے اور اس زرخیز علاقے میں کمانڈ کی فصل اتنی اونچی تھی کہ اس میں ٹینک چھپ سکتا تھا۔ قافلے کے اس آخری حصے کے ساتھ ابھی چند ڈوگرہ سپاہی چل رہے تھے، سائے لے رہے تھے جا رہے تھے، سب ٹینک اندھیرے سے پہلے ہی پڑاؤ کے چاروں طرف کھڑے کر دیئے گئے۔ کمانڈر سمیت سب لوگ اپنے اپنے ٹینکوں میں پٹرول ٹاپ اپ کر رہے تھے اور سوائے دائرئیں آپریٹر کے سب ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ صرف ایک دائرئیں جیپ

جیپ میں بیٹھ کر واپس کمپ کی طرف چلا گیا۔
جکڑاؤں چوک سے ایک میل دور پہنچ کر باہر نے
پورے ٹینک سکواڈرن کو وائرلیس پر حکم دیا کہ ٹینکوں میں
سوار ہو جاؤ اور حملے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میجر باہر نے
یہ حکم فوجی زبان میں دیا تھا۔

تمام کام اسی لمحے چھوڑ دینے لگے اور فوری طور
سب اپنے اپنے ٹینکوں پر سوار ہو گئے۔ مشین گنوں پر
ایمونیشن بھرے بیٹل چڑھا دیئے گئے۔ ٹینک سٹارٹ
کر دیئے گئے اور کئی ایک نے ٹینکوں پر سرچ لائٹ بھی
نٹ کر لیں۔ چند ہی منٹوں میں مکمل تیاری کر کے کمپ
سے باہر نکلنے لگے۔ ڈوگروں کے خلاف جولاوا پک رہا
تھا وہ پھٹ کر باہر آنے والا تھا۔ ہر جوان، سردار اور
افسر خوش محسوس کر رہا تھا۔ سڑک پر پہنچے تو رفتار بڑھا دی
گئی۔ اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا اور ٹینک دوڑ رہے تھے۔
ٹینک کی لائٹیں جان بوجھ کر نہ جلائی گئی تھیں کہ دشمن
سمت کا صحیح تعین نہ کر سکے۔

ڈوگرہ کبھی نے جب ٹینکوں کی آواز سنی تو وہ اپنا
سب مال و اسباب، اپنی گاڑیاں، خیمے اور راشن وغیرہ
چھوڑ کر بدحواسی کے عالم میں مع کمانڈر بھاگ کھڑے
ہوئے۔ ہماری ہیوی مشین گنوں سے نکلنے والی ہزاروں
گولیوں نے ان کے بھاگتے جسموں کے پرچے اڑا
دیئے۔ ان کا کمپ بھی آگ کے شعلوں کی نذر ہو چکا
تھا اور پٹرول کے جلنے سے دور تک علاقہ روشن ہو گیا۔

یہ واقعہ طول پکڑ گیا تھا۔ یہ پورے کا پورا تحریر
کرنے کے لئے بے شمار صفحات درکار ہوں گے۔ میں
وہ حالات سناتا چاہتا ہوں جن میں مہاجرین ہندوستان
سے پاکستان میں آئے تھے۔

پاکستان کے راستے میں جگہ جگہ انسانی پنجر پڑے
تھے۔ جو مہاجرین بیماری یا ضعیفی کی وجہ سے قافلے کا
ساتھ نہ دے سکتے تھے سڑک پر تڑپ تڑپ کر جان

نقد بگاڑ دیا گیا کہ بچانے کے قائل نہ رہا۔ جیپ
کمانڈر کی اب بھی تسلی نہ ہوئی تھی، اس نے کہا کہ اس
بدکردار کی لاش کو جیپ کے پیچھے رسے سے باندھ کر
ٹھہرتے کمانڈر میجر باہر تک لے چلو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا
گیا۔

ڈوگرہ حوالدار کماڈ کے اندر اندر اپنے کمپ میں جا
پہنچا۔ جکڑاؤں چوک پر جیپ آئی۔ جوہی جیپ کے
پیچھے اپنے سپاہی کی بگڑی ہوئی لاش دیکھی تو ڈوگروں کا
میجر مشتعل ہو کر کہنے لگا۔ ”تم لوگوں نے میرے جوان
کو قتل کیا ہے، تمہارا کورٹ مارشل ہوگا۔“

دفعدار جیپ کمانڈر نے جواب دیا کہ اس کو تو
اپنے کئے کی سزا ملنی ہے اور ابھی حوالدار باقی ہے۔ اس
کو اس جرم کی سزا ضرور ملے گی۔ میجر اس دفعدار پر
برس پڑا۔ اس نے کہا میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے
سپاہی کی لاش میرے حوالے کر دو۔

”میں پاکستان آری کا دفعدار ہوں۔“ ہمارے
دفعدار نے جواب دیا۔ ”میں صرف میجر باہر صاحب کا
حکم ماننے کا پابند ہوں اور ان کا حکم ہے کہ یہ لاش ہم
اس طرح سے واپس نہیں کریں گے۔“

اسی وقت دفعدار نے وائرلیس پر میجر باہر کو
اطلاع دی کہ ڈوگرہ میجر مجھ سے الجھ رہا ہے۔ باہر نے
جواب دیا تم قافلے کے ساتھ ساتھ چلتے رہو میں خود آ
رہا ہوں۔

میجر باہر کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ آج نارمل
حالت میں نہ تھا اس نے آتے ہی ڈوگرہ میجر کو بری
طرح جھڑپ دیا۔ دونوں کمانڈروں کی بات چیت نے
طول کھینچا اور معاملہ تکرار تک جا پہنچا۔ میجر باہر نے کہا
کہ تم فوری طور پر اس حوالدار کو میرے حوالے کر دو، مگر
ڈوگرہ میجر اس پر راضی نہ ہوا۔ تب باہر نے انتہائی غصے
کے عالم میں کہا کہ تب میں خود اسے تلاش کر لوں گا اور

نے میرے ابو میری امی کو قتل کیا اور میری بہن کو کھینچے ہوئے لے گئے تھے اور ہمارے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ پھر ساری رات بھاگتا رہا۔ صبح ہوئی تو پھر کہیں چھپ جانا۔ اسی طرح ایک ہفتے سے بھاگتے بھاگتے میں بھوسے کی کھولی تک پہنچا اور اس میں چھپ گیا۔

چند دنوں کے بعد وہ ہم سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ جدا ہونے کا نام نہیں لیتا تھا اور ہر ایک ٹینک کمانڈر اسے باری باری اپنے ٹینک پر بٹھاتے اور اپنے بچوں سے بڑھ کر اسے شفقت اور پیار سے نوازتے۔ نو ماہ میں ہم نے مختلف اضلاع سے قافلے نکالے اور سوائے ایک دو معمولی واقعات کے کبھی کوئی بڑا حادثہ نہ دیکھا تھا۔ دلیر قیادت کی وجہ سے ہم سب اس قدر متاثر ہوئے کہ اب ہم سپاہی لوگ بھی فرد واحد کی حیثیت سے کبھی کسی بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہ لاتے۔

رائف نے ازاں بعد 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ایک ٹینک کمانڈر کی حیثیت سے حصہ لیا۔ پھر 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں ایک ٹینک ٹروپ کی کمانڈ کرتے حصہ لیا۔ ان دونوں جنگوں میں حصہ لیتے ہوئے ہمیشہ پیش نظر مشرقی پنجاب کی بربریت رہتی تھی۔ اٹھائیس برس سروس کرنے کے بعد 1973ء میں سکواڈرن سینئر سردار کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ میں پنشن پر گھر آیا۔ میجر باہر ترقی کرتے کرتے بریگیڈیئر بن چکے تھے اور وہ بہت عرصہ پہلے آرمرڈ کور سینئر کے کمانڈنٹ رہ کر ریٹائر ہو گئے تھے۔ اللہ کرے وہ بقید حیات ہوں، وہ پشاور کے قریب حیر پانی کے رہنے والے تھے۔



دے دیتے تھے یا پھر ایسے نوزائیدہ اور نومولود بچوں کی لاشیں نظر آتیں یا ان کے معصوم پنجر نظر آتے جنہیں بائیں دوران سفر جنم دیتیں اور وزن اٹھا کر قافلے کے ساتھ چلنے کے قابل نہ ہوتیں۔ بچے کو سڑک یا جھاڑیوں میں پھینک دیتیں۔ ہم نے درجنوں بار اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے کہ قافلے میں عورت چلتے ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھی، بچہ جتا اور اسے وہیں پھینک کر قافلے کے ساتھ چلنے لگی۔

میجر باہر ایک دن کسی گاؤں سے ایک ایسے معلوم مسلمان بچے کو لایا جو بھوسے کے ڈھیر میں تین دن سے چھپا بیٹھا تھا بچہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ خوبصورت اور سٹڈل جسم کا بچہ زیادہ سے زیادہ آٹھ سال کا ہوگا۔ ہر جوان نے اسے پیار کیا اور پوچھا تمہارا نام کیا ہے اور تمہارے ماں باپ بہن بھائی کہاں ہیں تو بچہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ پیدائشی گونگا ہے۔ اس کے سامنے کھانا رکھا گیا تو اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ انتہائی خوفزدہ نظروں سے وہ ہر کسی کو دیکھتا تھا۔ ہم نے کمپ میں چھوڑنے کے بجائے اسے اپنے ساتھی رکھا مگر چوبیس گھنٹوں میں نہ تو اس نے کچھ کھلیا اور نہ بات کی۔ اچانک اس نے چیخ ماری اور کہا۔ ”وہ دیکھو، وہ سکھ اس طرف آرہے ہیں۔ وہ مجھے مار دیں گے۔ وہ مجھے مار دیں گے“ یہ کہتے کہتے وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ ہم سب وہاں اکٹھے ہو گئے اور اسے کہا کہ یہاں کوئی سکھ نہیں آ سکتا مگر وہ ہمارے ایک دائرہ والے جوان کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا، وہ دیکھو وہ مجھے مار دے گا۔

ہم نے فوری طور پر اس جوان کی طرف ویسے ہی لاٹھی چھما کر اسے گرا دیا اور اس کو ایک لاش کی طرح بچے کی نظروں سے اوجھل کر کے کہا کہ ہم نے سکھ کو مار دیا ہے تو وہ خوش ہو کر کہنے لگا کہ بالکل یہی تھا وہ جس

ایک خط ایک وضاحت

کیا آپ کسی عیسائی کو جو رسول اللہ کو گندی گالیاں دے رہا ہو یہ کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے اسے مذہبی آزادی حاصل ہے جو چاہے بکنا پھرے؟

☆ محمد افضل رحمانی

ہے کہ اعوان صاحب کو افسوس ہوا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن محترم اگر آپ تھوڑا سا غور فرمائیے تو آپ مرزائی امت کو فرقہ نہ کہتے بلکہ گروہ یا جماعت کہتے تو زیادہ بہتر تھا۔ کیوں کہ فرقے تو مسلمانوں میں ہیں جبکہ مرزائی امت کا فرہ ہے، اس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں البتہ وہ خود فرقوں میں بنی ہوئی ہے۔

محترم شاید اعوان صاحب مغربی پروجیکٹ سے متاثر ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ”آئین اور قانون کے مطابق ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہونا چاہئے“ بالکل یہی نظریہ فرانس اور یورپی ممالک کا ہے اور اسی نظریے کے تحت وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تنقید کرنا جائز سمجھتے ہیں اور اس کو وہ مذہبی آزادی کا نام دیتے ہیں۔ کیا اعوان صاحب! ایسی مذہبی آزادی کے قائل ہیں؟ اور اگر ان کا یہ نظریہ مان لیا جائے تو ابوجہل کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ رسول اللہ کو کہہ دیتا کہ آپ کو مذہبی آزادی میں خلل ہونے کا کوئی اختیار نہیں، آپ کا اور میرا معاملہ

مکرمی و محترمی جناب مدیر ”حکایت“ صاحب، سلام مسنون! خیریت موجود و خیریت مطلوب۔ جناب میں محض خوشنودی ایزدی اور مسلمانوں کی بہتری اور اصلاح کے لئے مرزا قادیانی کی کہانی اس کی اپنی زبانی آپ کے ہر دلعزیز پرچے میں لکھ رہا ہوں جس کو عوام الناس کے علاوہ پڑھے لکھے طبقے بلکہ علماء نے بھی بہت پسند کیا ہے۔ آپ کا ”اظہار خیال“ کالم بھی اس کا گواہ ہے۔ مجھے جو نوں کا لڑ آئیں اور تو اتر سے ابھی آ رہی ہیں ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قارئین اس سلسلہ کو کافی پسند کر رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض کرم فرما دور دراز کا سفر کر کے مجھے ملنے کے لئے تشریف لائے حالانکہ جس علاقے میں میری رہائش ہے وہ دشوار گزار اور بیک ورڈ علاقہ ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر شخص ہی آپ کے موقف کا موید ہو۔

چنانچہ آپ کے جولائی کے پرچے میں محترم محمد سعید اعوان صاحب نے انتہائی افسوس سے لکھا ہے کہ آپ نے ایک خاص فرقے کو ٹارگٹ کیا ہوا ہے۔ مجھے دکھ پہنچا

آپ کو رسول اللہؐ سے اتنا بھی تعلق نہیں۔ ان کی نبوت پر ایک شخص ڈاکہ ڈالتا ہے اور اگر کوئی اس شخص کے جھوٹوں اور قرادوں کا پردہ چاک کرتا ہے تو آپ اسے ایک فرقے کو ٹارگٹ کرنے کا طعنہ دے رہے ہیں حالانکہ میں نے مرزائیوں کے متعلقہ کسی اختلافی مسئلہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور صد افسوس یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں قادیانیوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ آپ کس آئین کی بات کرتے ہیں؟

خدارا! پہلے کسی نظریے یا موضوع کا مطالعہ کریں بعد میں رائے زنی کریں۔ مذہبی آزادی کا آپ غلط مطلب سمجھتے ہیں۔ مذہبی آزادی یہ نہیں کہ آپ معصوم ہستیوں کے کارٹون بنانا شروع کر دیں اور مذہبی رہنماؤں کو گالیاں دیں بلکہ مذہبی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب اپنے عقائد پر اور اپنے مذہب کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہو اور اسے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ یا دشواری نہ ہو۔ جیسے وطن عزیز میں عیسائی، ہندو، سکھ اور دوسری اقلیتیں بالکل آزاد ہیں اور اسی عالم یا مسلمان نے انہیں بھی روکا ہے نہ ان پر یہ دھونس بھائی ہے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جائیں۔

چودہ سو سال سے مسلمان مملکتوں میں اپنا مذہب انتہائی سکون اور مکمل مذہبی آزادی سے بس رہی ہیں اور یہ مذہبی آزادی ہے نہ کہ وہ جس کو آپ مذہبی آزادی سمجھ بیٹھے ہیں۔ بانی اگر کوئی مرزائی اپنا موقف پیش کرتا چاہے تو میرے خیال میں اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن میرا نہیں خیال کہ کوئی مرزائی یہ جرأت کر سکے گا کیونکہ مرزا کی تحریریں اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ ان کی موجودگی میں مرزا کی صفائی پیش کرنا خود امتق بننے کے مترادف ہے۔ ویسے کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔



اللہ کے سپرد ہے۔ کیا آپ کسی عیسائی کو جو رسول اللہؐ کو گندی گالیاں دے رہا ہو یہ کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں کہ ٹھیک ہے اسے مذہبی آزادی حاصل ہے جو چاہے کہتا پھرے؟ اسی ذہنیت نے تو 90 سال تک قادیانی مسئلہ لٹکائے رکھا۔

عام لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ مولویوں کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے اور قادیانی مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ ہیں اور مولوی بس شور مچاتے پھر رہے ہیں لیکن مولوی کی مومنانہ فراست نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ یہ امت میں ایک عظیم فتنہ برپا ہو گیا ہے اور اس کا سدباب ہونا چاہئے۔ پھر علماء نے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ قادیانیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا نہیں قتل کر دو بلکہ صرف ایک مطالبہ تھا کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دو لیکن ارباب اقتدار اس فتنے کو سمجھتے ہی نہ تھے، الٹا علماء کو جیلوں میں ڈالا اور ان پر مقدمات قائم کئے حتیٰ کہ ربوہ کشین کا واقعہ 1974ء میں پیش آیا تو مسلمان جوانوں کے ہاتھ میں پٹرول کی گیلن تھیں اور وہ قادیانیوں کے گھروں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ انہیں آگ لگا دیں۔

اس وقت بھی علماء نے یہی مطالبہ کیا کہ بجائے اس کے کہ قادیانیوں کا گھیراؤ، جاؤ کیا جائے انہیں امت سے الگ کر کے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے جس سے ان کی عزت، جان اور مال محفوظ ہو جائے گا۔ کیوں کہ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے باقاعدہ حقوق ہیں جن کو پورا کرنا مملکت اور عوام کا فرض بنتا ہے۔ چنانچہ اسمبلی میں بل پاس ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ملک میں امن آ گیا۔ مرزائیوں کے ساتھ اکا دکا جو ایک دو واقعات دہشت گردی کے ہوئے ہیں وہ کوئی اس میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ دہشت گردی تو پوری دنیا کو پلیٹ میں لے چکی ہے۔

اعوان صاحب! اگر آپ سنی مسلمان ہیں تو کیا

احساس کی منزل

”مجھے لگتا ہے میں سب لوگوں کے لئے تماشیا بن گیا ہوں لوگ مجھے خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ تمہاری اس عظیم قربانی کا سن کر میرے کان تھک گئے ہیں کہ تم نے ایک لپاچ کو سہلا دیا ہے۔“

☆ ڈاکٹر طاہرہ ممتاز کابلوی



کھلنے والا دروازہ زور سے کھلا۔ ایک لڑکا تیزی سے آگے آیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! پلیز جلدی چلیے!“ وہ اس کے پاس آ کر بولا۔ پرائیویٹ روم نمبر 3 میں..... وہ جلدی سے اس کے آگے ہو گیا۔ لڑکا ٹھنک آلود پا جامہ کرتے پہنے ہوئے تھا اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے سوتے ہوئے ایک دم اٹھ کر چلا آیا ہو۔ سبز جھان اتر کر وہ دونوں پرائیویٹ وارڈ کی طرف مڑ گئے۔ سبز جھانوں پر صرف چالیس واٹ کابل ب روشن تھا اور وارڈ میں بھی کوئی زیادہ روشنی نہ تھی۔ چاندنی برآمدے کی جالیوں سے چھن چھن کر اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”میں نے بہت تلاش کیا ڈاکٹر! مجھے پندرہ منٹ تک تو راستے ہی کا پتہ نہ چلا۔ شاف روم میں جا کر دیکھا وہاں کوئی سسٹر بھی نہیں ہے۔ پھر میں سبز جھان چڑھ کر جنرل وارڈ کی طرف آیا تو شکر ہے آپ مل گئیں۔“ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ رکاوڑ ڈاکٹر کو اندر جانے کا راستہ دیا۔

عائشہ آگے بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ ڈرپ کی سوئی پتھر گر گئی تھی اور تھیلی کی پشت پر سوجن نظر آ رہی تھی۔ گلو کوڑ رگ میں جانے کی بجائے کھال کے نیچے اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس نے سوئی نکالی اور اسے دوسری رگ میں لگا دیا۔ ”فکر کی بات نہیں سوجن آہستہ آہستہ خود ہی جذب ہو جائے گی۔“

”شکریہ ڈاکٹر!“ مریض ممنونیت سے بولا۔

عائشہ نے مریض کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ بھورے سے ٹھنکریا لے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے سے یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند میں ہو۔ وہ چارٹ اٹھا کر پڑھنے لگی۔ ”کرنل حسن علی، عمر 36 سال۔“ اس کے دل میں کرنل کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ کرنل کے چہرے پر عجیب سا وقار تھا۔ دیکھنے سے بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ شخص چالیس کے قریب ہو گا۔

پڑھتے پڑھتے اسے اوجھ آ گئی۔ اس کے سر کو جھٹکا لگا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سرجری کی موٹی کتاب اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ میز پر تین چار رجسٹر اور گلدان میں سوکھے پھول رکھے تھے۔ ڈاکٹر عائشہ کی نظریں وارڈ میں گھومنے لگیں۔ نیو یوں کی دودھیا روشنی میں بیمار چہرے زردی، مائل سفید نظر آ رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ سینڈز پر لٹکی گلو کوڑ ڈرپ ابھی آدمی باقی تھی۔ عائشہ اٹھی اور خراماں خراماں وارڈ سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔ یہاں بھی زندگی سے مجبور لوگ پڑے تھے۔ باہر لان میں سفید چاندنی نے چادر تان رکھی تھی۔ ہسپتال کی علیل فضا کی طرح ڈاکٹر عائشہ بھی ملول تھی۔

”ڈاکٹر!“ اسے ایک دھبی، مجبور سی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کے ساتھ والے بستر پر نو دس سال کا ایک بچہ لیٹا تھا۔ ”ڈاکٹر! میرے سر میں بہت درد ہے، نیند نہیں آ رہی۔“

عائشہ نے جھک کر اس کی پیشانی کو چھوا جو بخار سے تپ رہی تھی۔ اس نے بستر کی پائنتی کی طرف لگا ہوا چارٹ اٹھا کر پڑھا۔ رات تک تو بخار تامل تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کے دو بجے تھے۔ رات کی ڈیوٹی پر اس کی ساتھی ڈاکٹر نہ جانے کہاں تھیں۔ ایک نرس کرسی سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ ایک گولی لاکر بچے کو کھلائی اور اس کا سر دبانی لگی۔ اسے معلوم تھا یہ بچہ ایک ہفتہ پہلے وارڈ میں داخل ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے ماں باپ بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ ماموں نے اسے جنرل وارڈ میں داخل کرا کے پھر پلٹ کر اس کی خبر بھی نہیں لی تھی۔ تھوڑی دیر میں بچہ سو گیا۔ عائشہ اٹھی اور اس کی چادر ٹھیک کی۔

ابھی وہ پلٹی ہی تھی کہ برآمدے کا لمبے کارڈور میں

خیال تھا کہ زندگی سے سچا پیار ہسپتال میں پیدا ہوتا ہے۔ سب ڈاکٹر رات کی ڈیوٹی سے گھبراتے تھے مگر عائشہ اکثر رات کی ڈیوٹی پر جانے کی کوشش کرتی تھی۔ روبینہ کی جگہ بھی بعض اوقات وہی رات کو جاتی۔ روبینہ اسے منع کرتی تو وہ روبینہ کا مذاق اڑانے لگتی۔ ایک دن روبینہ نے بہت غصے سے آکر اسے کہہ دیا۔ ”تم تو اذیت پسند ہو، تمہیں خود کو اذیت دے کر لذت آتی ہے۔“

”اگر ہوں بھی تو صرف اپنے لئے۔“ عائشہ نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ”میں دوسروں کو تو اذیت نہیں دیتی۔“

”عاشی! گھر خط لکھ کر کبھی خیریت ہی معلوم کر لیا کرو۔“ روبینہ نے اسے بار بار کہا تھا۔

”میری طرف سے تم ہی لکھ دو۔ اگر جواب آ گیا تو تمہارا منہ میٹھا کر دوں گی۔“ وہ اداسی کو شونجی میں چھپاتے ہوئے جواب دیتی۔

لبے کا ریڈروم میں سے گزر کر وہ سرجیکل وارڈ میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ آواز آئی۔ ”ڈاکٹر صاحب!“ اس نے نیچے دیکھا۔ ایک بہت ہی پیاری سی بچی گلابی فراک اور سفید ٹائٹس پہنے پہلی سیڑھی پر کھڑی تھی۔ اس نے عائشہ کو ہاتھ کے اشارے سے نیچے آنے کو کہا۔ عائشہ نیچے اتر آئی۔ بچی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پرائیویٹ وارڈ کی طرف چل دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ روم نمبر تین کے سامنے کھڑی تھی۔ ”اندر چلئے نا!“ بچی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ آگے بڑھی۔ اندر کچھ اور لوگ بھی تھے۔ نرس اور گلاب کے پھولوں کی ملی جلی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ وہ جیسی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”بس، اب کیا کہا جاسکتا ہے؟“ کرنل نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ان کا بستر سرہانے کی

”کیا انہیں نیند کا انکشن لگایا گیا ہے؟“ عائشہ نے اس لڑکے سے پوچھا جو اسے بلانے گیا تھا۔

”جی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”انکشن تو نہیں، نیند کی دو گولیاں کھائی تھیں کیونکہ دو راتوں سے بھائی جان کو بے خوابی کی شکایت تھی۔“ پھر عائشہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کرنل ایک روز دوپہر کو ڈیوٹی سے واپس آئے تھے، آدھ گھنٹہ آرام کیا اور جب اٹھنے لگے تو اٹھا ہی نہیں سکی۔ زندگی کے ایسے لمحوں پر عائشہ کو بہت دکھ ہوا کرتا تھا۔ کرنل جیسا اچھا خاصا انسان ناگوں سے محذور ہو چکا تھا۔

جانے کے لئے وہ دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میری ڈیوٹی تو سرجیکل وارڈ میں ہے لیکن میری ضرورت ہو تو بلا لیجئے گا۔“

☆.....☆.....☆

عائشہ اپنے کمرے میں تھی۔ اس نے اٹھ کر وقت دیکھا کھڑی واپس رکھتے ہوئے اس کی نظر میز پر رکھے خط پر پڑی۔ اس نے جھپٹ کر خط اٹھا لیا۔ یہ اس کی ایک دوست کا تھا۔ خط دیکھ کر اسے جتنی خوشی ہوئی تھی، خط پڑھنے کے بعد وہ ختم ہو گئی۔ اسے خیال ہوا تھا کہ شاید گھر سے کسی نے بھول کے اسے یاد کر لیا ہے مگر کہاں، گھر والوں میں سے کسی کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ اس کی ساتھی ڈاکٹر روبینہ کے بہن بھائیوں کے بہت ہی پیارے پیارے اور امی ابا کے شفقت بھرے خط آتے تو اس وقت عائشہ اپنے آپ کو دنیا میں بالکل ہی اکیلا محسوس کرتی۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہائی کے احساس نے اسے بہت سنجیدہ کر دیا تھا مگر یہ اس کی دوستوں کو ہی معلوم تھا کہ وہ کس قدر زندہ دل لڑکی ہے۔ جب وہ خوش ہوتی تو بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگتی اور جب اداس ہوتی تو اتنی خاموش جیسے ابھی آٹو سچلک پڑیں گے۔ ہسپتال میں وہ بہت خوش رہتی تھی۔ اس کا

جلدی سے بولا۔ ”بیٹے وعدہ تو ہے چلو ابھی لے کر دیتے ہیں۔ چلو کامران! ڈیڑی کو خدا حافظ کہو۔“

”ہاں بیٹے! وادی اماں گھر پر آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ کرنل حسن علی بولے۔

عائشہ بڑی دلچسپی سے کھڑی بچوں کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ کھیلنا اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور پھر اتنے پیارے پیارے بچے، آنکھیں سیاہ کالی تھیں۔ کرنل ہی کی طرح کے گھونگرھیلے بال۔ ان کے سرخ و سفید رنگ دمک رہے تھے۔ عائشہ نے کرنل کا چارٹ دیکھا۔ ایک ہفتہ کے دوران معمولی سا افادہ بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر ”اچھا، خدا حافظ“ کہہ کر وہ بھی چلی آئی۔ آٹھ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے اور آٹھ بجے اس کی ڈیوٹی شروع ہوتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”عاشی پلیز! چپ ہو جاؤ۔“ روینہ عائشہ کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ وہ آدھ گھنٹے سے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھی کہہ سکیوں سے روئے چلی جا رہی تھی۔ روینہ کو تو ابھی رونے کی وجہ بھی معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ”عاشی! تمہیں میرا ذرا احساس نہیں ہے۔ اگر تم چپ نہ ہوئیں تو میں تم سے نہیں بولوں گی۔“ روینہ روہاسی ہو رہی تھی۔ عائشہ نے جل تھل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ عائشہ کی خوبصورت آنکھیں اور زیادہ خوبصورت لگ رہی تھیں۔ ”کیوں ان آنکھوں پر ظلم کرتی ہو؟ چلو جا کر منہ دھولو۔ اٹھو شاباش!“ روینہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

تھوڑی دیر بعد جب عائشہ کی طبیعت سنبھلی تو اس نے ایک خط روینہ کی طرف بڑھادیا۔ عائشہ کے ابو کا خط تھا کہ اہل کے لئے اس کے ماموں زاد عاصم محمود کا پیغام آیا ہے۔ لکھا تھا وہ جلدی گھر پہنچے۔

”اوہو، تو اس میں اس قدر ڈرامہ کرنے کی کیا

طرف سے اونچا تھا اور وہ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ”ڈاکٹر! ان سے ملنے یہ میری بیٹی ہے سیما اور وہ صاحبزادے ہیں کامران حسن۔“ انہوں نے گلنبا فریاد والی ہنسی اور ایک گول منوں سے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آداب!“ بچے نے آہستہ سے کہا۔ عائشہ کو اس پر بہت پیار آیا۔

”بھائی جان! آپ نے ہمیں تو گول ہی کر دیا۔“ وہاں بیٹھے ایک نوجوان نے کہا۔ ”ہم ہیں کیپٹن جاوید علی، اپنے پیارے پیارے بھتیجیوں کے انکل۔“

عائشہ مسکرائی۔ وہ بھی کرنل کے چھوٹے بھائی کیپٹن جاوید کی طرح نوجوان تھی مگر وہ بچے کو دیکھنے لگی۔ وہ رات والا لڑکا تھا مگر اس وقت وہ اس قدر سمارٹ لگ رہا تھا کہ وہ اسے پہچان ہی نہ سکی تھی۔ بات بنانے کو وہ بولی۔ ”کامران! آپ بھی سوچ میں ہی جانا پسند کریں گے؟“

”جی ہاں، میں بھی ابو کی طرح تمہنے لوں گا۔“ وہ بڑی شان سے بولا۔

”اور..... اور میں تو آپ کی طرح ڈاکٹر بنوں گی۔“ سیما جھٹ سے بولی۔ ”مجھے ڈاکٹر آپ کی بہت اچھی لگتی ہیں۔“

”اچھی چیزیں سب کو ہی اچھی لگتی ہیں۔“ عائشہ کو اپنے پیچھے کھڑے کیپٹن جاوید علی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

کرنل حسن علی اپنے بازو پھیلا کر بولے۔ ”ادھر آؤ بیٹے! ہم آپ کو ضرور ڈاکٹر بنائیں گے۔“ سیما اچھل کر ان کے بستر پر چڑھ گئی اور ان سے لپٹ گئی۔ ”ابو! انکل نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں چاکلیٹ اور ٹافیاں لا کر دیں گے اگر ہم ڈاکٹر آپ.....“ سیما کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی کیپٹن جاوید نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور

”ہاں روہی! میں اسے کہوں گی کہ وہ کسی اور لڑکی سے شادی کر لے اور اسے اپنے خیالات بھی بتا دوں گی تاکہ وہ مجھے غلط نہ سمجھے۔“

”تو یہ بات جناب کی عقل میں اس قدر رونے دھونے کے بعد کیوں آئی ہے؟“ روہینہ الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔

”بس یوں ہی۔“ عاشی مسکرا کر بولی۔ ”شاید رونے سے ذہن پر جمی ہوئی کائی دھل گئی ہے۔“

اس کے نام امی کا یہ پہلا خط تھا اور وہ بھی سرسری سا۔ اس کے احساسات کے آگینے جو پُور پُور ہو گئے تھے، اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے اس کی کوئی خاص بات بھی فضا نہیں تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں کسی کو بھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابا جان کو تو اپنی مصروفیات نے ہی فرصت نہ ملتی تھی کہ وہ بچوں کی طرف بھی کبھی توجہ دے سکتے۔ امی تھیں تو وہ بھی اسے عجیب سی شخصیت لگتیں۔ بچوں کو کسی بات سے نہ کوئی مطلع کرتا تھا نہ کچھ سمجھاتا تھا۔ ماں باپ دونوں عملاً بچوں سے بالکل لا تعلق تھے کبھی کبھی تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ کہیں امی کی زندگی بھی کوئی ٹریجڈی تو نہیں ہے۔ عاشی کے دو چھوٹے بھائی تھے۔ وہ دونوں بہت ہی تنگ مزاج تھے من مانی کرتے۔ رضوان انجینئرنگ کالج میں تھا اور شاید ایم اے کر رہا تھا۔ عاشی شروع ہی سے ہوسٹلوں میں رہی تھی۔ بھائی بھی ہوسٹلوں میں رہ رہے تھے۔ اس لئے وہ ان کی عادات سے بھی واقف نہیں تھی۔ وہ ان کو پیار سے کچھ کہتی یا ڈانٹ سے، ان پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ ان کے مستقبل کے بارے میں سوچتی تو کانپ جاتی تھی۔

”عاشی! تم نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں نکالے۔“ روہینہ نے ہاتھ روم سے نکلتے ہوئے پوچھا۔ عاشی چونک کر خیالوں کی دنیا سے نکل آئی اور اپنے

طرزِ زندگی؟“ روہینہ شوخی سے بولی۔ ”ابھی سے تمہارا ہمال ہے تو رخصتی کے وقت کیا ہوگا؟“

”روہی!“ عاشی آہستہ سے بولی۔ ”میں عاصم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیوں؟ کیا اس میں کوئی جسمانی یا مالی کمی ہے؟“ روہینہ حیرت سے بولی۔

”نہیں۔“ عائشہ نے جواب دیا۔ ”یہی تو مصیبت ہے کہ وہ اچھا بھلا انسان ہے۔ دولت اس کے پاؤں کی جوتی ہے۔ کاش! وہ بد صورت ہوتا۔“

”بھئی عاشی! سیدھی طرح بات بتاؤ۔“ روہینہ نے عاشی کا کندھا پکڑ کر تجھوڑا۔

”روہینہ! بات یہ ہے۔“ عاشی روہینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔ ”میں کسی صحیح سلامت آدمی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں روہی میں اس کی بیوی بننا چاہتی ہوں جس کو صحیح معنوں میں میری ضرورت ہو۔ عاصم امیر ہے، خوبصورت ہے، اس کو ایک نہیں ہزاروں لڑکیاں مل سکتی ہیں جو اس کی دولت سے اور اس سے پیار کر سکتی ہیں۔ میں اس کے ساتھ زندگی گزارنا پسند کروں گی جس کو اپنے لئے ایک ہمدرد اور غمگسار دوست کی ضرورت ہوگی۔ زندگی تو یوں بھی گزر رہی جاتی ہے، موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ کیوں نہ اس زندگی کا میں بہترین مصرف کروں۔“

روہینہ نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ”تو پھر کیا جواب دو گی امی کو؟“

”لکھوں گی کہ ابھی مجھے چھٹی نہیں مل سکتی اور عاصم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔“ عاشی بڑے اعتماد اور سادگی سے بولی۔

”عاشی! مجھے تو ساری زندگی تمہاری سمجھ نہ آئی۔ کس مزے سے کہہ رہی ہے کہ عاصم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔“

کپڑے نکال کر جلدی سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔

☆.....☆

روبینہ اور عائشہ امیر جنسی وارڈ کی طرف جا رہی تھیں۔ پرائیویٹ وارڈ کے برآمدے میں مڑتے ہی سامنے پہیوں والی کرسی پر کرنل حسن علی بیٹھے تھے۔ ان کے دونوں بچے دائیں بائیں تھے اور کیپٹن جاوید کرسی کو دھکیل رہے تھے۔

”ہیلو ڈاکٹر!“ کرنل حسن علی عائشہ سے مخاطب ہوئے۔

”کیسے ہیں آپ؟“ عائشہ نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ کرنل کی مسکراہٹ یاس میں ڈوبی ہوئی تھی اور آنکھوں میں تیرنی ناامیدی اور اداسی صاف عیاں تھی۔ عائشہ کا دل اس وقت نہ جانے کیا کیا چاہ رہا تھا۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ کرنل کو تسلی دے سکتی۔

”ڈاکٹر آپ! آپ ڈیڈی کو دیکھنے ہمارے گھر آئیں گی نا؟“ سیمانے چلتے چلتے عائشہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”جی ہاں۔“ عائشہ نے کہا۔ ”کیوں نہیں آؤں گی۔“

سب لوگ خاموشی سے چل رہے تھے۔ اتنی دیر میں وہ دھڑوان آگئی جس کے سامنے ان لوگوں کی گاڑی کھڑی تھی۔ سب لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تو سیمانے گاڑی سے سر نکال کر دوبارہ پوچھا۔ ”ڈاکٹر آپ! ہمارے ڈیڈی ٹھیک ہو جائیں گے نا؟“

عائشہ اپنی آنکھوں میں اچانک آنے والی نمی سے گھبرا گئی اور جلدی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

دونوں پھر امیر جنسی وارڈ کی طرف جا رہی تھیں۔ ”جسمیں یوں آنسو بہاتا اگر کوئی دیکھے تو بالکل ڈاکٹر نہ جانے۔“ روبینہ اس کی اداسی دور کرنے کی غرض

سے شونی سے بولی۔

”یوں ہی.....“ عائشہ نے مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”کبھی کبھی دل بھرتا ہے۔“

آج سرجن رحمان کا آپریشن ڈے تھا۔ عائشی بھی ان کے یونٹ میں کام کر رہی تھی۔ سرجن رحمان کی شخصیت بڑے رعب اور دبے والی تھی۔ ان کی کنپٹیوں پر سفید سفید بال اچھے لگتے تھے۔ آپریشن کے دوران وہ بہت کچھ پوچھا کرتے اور جس کو جواب نہ آتا اس کی شامت آ جالی۔ ذرا ذرا سی غلطی پر وہ طویل لیکچر جھاڑ دیا کرتے۔ عائشہ کو سرجن رحمان بہت پسند تھے۔ وہ ایک اتنے قابل اور ذمہ دار سرجن کی رہبری میں تھی، ورنہ اکثر سرجن ڈاکٹر رحمان سے بہت گھبراتے تھے۔ عائشہ کی خود اعتمادی نے ہی اسے دوسروں سے ممتاز کر رکھا تھا۔

سرجن رحمان کے آنے سے پہلے ہی اس نے اینڈکس کے دو آپریشن کر ڈالے۔ ہاؤس سرجن بشیر اور نصرت نے اس کی مدد کی۔ ہاؤس سرجن فاروق ابھی آیا ہی نہیں تھا۔ سرجن رحمان آئے تو انہوں نے ننانہ وارڈ کے بیڈ نمبر بارہ کی مرلیضہ کو لٹانے کا حکم دیا۔ یہ ایک بڑا آپریشن تھا۔ شاید دو گھنٹے لگ جاتے۔

”عائشہ! آپ کس چیز میں سپشلائز (Specialize) کریں گی؟“ آپریشن ٹیمیل پر جھکے جھکے دوہولے۔ آپریشن آخری مرحلے میں تھا۔ یہ ان کی عادت تھی کہ آپریشن کے دوران وہ دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔

”جی سر! میں بننا تو ہارٹ سپیشلسٹ چاہتی تھی مگر اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔“ عائشہ نے جواب دیا۔ ”میں نے آرڈی میں درخواست دی ہے۔ ہاؤس جاب ختم کرنے کے بعد میں آرڈی میں جانا چاہتی ہوں۔“

”واہ، واہ بڑا جذبہ پایا ہے!“ سرجن رحمان تعریفی انداز میں بولے۔ ”لوگ تو آرڈی سے بھاگتے ہیں کہ

پریکٹس کر کے زیادہ روپیہ کام کیں۔“
 ”سر! مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ عائشہ نے جواب دیا۔ ”ویسے بھی آری مجھے پسند ہے اگر میں لڑکا ہوتی تو کبھی ڈاکٹر نہ بنتی، فوج میں جاتی۔“

☆.....☆.....☆

”بیٹا!“ عائشہ نے روہینہ کو پکارا۔ روہینہ کپڑے استری کر رہی تھی اور عاشی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔
 ”کہو کیا بات ہے؟“ روہینہ نے استری کرتے کرتے سر اٹھا کر پوچھا۔
 ”کل عاصم آیا تھا۔“ عاشی دھیرے سے بولی۔
 ”پھر؟“ روہینہ نے جلدی سے کہا اور استری کا سوچ آف کر کے عاشی کے پاس آ بیٹھی۔
 ”پھر میں نے اسے سب کچھ کہہ دیا۔“ عائشہ نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔
 ”وہ کچھ بولا؟“ روہینہ نے پوچھا۔ عائشہ ہنس دی۔ ”ارے بھئی جلدی بتاؤ نا۔“ روہینہ بہت جیتاب ہو رہی تھی۔

”بیٹا! وہ بہت اچھا ہے، بہت خوبصورت ہے، جوان ہے، بانکا ہے۔“ عاشی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اور کیا کہے۔ وہ رک گئی پھر بولی۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ میں پاگل ہوں، دیوانی ہوں جو ایسی عجیب و غریب خواہش رکھتی ہوں۔“

”کوئی تو میرا ہم خیال نکلا۔“ روہینہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ عائشہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

”بیٹا!“ عائشہ نے روہینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”میری ایک بات مانو گی۔“

”کیا؟“ روہینہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”تم..... تم..... پہلے وعدہ کرو۔“ عائشہ لہجی انداز میں بولی۔
 ”بھئی، اتنا سسپنس کیوں پیدا کر رہی ہو؟ چلو

وعدہ رہا۔“ روہینہ نے کہا۔

”تم نا..... تم عاصم سے شادی کر لو۔“ عائشہ نے جھجک کر کہا۔

”کیا؟“ روہینہ حیرت سے بدک اٹھی۔

”ہاں بیٹا!“ عائشہ نے متانت سے کہا۔ ”زندگی کی تکمیل کے لئے ایک خوبصورت ساتھی کی تمنا ہوتی ہے نا تو تم دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہو۔ بیٹا! تم..... تم بہت خوبصورت ہو۔ سچ عاصم تمہیں پا کر ضرور خوش ہو گا۔“ عائشہ عجیب سے تاثر سے بولے جا رہی تھی۔ ”بیٹا! عاصم بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں، سمجھتی ہوں مگر میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ اسے دکھ ہو گا لیکن اگر اس کی بیوی کوئی بہت ہی پیاری سی لڑکی بنے تو..... روہینہ پلینز! میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ خالہ جان سے میں بات کروں گی۔ ہاں۔“ عائشہ روہینہ کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے بولی۔ ”کل عاصم پھر آئے گا، میں اسے تمہارے گھر لے کر آؤں گی۔“

روہینہ کے ابو جج تھے۔ رہتے تو وہ اسی شہر میں تھے لیکن روہینہ کو رات کی ڈیوٹی کی وجہ سے ہوسٹل میں رہنا پڑتا تھا۔ روہینہ سوچ رہی تھی کہ یہ پاگل سی لڑکی جو کہہ رہی ہے وہ کر کے رہے گی۔ روہینہ نے ٹالنے کے انداز سے کہا۔ ”اچھا چلو بی ججن! اب اٹھو۔“ روہینہ نے اٹھتے ہوئے عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”خدا خدا کر کے آج ہی موقع ملا ہے اور وہ بھی بس کچھ کا وقت ہوا ہی چاہتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

آج کیپٹن نوید کی دعوت دلیہ تھی۔ کلب میں انتظام کیا گیا تھا۔ عائشہ نے اب جو فوج کی کیپٹن ڈاکٹر تھی، ویسے میں جانے کا راہہ کر ہی لیا۔ کپڑے استری کرتے ہوئے اس نے سوچا بیٹا بھی ہوتی تو کتنا مزہ آتا

محسوس کر رہی تھی کہ جب سے ابو نے گھر میں دلچسپی لینی شروع کی تھی یوں لگتا تھا جیسے گھر کی ہر چیز بدل گئی ہو۔

عائشہ بہت محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہی تھی اور خیالات اس کے ذہن کو گھیرے ہوئے تھے۔ اچانک ایک موٹر پر سامنے سے ایک سرخ رنگ کی تیز رفتار گاڑی مڑی عائشہ اگر چونک کر گاڑی کو انتہائی بائیں جانب نہ لے جاتی تو ٹکرا ہو جاتی۔ عائشہ نے سر کو جھٹکا دے کر خیالات سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی اور گاڑی کو آگے بڑھانی لے گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ کلب میں تھی۔ اس نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کی اور لان کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر پورے لان کا جائزہ لیا، شاید کوئی شناسا صورت نظر آ جائے۔ اچانک اسے ڈاکٹر کرل ظفر نظر آئے۔ وہ ان کی طرف بڑھی۔

کچھ دیر بعد راحت ظفر اور بازاری ظفر کے ساتھ وہ اپنی پلیٹ تھامے ہال کے ایک کونے میں کھڑی تھی کہ ”ہیلو ڈاکٹر!“ کی آواز پر وہ چونک کر مڑی اس نے دیکھا کہ بہت ہی سمارٹ شخص زیر لب مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا ہے۔ کالے ڈنرسٹ میں اس کا لمبا قد اور بھی نمایاں لگ رہا تھا۔ ”ہیچنا آپ نے؟“ وہ بولکر اس کی مسکراہٹ اور زیادہ بکھرا آئی تھی۔

عائشہ حیرت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کیپٹن جاوید علی! ایک دفعہ آپ سے ملاقات ہوئی تھی جب.....“

”اچھا اچھا..... کرل حسن علی کے بھائی۔“ عائشہ نے کہا۔ ”کرل آج کل کہاں ہیں، کیسے ہیں وہ؟“

”ایک ٹانگ کچھ ٹھیک ہے۔“ کیپٹن جاوید نے ملول آواز میں جواب دیا۔ ”دوسری نہیں، بیساکھیوں کے سہارے تھوڑا بہت چل سکتے ہیں۔“

”اوہ!“ عائشہ بھی متاسف نظر آ رہی تھی۔ ”کیپٹن

مگر پینا اب پینا عاصم تھی اور عاصم کے ساتھ امریکہ گئی ہوئی تھی۔ عائشہ نے تیار ہونے کے بعد آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آئی۔

”ماں جی!“ اس نے بوڑھی نوکرانی کو آواز دی جو باورچی خانے میں تھیں۔

”بیٹا! کہیں جارہی ہو؟“ وہ نزدیک آ کر بولیں۔

”جی ماں جی، اس وقت سات بجے ہیں، میں نو بجے تک آ جاؤں گی۔“

عائشہ گاڑی چلاتے ہوئے اپنی امی اور ابو کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابو کو ایک دفعہ دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ ایک ماہ تک عائشہ کے پاس آ کر رہے تھے۔ عائشہ نے انہیں بہت بدلا ہوا پایا تھا۔ چھوٹا بھائی اب انجینئرنگ کالج میں تھا اور اس سے بڑا بھائی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ایم اے کرنے کے بعد باہر گیا ہوا تھا۔ امی ابو کا رد بار کی بنا پر کراچی میں ہی تھیں اور بوڑھی اماں کو انہوں نے عائشہ کے پاس بھیج دیا تھا۔ اماں کا ایک بیٹا بھی تھا، احمد دین جولان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ عائشہ نے امی ابو کو لکھا تھا کہ وہ احمد دین کی بیوی کو بھی لاہور بھیج دیں۔ عائشہ چھاؤنی کے اس خوبصورت چھوٹے سے گھر میں اکیلی رہتی تھی اس لئے اس کا دل چاہتا تھا کہ گھر میں بہت سے لوگ ہوں عاصم والی بات پر امی نے جب ناراضی کا اظہار کیا تو عائشہ کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ چلو امی نے کبھی تو اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ عائشہ کو یاد آیا کہ اس دن وہ کس قدر خوش محسوس کر رہی تھی۔ اس کے فوج میں چلے آنے پر جہاں سب رشتہ دار ناراض ہوئے تھے وہاں ابو نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور گاڑی تحفتاً اسے دی تھی۔ چھوٹے بھائی رضوان کو جب کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو وہ عائشہ کے پاس آیا تھا اور عائشہ نے اسی سے گاڑی چلائی سیکھی تھی۔ عائشہ

کیا میں ان سے مل سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں، وہ چھاؤنی میں ہی رہتے ہیں، طارق روڈ پر، میری پوسٹنگ پچھلے ہفتے ہی راولپنڈی سے یہاں ہوئی ہے۔“

عائشہ گھر آ کر بھی اس اتفاق کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے کرنل کے بارے میں بلاوجہ بہت سوچا تھا۔ ذکی انکس تو ویسے بھی بہت تھی مگر کرنل کے ایسے پر اس کو رونہ آتا تھا۔ برو بارے خاموش طبیعت کے کرنل کی شبیہ کبھی کبھی اس کے ذہن پر ابھر آتی تھی مگر وہ اسے جھٹک دیا کرتی تھی۔ اسے صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

عائشہ ابھی ابھی راولپنڈی ختم کر کے اپنے دفتر میں آئی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے لئے کیپٹن جاوید کی فون کال تھی۔ ”اوہ! آج تو مجھے کرنل حسن علی سے ملنے

کے لئے بھی جانا ہے۔“ اسے یاد آیا۔ دفتر کے ایک دو کام ختم کئے۔ دو بج چکے تھے۔ اس نے چابی لی اور گاڑی کی طرف چل دی۔ ہسپتال کی سیزھیان اترتے ہی اسے اپنے پیچھے کار کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نیلے رنگ کی ٹویوٹا سے کیپٹن جاوید اتر رہا تھا۔ فوجی وردی میں وہ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر!“ ہمیشہ کی طرح کیپٹن نے کہا اور اپنی ٹویوٹا اتار کر تھوڑا سا جھکا۔ عائشہ نے مسکراتے ہوئے ہیلو کہا۔ ”چلنے میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”لیکن میری گاڑی کون لے جائے گا؟“ عائشہ بولی۔

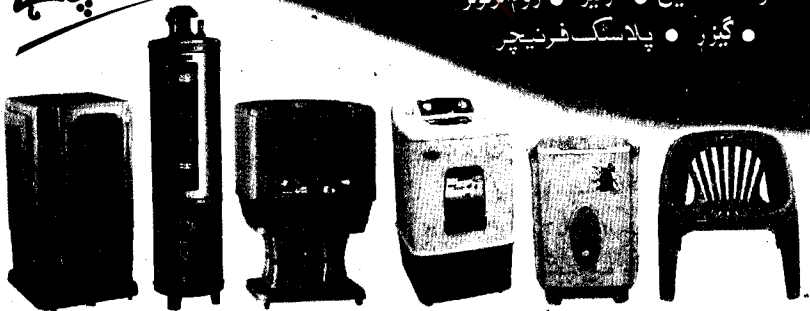
”تویوٹا کرتے ہیں، پہلے آپ کے گھر چلے ہیں۔ وہاں آپ کی گاڑی چھوڑ کر پھر ہمارے گھر۔“ وہ بولا۔ ”اسی بہانے سے آپ کا گھر بھی دیکھ لیں گے۔“ عائشہ فرنٹ سیٹ پر کیپٹن جاوید کے ساتھ بیٹھی



ہر دل چاہیے

ایمانیہ طر

• واشنگ مشین • درابیر • روم انزکولر • گیزر • پلاسٹک فریجیر



کلائمیکس آباد جی ٹی روڈ گوجرانوالہ فون: 055-3857636



والے حلیف میں رکھی تھیں۔ ”میری لائبریری میں دو سو کتابیں ہیں۔“ کامران بولا۔

”جب میں چھوٹی ہوتی تھی تا تو میری بھی بہت بڑی لائبریری تھی۔“ عائشہ نے انہیں بتایا۔

”آپ! آپ گڑیاں بھی کھیلی تھیں؟“ سیما نے اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، میرے پاس بہت گڑیاں تھیں۔ میں سب کے کپڑے خود سستہ تھی۔“ عائشہ نے اسے بتایا۔

”آپ میری گڑیاں کے لئے بھی اور کپڑے سیں گی؟“

”ہاں بہت سے۔“ عائشہ نے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

”آپلی چلیں یہ جہاز جوڑتے ہیں۔“ کامران اپنے کھلونوں کی الماری سے ایک ڈبہ نکالے ہوئے بولا۔ پھر وہ تینوں قالین پر بیٹھ گئے عائشہ نے دوپٹہ پلنگ پر پھینک دیا۔

ان تینوں نے مل کر کمرے میں بہت شور مچائے رکھا۔ کسی بات پر بے تحاشا ہنستے ہنستے عائشہ نے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں کیپٹن جاوید کھڑا تھا۔ کامران اور سیما فوراً عائشہ کے پیچھے چھپ گئے۔ عائشہ ہنسی روکنے کی کوشش میں اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے بال کچھ اوکھڑ گئے تھے۔

”یہ سب کچھ آپ کی موجودگی میں ہو رہا ہے۔“

کیپٹن جاوید کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ وہ بہت حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ عائشہ نے اپنی آنکھیں جھپکتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کئی قسم کے کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف میز پر گڑیاں کا گھر بنا ہوا تھا۔ کہانیوں کی کئی کتابیں الٹی سیدھی مٹھی پڑی تھیں۔ بستر پر سلوٹیں ہی سلوٹیں تھیں اور عائشہ کا دوپٹہ ایک

تھی۔ اس نے گلابی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلابی دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ اس نے بالوں کی دو چوٹیاں سی باندھ رکھی تھیں۔ کانوں میں ننھے ننھے گلابی ٹاپس تھے، ہاتھ کے پاس سے کچھ بال ہوا کے زور سے ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ کیپٹن جاوید نے دیکھا کالی سینڈل میں سے نظر آنے والے اس کے سفید پاؤں کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ پاؤں کے ناخنوں پر ہلکے سے گلابی شید کی کیوٹس لگی تھی۔

”کیپٹن جاوید۔“ عائشہ کی آواز پر کیپٹن جاوید کا انہماک ٹوٹا۔ کیپٹن نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیپٹن کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ”اف! اس کی آنکھیں کس قدر خوبصورت ہیں۔“ کیپٹن جاوید کا دل چاہا کہ اسے کہہ دے مگر اس نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ کیپٹن کو اس کی آواز پھر سنائی دی۔ ”کیپٹن! کنٹرل حسن علی کی مسز سے تو ہسپتال میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔“

”اوہ!“ کیپٹن جاوید نے آہ لے کر کہا۔ ”بھابی جان سیما کی پیدائش کے کچھ سال بعد وفات پا گئی تھیں۔ شاید سیما اس وقت چار سال کی ہوگی۔“ عائشہ نے ایک نظر کیپٹن کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ کیپٹن جاوید رہ نہ سکا۔ اس نے نکھلیوں سے اسے دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی اور پھر گھر پہنچنے تک کوئی بات نہ ہوئی۔

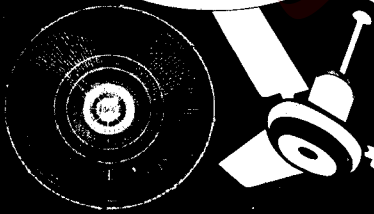
کنٹرل حسن علی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ سیما کامران، عائشہ اور جاوید نے اکٹھے کھانا کھایا۔ سیما اور کامران ڈاکٹر آپلی کو دیکھ کر بہت مسرور تھے۔ کنٹرل کا کمرہ ایک طرف تھا۔ بچوں اور جاوید کے کمرے دوسری طرف تھے۔ عائشہ بچوں کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں نے پہلے اسے اپنی بہت سی کہانیوں کی کتابیں دکھائیں جو ایک طرف دروازوں

پاکستان میں پنکھے
بنانے کے بانی



ESTD. 1936

ایس اے پنکھے



ایس اے - ایکٹر بکل انڈسٹریز - گجرات
053 - 3515327, 3535045, 3533478

طرف نیچے لٹک رہا تھا۔ عائشہ نے لپک کر دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈالا۔ ”ایسی کیا بات ہے؟ ہم تو کھیل رہے تھے۔ ہم سب کچھ ابھی ٹھیک کر لیں گے۔“ وہ کیپٹن کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”میںے صاحب! آپ کو سکول کا کام بھی تو کرنا ہے ابھی۔“ جاوید کامران کے سر کو ہلاتے ہوئے بولا۔
”وہ تو ہم کربھی چکے۔“ کامران اور سیمایوں اتر کر بولے جیسے بہت بڑا محرکہ مارا ہو۔

”آج آپ لوگوں نے ڈاکٹر آپلی سمیت دوپہر کو آرام نہیں کیا۔“ وہ پھر بولا۔
”کوئی بات نہیں چچو! ہم رات کو جلدی سو جائیں گے۔ ہم ٹیلیوژن نہیں دیکھیں گے۔“ سیمایا بڑے اطمینان سے بولی۔

”یا اللہ! یہ آج کیا کاپلٹ ہو گئی ہے۔“

جاوید ہاتھ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھ کر بولا۔ سیمایا جو چیزیں سمیٹ چکی تھی، واپس مڑ کر بولی۔ ”بس صاف ہو گیا ہے تاکرہ؟“

”اب آپ چائے کے لئے سبزہ زار میں تشریف لے آئیے۔“ جاوید بولا اور باہر چلا گیا۔ سیمایا اور کامران عائشہ کے ساتھ باہر لان میں چلے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ تینوں گارڈن چیز ز پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کامران بولا۔ ”ڈیڈی آرہے ہیں۔“
عائشہ نے گھوم کر دیکھا۔ کرل حسن علی آہستہ آہستہ پیہوں والی کرسی کا ہینڈل گھماتے آرہے تھے۔ وہ سفید کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے بھورے بال پیشانی پر جھکے ہوئے تھے۔ عائشہ کو کرل اتنے اچھے لگے کہ وہ ٹمٹکی باندھے انہیں دیکھے چلی گئی۔ کرل نے نظریں اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔

”ہیلو ڈاکٹر!“ انہوں نے قریب آ کر سنجیدگی سے

کہا۔

”ہیلو!“ عائشہ نے جواب دیا اور پوچھا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

کرتل نے ایک سنجیدہ نظر اس پر ڈالی مگر لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ تھی جیسے پوچھ رہے ہوں۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کیسا ہوں؟“ عائشہ نے دیکھا۔ سیما اور کامران سنجیدہ شکلیں بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ عائشہ نے چائے بنانی شروع کی۔ کینٹن جاوید نے ایک مونی سی کتاب لا کر کرتل حسن علی کو تھادی اور وہ کتاب کھول کر اس میں گم ہو گئے۔ عائشہ نے چائے بنا کر کینٹن کو دی اور پھر کرتل کی طرف پیالی بڑھا دی۔ انہوں نے ”شکریہ“ کہہ کر پیالی تھام لی۔

”ڈیڈی! ہم چچو کے ساتھ سیر گئے لئے جائیں؟“ سیما ڈیڈی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”ضرور بیٹے!“ کرتل نے پہلی سی سنجیدگی سے جواب دیا۔

جاوید اٹھ کر گاڑی کی چابی لانے اندر چلا گیا۔ عائشہ نے کرتل کی طرف دیکھا جن کی آنکھیں بند تھیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا رکھا تھا۔ عائشہ کا دل بات کرنے کو چاہا۔ ”کرتل صاحب!“ اس نے پکارا کرتل نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔ ”کیا آپ..... آپ بچوں کے ساتھ سیر کرنے نہیں جائیں گے؟“

”نہیں!“ کرتل نے جواب دیا اور اپنی کرسی کا رخ اندر کی طرف موڑ لیا۔

”آپی!“ سیما نے سرگوشی میں عائشہ سے کہا۔ کرتل لان سے باہر جا چکے تھے۔ ”آپی! ڈیڈی پہلے تو ہمیں بہت سیریں کرایا کرتے تھے۔ جب سے ہسپتال سے آئے ہیں ہمارے ساتھ کہیں نہیں جاتے۔“

”آپی! میرا بہت دل چاہتا ہے کہ ڈیڈی پہلے جیسے بن جائیں۔“ کامران حسرت سے بولا۔

عائشہ نے دیکھا کہ مالی بابا دھکا لگا کر کرسی کو ڈھلوان سے اوپر برآمدے میں لے جا رہا ہے۔ عائشہ افسردہ ہو گئی۔ تینوں خاموش بیٹھے تھے۔ جاوید کار کی چابیاں لے کر واپس آیا اور سب کو لے کر چل دیا۔ بچوں نے آپی سے پھر آنے کا وعدہ لے کر ہی اسے کار سے باہر قدم نکالنے دیئے۔ عائشہ جب گھر پہنچی تو چہنچ رہے تھے۔

عائشہ اکثر شام کو کرتل حسن علی کے ہاں چلی جاتی۔ کرتل یا تو سٹڈی میں ہوتے یا اپنے کمرے میں کینٹن جاوید نے بتایا تھا کہ وہ کسی سے بھی نہیں ملتے، حالانکہ پہلے وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ تو ہنس کھ اور طنسار ہوا کرتے تھے۔ حادثہ ہی کچھ ایسا پیش آیا تھا۔ پہلے مسز حسن علی سرطان سے وفات پا گئیں اور دو سال بعد ہی کرتل پر فوج کا حملہ ہو گیا۔ اسی دوران کرتل کی والدہ فوت ہو گئیں۔ ان پے در پے مصدموں نے کرتل کی ساری کائنات درہم برہم کر کے رکھ دی تھی۔ وہ بہت تنہائی پسند ہو چکے تھے۔ بہت کم بولتے تھے۔ عائشہ کرتل سے بہت متاثر تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کرتل سے ڈھیر ساری باتیں کرے، مسکرائے، ہنسنے اور کرتل کو تنہائی سے نکال کر دوبارہ نارمل زندگی کی طرف لے آئے۔

اس کی گاڑی کرتل حسن علی کی کٹھی میں داخل ہوئی۔ اس نے گاڑی بند کی اور عائشہ حسن کے کمرے کی طرف بڑھی۔ سر پہر کے تین بجے تھے، بچے سو رہے تھے۔ عائشہ ہسپتال سے آج دیر سے فارغ ہوئی اور سیدھی ادھر ہی چلی آئی تھی۔ خانساں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ کینٹن جاوید ابھی تک واپس نہیں آئے۔ اس کے قدم کرتل کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے دبے قدموں سے جا کر پردے ہٹا کر اندر جھانکا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ کمرہ بڑی نفاست سے سجایا ہوا تھا۔ ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل پڑی تھی۔ ساتھ ہی

تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ روم سے نکلی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ جاوید کامران کے پاس تھا، وہ ابھی تک وردی میں تھا۔

”ڈاکٹر! مجھے کرمل شفیق کے ساتھ بارڈر پر جانا ہے۔ کل صبح نو دس بجے تک واپسی ہوگی۔ اگر آپ ہمارے گھر میں ہی رہیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔“ وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے تھوڑی سی ٹانگیں پھیلانے کھڑا تھا۔ اس کی آواز کے اعتقاد کو دیکھ کر عائشہ حیران رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ”میں بھائی جان کے کمرے میں گیا تھا، وہ شاید سو رہے ہیں..... اچھا خدا حافظ!“ اس نے کامران کے سر پر سے اپنی ٹوپی اتارتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔

عائشہ نے سیما اور کامران کو رات کا کھانا کھلا کر سونے کے لئے بھیج دیا۔ خود وہ دبے پاؤں کرمل کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دوا کا وقت ہو رہا تھا، پہلے دو دفعہ خانہ سال دیکھ آیا تھا۔ کرمل سو رہے تھے۔ کمرے کے باہر وہ رکی، جھنجکی اور پھر اعتقاد سے اندر چلی گئی۔ کرمل کے سر ہانے لگی ٹیوب لائٹ روشن تھی اور کمرے میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کرمل نے نیم وا آنکھوں سے اسے آتے دیکھا۔ وہ آگے بڑھی۔ اس نے دو گولیاں لیں جو اس وقت دینی تھیں۔ گلاس میں پانی ڈالا اور بستر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کرمل نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر انہوں نے ایک کہنی پر دباؤ ڈال کر اٹھنے کی کوشش کی مگر نہ اٹھ سکے۔ عائشہ نے جلدی سے انہیں سہارا دے کر اٹھایا۔ پیچھے دو تکتے رکھ دیئے۔ دوا کھلانے کے بعد وہ بولی۔ ”کرمل صاحب! میں آپ سے کسی ہمدردی کے باعث آپ کو کمرے میں نظر نہیں آ رہی ہوں۔ کیٹین جاوید گھر پر نہیں ہیں۔“ اس کی آواز مدھم اور بغیر کسی تاثر کے تھی۔

کرمل غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

صورت میں ان کے سنبھل جانے کے امکانات بھی نظر آتے ہیں۔“ ڈاکٹر رحیم وثوق سے بولا۔ ڈاکٹر ظفر نے بھی تائید کی۔ جاوید کی خوشی اس کے چہرے سے نظر آ رہی تھی اور عائشہ سوچ رہی تھی کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آدھ گھنٹے بعد کرمل ہوش میں آچکے تھے۔ ڈاکٹر رحیم نے ان کے لئے دوا میں تجویز کیں اور جاوید ڈاکٹر ظفر اور رحیم کو چھوڑنے چلا گیا۔

”کرمل صاحب! کیا میں آپ کا سر دبا دوں؟“ عائشہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں، شکریہ!“ کہہ کر انہوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

عائشہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”ڈاکٹر عائشہ!“ اسے کرمل کی آواز سنائی دی۔ ”آپ جانا چاہیں تو جا سکتی ہیں۔“ انہوں نے خشک سے لہجے میں کہا۔ عائشہ حیران نظروں سے کرمل کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو سے بھر آئے۔

”جی نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”آپ کیا مجھے یہ جتنا چاہتی ہیں کہ میں آپ لوگوں کی ہمدردیوں کا مستحق ہوں، میں ایک بیمار اپانج ہوں؟“ کرمل کی آواز میں غصہ تھا۔

”نہیں نہیں۔“ عائشہ بولی اور اس کی آنکھوں میں چھپے آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔ کرمل اسے دیکھ رہے تھے وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ کامران اور سیما کے کمرے میں جا کر وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔ اسے کرمل سے شاید اتنے خشک رویے کی توقع نہ تھی۔ کامران اور سیما کمرے میں بیٹھے سکول کا کام کر رہے تھے۔ آپنی کو دیکھ کر ان کے چہرے کھلے جا رہے تھے مگر وہ حیران تھے کہ آپنی کو کیا ہوا ہے۔

عائشہ نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں اور پھر جھکالیں۔ کہنے لگی۔ ”آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“

”کچھ نہیں۔“ کرنل نے آہستہ سے جواب دیا۔

”کچھ نہ کچھ تو کھانا ہی چاہئے۔ آپ مجھے ایک

نرس ہی سمجھئے۔ میں آپ کے لئے گرم دودھ لاتی ہوں۔“ عائشہ نے کہا اور کوئی جواب سننے بغیر باہر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

کرنل کو اس نے ابھی ابھی ان کے اصرار پر نیند کی گولی کھلائی تھی اور وہ سو چکے تھے۔ عائشہ ان کے بک فیلف سے کتابیں اٹھا کر دیکھتی رہی۔ پھر وہ کرنل کے بستر کے پاس جا کھڑی ہوئی اور غور سے ان کو دیکھنے لگی۔

سوئے ہوئے وہ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ ستواں ٹاک، خمدار ہونٹ جن پر باریک مونچھیں تھیں، چمکدار پیشانی جس پر تھوڑے سے بال پڑے ہوئے کرنل اپنی عمر سے کہیں کم نظر آ رہے تھے۔ عائشہ نے سوچا چند سال پیشتر یہی انسان اپنے آپ پر کس قدر فخر محسوس کرتا ہو

گا۔ اتنے پیارے پیارے بچے، خوبصورت بیوی اور اتنا اچھا عہدہ..... مگر اب کیا تھا؟ کرنل کو دوبارہ نارمل زندگی میں لانے کے لئے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو ہمہ وقت ان کے ساتھ رہے..... وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی اور اپنے ذہن میں عجیب و غریب فیصلے کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مطمئن ہو گئی اور صوفے پر لیٹنے ہی اسے نیند نے آگھیرا۔

صبح اس نے کرنل کو دو کھلائی، ان کی طبیعت بہتر تھی۔ بچوں کو سکول چھوڑا اور پھر اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ اماں بی نے اسے بتایا کہ رات سے اس کا بھائی رضوان آیا ہوا ہے۔ وہ ٹھک گئی مگر مطمئن ہو گئی۔ اس کی رات کی ڈیوٹی بھی تو ہو سکتی ہے مگر رضوان نے کہیں ہسپتال فون نہ کر دیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ رضوان اس کے بستر پر سو

رہا تھا۔ وہ الماری سے کپڑے نکالنے لگی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ سلام و دعا ہوئی۔

”رضوان! ای ابو کیسے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”امی ابو آپ کے پاس آنے کا سوچ رہے تھے۔

آپ! آپ..... آپ کہاں تھیں؟“ رضوان کے دماغ میں رات سے ترپنے والا سوال ہونٹوں تک آ ہی گیا۔

”رضوان کچھ بھی غلط مت سوچنا۔ تمہاری آپ

برسوں سے اکیلی رہتی آئی ہے۔ کچھ تو اعتماد کرو گے نا

اس پر؟“ عائشہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ رضوان نے سر

جھکا لیا۔ ”میں ہسپتال سے آ کر تمہیں بھی وہاں لے

جاؤں گی جہاں میں تھی۔“ اس نے کہا اور ہاتھ روم میں چلی گئی۔

رضوان، کرنل حسن علی، کیپٹن جادید، سیما اور

کامران سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے عائشہ کو بتایا۔

”آپ! میں کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ اگر میرے ذہن میں

کوئی غلط بات آئی ہوتی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔“

”رضوان! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔“ عائشہ

اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ رضوان ریکارڈ پلیئر میں

ریکارڈ لگانے میں مشغول تھا۔ ”کیا آپ؟“ وہ بولا۔

”رضوان! زندگی خدا کی امانت ہے نا؟“ وہ

بولی۔

”جی ہاں، ہے۔“ وہ چونک کر آپ کی طرف

دیکھنے لگا۔

”اگر ہماری زندگی کسی کے کام آئے، یعنی ہر ممکن

اچھے طریقے سے ہم اس زندہ رہنے کے حق کو استعمال کر

سکیں۔ جب بھی ہم حق بندگی نہیں ادا کر سکتے۔“ عائشہ

کھوٹی کھوٹی سی کہہ رہی تھی۔ رضوان نے اسے سوالیہ

نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ریکارڈ پلیئر بند کیا اور اس کے

باس نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ ”رضوان! تم

نے مجھے بتایا تھا کہ سیٹھ حامد علی کے بیٹے راشد کے گھر کے لوگ آئے تھے۔

”اور آپ! شاید امی ابواسی سلسلے میں آپ کے پاس آ رہے ہیں۔“ رضوان بولا۔
”تو رضوان! میں کنٹرل کو راشد پر ترجیح دیتی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیا آپ!.....؟“ رضوان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے عائشہ کو دیکھ رہا تھا۔
”رضوان! اس میں برائی کیا ہے؟“ عائشہ نے

ایسی مسکراہٹ سے کہا جو اس کے بھائی رضوان کے لئے انوکھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔“

”مگر آپ!“ رضوان کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ قدرے ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”کنٹرل آپ سے عمر میں بڑا ہے اور وہ معذور ہے۔“

”میں تو معذور نہیں۔“ عائشہ نے کہا۔ ”میری جوانی کسی معذور کے کام آ جائے تو کیا برائی ہے؟“
رضوان غلاؤں میں گھونگیا۔

☆.....☆.....☆

عائشہ، سیما اور کامران لان میں آنکھ جھولی کھیل رہے تھے۔ عائشہ نے آسمانی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر دوپٹہ بندھا تھا اور وہ کامران اور سیما کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کسی سے ٹکرائی، اس نے جلدی سے دوپٹہ آنکھوں سے اتار کر دیکھا، کیپٹن جاوید کھڑا تھا۔

”انشاء اللہ! آپ ڈاکٹر ہیں۔“ وہ شرارت سے مسکرا کر بولا۔ ”مجھے تو شک ہونے لگا ہے کہ آپ نے میڈیکل کیا ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ سیما نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”یہ جو آپ بچوں کے ساتھ اودھم مچائے رکھتی

ہیں جیسے آپ بھی انہی جتنی ہوں۔“ وہ بولا۔
”تو کیا ہوا؟ مجھے بہت مزا آتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”لگتا ہے آپ کا اپنے بچپن سے ابھی دل نہیں بھرا۔“ وہ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میرا بچپن!“ اس کے چہرے پر سایہ سا بڑ گیا۔
وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کا بچپن گھر سے دور ہوشلوں میں گزرا ہے۔ گھر میں ہنسنے پھینکنے کے ارمان تو اس کے دل میں ہی رہ گئے تھے۔

”چچو! آپ! نے ہمیں بہت سے مربضوں کی اور ہسپتال کی کہانیاں سنائی ہیں۔“

”ہم بھی تو مربض ہیں۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولا۔ عائشہ دوسری کرسی پر بیٹھی اس کی تمام باتیں سن رہی تھی۔ کیپٹن جاوید کی دلچسپی کو تو وہ پہلے ہی سمجھ چکی تھی مگر اس نے منہ سے بھی کچھ نہ کہا تھا مگر آج اس کے دل میں دھماکے سے ہونے لگے۔

”آپ!..... آپ!“ کامران نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”چچو کو دیکھئے کیا ہوا ہے؟“ اس نے دیکھا کہ جاوید بائیں طرف سینے پر ہاتھ رکھے دوہرا ہو رہا تھا۔

”آپ! ان کے ادھر درد ہو رہا ہے۔“ سیما آنسو بھری آنکھوں سے عائشہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیپٹن جاوید!“ عائشہ نے دھیرے سے اسے پکارا۔ ”مجھے افسوس ہے کیپٹن! بے حد افسوس ہے۔“ اور جلدی سے لان پار کر کے اندر چلی گئی۔ جاوید ایک دم بوکھلا کر سیدھا ہو گیا۔ اسے قطعی امید نہ تھی کہ عائشہ اس قدر بُرا مانے گی۔ اس کے خیال میں تو بُرا ماننے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ وہ جلدی سے اس کے پیچھے لپکا مگر عائشہ اوور آل اٹھائے باہر آ رہی تھی۔ جاوید نے اسے دیکھ کر کچھ کہنا چاہا تو وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر کے

جس نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا وہ صرف اور صرف کرئل تھا۔ چند منٹ بعد جاوید جس طرح خاموشی سے گاڑی سے نکلا تھا اسی طرح گاڑی میں آ بیٹھا۔ کار شارت کرنے سے پہلے اس نے ڈیش بورڈ میں ہاتھ مار مار کر ایک مارجس اور سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ عائشہ کو سگریٹ ناپسند تھے مگر اس وقت وہ جاوید کی حالت کو سمجھ رہی تھی۔ جاوید نے اجازت لینے کی غرض سے اس کی طرف دیکھا تو عائشہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بُری طرح سرخ ہو رہی تھیں اور شاید فی جذب کرنے کی وجہ سے بھاری بھی ہو رہی تھیں۔

”ڈاکٹر عائشہ! آپ نے بہت خوبصورتی سے دل توڑا ہے۔“ جاوید کی آواز میں لرزش تھی۔

”جاوید!“ عائشہ نے بوجھل آواز سے کہا۔ ”میں نادم ہوں۔“ عائشہ نے ملتی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس پڑا۔

”کیا آپ کو آپ کا آئیڈیل کہیں ملا بھی؟“ وہ آہستہ آہستہ بولا۔

”کیپٹن جاوید!“ عائشہ نے کہا۔ ”آپ چاہے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کہیں، آپ کو تو بہت سی اور لڑکیاں مل جائیں گی، مجھ سے کہیں خوبصورت، پڑھی لکھی مگر جسے میں پسند کرتی ہوں اسے صرف میں ہی پسند کر سکتی ہوں اور کوئی نہیں، کوئی نہیں۔“

”کیا آپ اس ناچیز کو بتانا پسند نہیں کریں گی کہ وہ خوش نصیب کون ہے؟“ کیپٹن نے ملتی سے پوچھا۔

”کیپٹن! مجھے بتانے میں کوئی اعتراض نہیں مگر آپ..... آپ کو شاید دکھ پہنچے۔“ عائشہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔ کیپٹن جاوید نے اس کی طرف دیکھا۔ عائشہ نے پوری ہمت جمع کی اور آہستگی سے بولی۔ ”کرئل حسن علی۔“

کیپٹن جاوید کی کار کے بریک زور سے چپے اور

کرئل کے کمرے میں چلی گئی۔ کرئل عائشہ کا کہنا کسی حد تک مان لیتے تھے۔ عائشہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ بچوں کے ساتھ لان میں رہیں۔ کیپٹن جاوید اسے مگر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ خود ہی کرئل کی کرسی کو لان میں لے آئی۔ کرئل نے عائشہ اور جاوید کو جاتے دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

عائشہ ہمیشہ کی طرح جاوید کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ جاوید نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”عائشہ!“ جاوید نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی کہ آپ یوں ناراض ہو جائیں!“

”کیپٹن جاوید! ناراض ہونا مجھے آتا ہی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”اور پھر میں سمجھتی ہوں ہر انسان اپنی پسند کا حق رکھتا ہے۔ اسے اظہار کا بھی حق حاصل ہے مگر وہ زبردستی نہیں کر سکتا۔“ عائشہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ کیپٹن اس کی ہر بات بہت دھیان سے سن رہا تھا۔ ”میرا آئیڈیل ہمیشہ سے ہی ایک بنیدہ، خاموش اور بُرے دُعا ساز انسان رہا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ یقین سا ہے کہ کوئی بھی میرا ہم عمر انسان مجھے سمجھ نہیں سکے گا۔ سمجھے گا تو شاید غلط سمجھے گا۔ انجام اچھا نہیں ہو گا۔ آپ..... آپ بہت اچھے ہیں، کیپٹن! بہت سنجیدہ ہوئے انسان ہیں مگر.....“ عائشہ کی آواز رندھی جا رہی تھی۔

کیپٹن جاوید کے ہاتھ سیرنگ پر کپکا اٹھے۔ اس نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر روک دی اور گاڑی سے نکل کر باہر کھڑا ہو گیا۔ عائشہ ذکی الحس تھی۔ اسے اس پر بھی افسوس ہونے لگا کہ اس نے کیپٹن جاوید جیسے نکتے مردوں کے دل توڑے ہیں مگر وہ کسی بھی جذباتی اور ہم عمر انسان سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ امیدواروں اور چاہنے والوں کے ہجوم میں سے اسے

عائشہ اس دن کے بعد کرنل کے گھر نہیں گئی۔ بچوں کی ضد کے باوجود جاوید انہیں عائشہ کے گھر نہیں لے گیا۔ اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ بھائی جان کا تھا کہ کیا کرنل حسن علی ایسی کسی بات پر رضامند ہو جائیں گے۔

ایک روز کرنل، کیپٹن جاوید اور بچے لان میں بیٹھے تھے۔ کرنل بھی کبھی کبھی اب بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو جاتے تھے۔ چاروں کیم کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ایک گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ اس میں اترنے والے لوگوں میں سے کیپٹن نے رضوان کو پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ایک بھاری بھرکم بارعب شخصیت کے بزرگ تھے اور ایک خاتون جن کے سفید دوپٹے میں سے جھانکتے سفید بالوں نے ان کو اور پاکیزہ بنا دیا تھا۔ کیپٹن جاوید انہیں لے کر ڈارنگ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل حسن علی بھی پہنچ گئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے۔ رات کو کرنل نے جاوید کو سٹڈی میں بلایا اور کہا۔ ”ساتم نے جاوید! ڈاکٹر عائشہ کی حماقت“۔

جاوید سمجھ گیا لیکن اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ”بھائی جان! میں سمجھا نہیں۔“

کرنل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ”تم کل عائشہ کو لے کر آنا“۔

☆.....☆.....☆

”ڈاکٹر عائشہ! یہ سراسر حماقت ہے جو آپ نے فیصلہ کیا ہے۔“ کرنل کا رخ کھڑکی کی طرف تھا اور پاہ دیکھ رہے تھے۔ عائشہ جھوٹے صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ نظریں قالین کے نقش و نگار میں الجھی ہوئی تھیں۔ کرنل نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر کرسی کو گھما کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ کرسی چلاتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ ”سنا..... آپ نے..... میں کیا کہہ

کا ایک جھٹکے سے رک گئی۔ جاوید کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین ٹھوم گئی ہو۔ ”عائشہ..... عائشہ!“ اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ ”کاش! آپ نے یہ مجھے پہلے بتا دیا ہوتا، میں اپنی نظروں میں یوں تو ذلیل نہ ہوتا۔“ عائشہ! دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ کیپٹن جاوید نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ زخمی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ باگل لڑکی!“ اسے روتی ہوئی ڈاکٹر اس وقت ایک نضحی سی چچی معلوم ہوئی جس سے گلاس ٹوٹ گیا ہو اور گھر والوں کے ڈر سے رو رہی ہو۔

”میں نے..... میں نے آپ کو دکھ دیا ہے۔“ وہ شبہی آنکھوں سے کیپٹن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ستارے اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ”لیکن یہ بات بتا کر آپ نے جو خوشی مجھے دی ہے وہ مجھے اس فضول سے دکھ سے زیادہ عزیز ہے۔“ کیپٹن نے اس کے سر کو گھماتے ہوئے کہا اور اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

جاوید نے کار سٹارٹ کر دی اور بولا۔ ”کیا آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا تھا جو آپ نے رونا شروع کر دیا تھا؟“

”نہیں تو۔“ عائشہ نے کہا۔ ”رونا تو مجھے اسی بات پر آیا تھا کہ آپ کو میں نے دکھ دیا ہے۔“

جاوید نے پھسکی اور کھیالی سی مسکراہٹ سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسے دکھ نہیں ہوا لیکن اس کی جذباتی دنیا میں جو بھونچال آ گیا تھا اس کے تاثرات اس کے چہرے پر عیاں تھے۔ عائشہ کو وہ گھر چھوڑ آیا تو اس کا اضطراب اور زیادہ بڑھ گیا۔ اسے کبھی خیال آتا کہ عائشہ نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے اور کبھی وہ یہ رائے قائم کرتا کہ عائشہ اگر پاگل نہیں تو ذہنی لحاظ سے نارمل لڑکی بھی نہیں۔

ہو چکی تھی اور یہ خبر سو فیصد سچ تھی۔

یہ ایسی شادی تھی جس میں نہ بارات گئی، نہ ڈولی اٹھی نہ دعوت دلیہ دی گئی۔ مٹری بینڈ آیا نہ پرائیویٹ بینڈ باجے کو بلایا گیا۔ کوئی شور وغل نہ ہوا۔ البتہ لوگوں نے ہر وہ بات کہی جو کسی کے منہ میں آئی۔ عائشہ ایک تماشہ بن گئی۔ اگر کوئی انسان اس شادی سے مطمئن تھا تو وہ صرف عائشہ تھی جس نے انہونی کر کے دکھا دی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھی جیسے ایک مدت تپتے ہوئے ریگزار میں بھٹک بھٹک اور جل جل کر اسے ٹھنڈی بچ منزل مل گئی ہو۔

عائشہ کرل کی سنڈی کے دروازے میں جا رہی۔ کرل ڈیبل چیئر پر بیٹھتے تھے۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ شب عروسی کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ کمرے میں میز پر رکھے ٹیبل لپس کی مدد سے روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دوپٹے کو سنبھالنے کے لئے ہاتھ اوپر کیا تو اس کی چوڑیوں کی ٹھٹھکی نے سناٹے کو توڑا۔ کرل نے آنکھیں کھولیں تو عائشہ ان کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ کرل کی سلتکی نظریں عائشہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

”اب آپ خوش ہیں؟“ کرل کی بھاری مدھم آواز عائشہ کے کانوں سے ٹکرائی۔

عائشہ کی جھکی جھکی نظریں انھیں اور کرل کی نظروں سے ال کر فوراً جھک گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چند قدم آگے بڑھی اور پھر قالین پر ٹکٹے ٹیک کر اپنا سر کرل کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد اس کا معمول یہ بن گیا کہ ہسپتال سے آ کر بچوں کے ساتھ کھیلتی۔ کرل کو وہ اتنا مجبور کرتی کہ انہیں بھی سب کے ساتھ شامل ہونا پڑتا۔ رضوان ایک کورس کے لئے جرمنی جا چکا تھا اور شاہد امریکہ سے

ہوں؟“ کرل کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ عائشہ کا سر کچھ اور جھک گیا۔ ”ڈاکٹر! آپ مجھے بھی پاگل کر دیں گی۔“ کرل جھنجھلا کر بولے۔ ”میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے اور پھر آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ کی اور میری عمر کے درمیان کم از کم بیس سال کا فرق ہے۔ میں معذور ہوں، اپانچ ہوں۔“ عائشہ نے آہستہ سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ کرل کی طرف دیکھا۔ ”کرل صاحب!“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔“ کس قدر سادگی سے اس نے اظہار کر دیا تھا۔ کرل ٹھٹکی پانڈھے اسے دیکھتے رہے۔ وہ اب پھر قالین کو دیکھ رہی تھی۔

”ہم اچھے دوست بھی تو رہ سکتے ہیں۔“ کرل بولے۔

”مجھے ایک نہ ایک دن تو شادی کرنی ہی ہے..... تو.....“ عائشہ کی زبان اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

کرل نے تیزی سے اپنی کرسی کو دوسری طرف موڑا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد ان کی بھاری آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔ ”عائشہ!“ ساتھ ہی انہوں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو صوفہ خالی تھا۔ وہ نہ جانے کب اٹھ کر چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایک روز اچانک چھاؤنی کی سوسائٹی کے اونچے حلقوں میں زلزلے کے اتنے شدید جھکے محسوس کئے گئے کہ ہر کوئی دم بخود ہو کے رہ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے امیدواروں اور اس کی محبت کے مریضوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ خبر ہی ایسی تھی کہ کوئی اسے سچ ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ کون مان سکتا تھا کہ ڈاکٹر عائشہ جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی نے کرل حسن علی جیسے معذور اور اپنے سے اتنی زیادہ عمر کے آدمی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ مگر لوگوں کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ یہ شادی

نے آنکھیں کھولیں تو وہ ان کے پاس بیٹھی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”وہ میں کامران اور سیما کو کہانی سنارہی تھی۔“

اس نے جلدی سے کہا۔ کرنل کچھ نہ بولے۔ بس گہری گہری نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ کھلے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ عائشہ نے دوایک بار کرنل کی طرف دیکھا اور اپنے نیچے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ کرنل نے ہاتھ بڑھا کر نیپل لیپ آف کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ رات بہت دیر تک انہیں نیند نہ آئی۔ عائشہ لیٹتے ہی سو گئی۔

سیما اور کامران چھٹیوں میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ عائشہ آج صبح کر کے کرنل کو کلب لے کر آئی تھی۔ کیپٹن جاوید اور عائشہ بیڈنٹن کھیلنے گئے تھے۔ کرنل حسن علی ڈاکٹر کرنل رحیم سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر رحیم کو دور سے کرنل صدیقی نظر آئے تو وہ کرنل حسن علی سے معذرت کر کے ان کی طرف گئے۔ کرنل حسن علی میز پر پھیلے ہوئے کارڈ اکٹھے کر رہے تھے کہ ان کے کان میں آواز پڑی ”کیا خوبصورت جواڑا ہے۔“ غیر ارادی طور پر انہوں نے کہنے والے کی نظر کا پیچھا کیا تو سامنے سے عائشہ اور جاوید آ رہے تھے۔ جاوید ریکٹ گھما رہا تھا۔ عائشہ کاریکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ پورے بازوؤں والی قمیص پہنتی تھی اور دوپٹہ اس کی گردن سے لپٹ کر دونوں سائیڈوں سے آگے پڑا ہوا تھا۔ کرنل کے ذہن میں تیزی سے کچھ خیالات آ آ کر جا رہے تھے۔

”آخر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی ہے؟“

کرنل کاموڈ بگڑ چکا تھا۔ گھر آ کر بھی وہ خالصہ سنجیدہ لگ رہے تھے۔ عائشہ بارہا پی خانے میں کافی بنانے لگی تھی۔ کیپٹن جاوید کرنل کے کمرے میں تھا۔ کرنل نے انہیں روک لیا تھا۔ ”جاوید!“ کرنل نے سنجیدہ آواز میں پکارا۔

ہی اپنے لئے ایک ساتھی چن لایا تھا۔ امی ابانے کچھ نارنگی کا انڈھا کر پھر جب عائشہ کو پتہ چلا کہ یہ سنہری گڑیا مسلمان ہو چکی ہے تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ روہینہ اور عاصم بھی واپس آ چکے تھے۔

عائشہ نے سب کے اعزاز میں پارٹی دی۔ پارٹی میں کیپٹن جاوید کے کچھ دوست اور چھاؤنی میں رہنے والے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کرنل بھی سب لوگوں کے ساتھ ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھے تھے۔ عائشہ نے دور کھڑے ہو کر دیکھا، وہ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔

عاصم کرنل کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے جبکہ کرنل سے نہ جانے کیا کہا کہ کرنل کی ہنسی غائب ہو گئی۔ انہوں نے نظریں دوڑا کر عائشہ کو تلاش کیا وہ روہینہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اسی رات کرنل بستر پر نیم دراز تھے۔ انہیں عائشہ کا انتظار تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ اس وقت سیما اور کامران کے پاس ہو گی۔ کرنل اس کے بارے میں سوچنے لگے۔ کیسی عجیب و غریب لڑکی ہے۔ لگتا ہے اس کا بچپن ابھی تک اس سے جدا نہیں ہو۔ کرنل کا وہ بہت خیال رکھتی تھی۔ بعض دفعہ کرنل کو جھنجھلاہٹ ہونے لگتی تھی۔ وہ ہر کام مشین کی طرح کرتی تھی۔ اس نے خود کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ کرنل کو رضوان نے بتایا تھا کہ وہ عاصم اور راشد کے لئے انکار کر چکی ہے۔ آج عاصم نے عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے کرنل سے یہی کہا تھا۔ ”یہ عظیم لڑکی ہے اور آپ خوش نصیب ہیں۔“ اس وقت کرنل کو بہت محسوس ہوا تھا مگر اب وہ سوچ رہے تھے واقعی میں خوش قسمت ہوں جسے ایک ایسا ساتھی مل گیا ہے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

سازھے بارہ بجے عائشہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ لباس تبدیل کر کے وہ بستر پر آئی۔ کرنل

کیپٹن جاوید نے سوالیہ انداز میں بھائی کی طرف دیکھا۔
”عائشہ کیسی لڑکی ہے؟“

”جی، کیا؟“ جاوید نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔

”کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اس پر ظلم کیا ہے؟“ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی، ظلم کیا؟ سب کچھ تو ان کی خواہش پر ہوا ہے۔“ کیپٹن جاوید سنسجھل کر بولا۔

”تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ اس نے مجھ پر ترس کھایا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ کیپٹن جاوید ہڑبڑا کر بولا۔

”جاو جاوید!“ کرئل نے کہا اور کروٹ بدل لی۔
جاوید کے جانے کے بعد عائشہ کمرے میں آئی تو

کرئل بستر پر نیم دراز تھے۔ اس نے ان کے لئے کافی کی پیالی سائینڈ ٹیبل پر رکھی اور خود کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ کرئل ویسے ہی بیٹھے ہیں۔ کافی کے اوپر کریم کی ہلکی سی تہہ آ چکی تھی۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں میری طبیعت کو کیا ہوا؟“ انہوں نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

عائشہ ٹھک کر رہ گئی۔ ”میں نے کچھ کیا ہے؟“ اس نے جیرانی سے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے میں سب لوگوں کے لئے تماشا بن گیا ہوں لوگ مجھے خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ تمہاری اس عظیم قربانی کا سن کر میرے کان ٹھک گئے ہیں کیہ تم نے ایک اپناج کو سہارا دیا ہے۔“ کرئل کی آواز میں کئی

تھی۔

”قربانی..... کیسی قربانی؟“ عائشہ نے کہا۔ ”کوئی

مجھ سے پوچھے آپ کو پا کر میں اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب سمجھتی ہوں۔“

”کیا خوش قسمتی ہے تمہاری؟ ہم دونوں اچھے دوست ہی ہیں ناں، تو وہ بغیر اس بندھن کے بھی رہ سکتے تھے۔“ کرئل نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

”عائشہ نے سر جھکا لیا۔ وہ بستر کی سلوٹوں پر انگلی پھیر رہی تھی۔ کرئل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بولو، جواب دو؟“ انہوں نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

عائشہ نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ”تم نے مجھ سے شادی کیوں کی ہے؟“ انہوں نے سختی سے پوچھا۔

عائشہ نے جھکے سے سر اوپر کیا اور کہا۔ ”مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔ بہت اچھے لگتے ہیں۔“ آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ اپنی معصوم لگ رہی تھی مگر اس کی آواز میں ہٹ دھرمی تھی۔ وہ یہ تو دیکھ ہی چکے تھے کہ وہ ضدی بھی خاصی ہے۔

”کیوں؟“ انہوں نے اپنی آواز میں آئی ہوئی نرمی کو سنجیدگی کی تہہ میں چھپاتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ بولی۔ انداز ضدی تھا۔

”کیا تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ میں تم سے نفرت بھی کر سکتا ہوں؟“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

عائشہ کے آنسو ایک دم جیسے خشک ہو گئے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ ”یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ بستر پر قھوڑا پیچھے ٹھک گئی جیسے کرئل کی نفرت سے بچنا چاہتی ہو۔

اس نے کرئل کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے۔ عائشہ نے کچھ سوچا اور پھر اس کی دھیمی سی آواز نے سکوت توڑا۔ ”میرا سارا بچپن گھر سے دور

دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کئے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اس کا بازو تھام کر اسے آگے کیا اور دھیرے سے اپنے بازوؤں میں لے لیا وہ ان کے شانے سے لگی سبک رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے سیاہ بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ کرٹل اس کے بالوں پر نظریں جمائے سوچ رہے تھے کہ بچپن کے ماحول کی وجہ سے وہ نفسیاتی طور پر ایسی ہو گئی ہے۔ اسے بچپن میں ماں باپ کا پیار نہ مل سکا۔ دونوں کی لاتعلقی نے اسے اپنے فالتو ہونے کا احساس دلایا۔ انہیں کامران، سیماء اور اس کی ایک گفتگو یاد آئی۔

کامران نے ”بادشاہ کی خواہش“ کہانیوں والی کتاب سنتے سنتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ ”آپ! آپ کی کیا خواہش ہے؟“ تو اس نے جواب دیا تھا۔ ”میری خواہش ہے میں منجھی سی بچی بن جاؤں، سارا دن کھینچی رہوں اور رات کو امی یا باپ سے لپٹ کر سو جاؤں۔“

”آپ! جس طرح ہم آپ کے ساتھ سوتے ہیں؟“ سیماء نے اشتیاق سے پوچھا تھا تو عاشری نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

گھڑیال نے دو دفعہ ٹن ٹن کیا تو کرٹل اپنے خیالات سے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا وہ کسی معصوم بچے کی طرح ان کے بازوؤں میں سوئی ہوئی تھی اور سینے کے سامنے سے بازو لے جا کر اس نے مضبوطی سے ان کا کرتہ مٹھی میں پکڑ رکھا تھا۔ انہوں نے دھیرے سے اسے اس کے بچکے پر لٹا دیا۔ اس کے بالوں نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ بنا رکھا تھا۔ پونے زیادہ رونے کی وجہ سے ابھر آئے تھے۔ بھیکے بھیکے لہجے پر عجیب سی مسکان تھی۔ انہوں نے اپنے شانے پر ہاتھ رکھا تو کرتہ تھوڑا تھوڑا نرم تھا۔ وہ ضبط نہ کر سکے اور کہنی کے بل جھک گئے۔ ان کے ہونٹوں نے اس کی پیشانی کو چھو لیا۔



ہونٹوں میں گتر مارا ہے۔ ابو کے پاس بچوں کے لئے کوئی وقت نہیں ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں امی بھی عام ماؤں کی طرح اپنے بچوں کو زیادہ لاڈ پیار نہیں کرتی تھیں۔ میرے ماں باپ نے میری ہر بات مانی ہے مگر پھر بھی مجھے ایک فکری اور احساس ہمیشہ رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر میں میری کسی کو ضرورت نہیں۔ اسی وقت میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس شخص کو ساری زندگی کا رشتہ بناؤں گی جسے میری ضرورت ہوگی اور میں تمام وقت جس کی نظر میں رہوں.....“

وہ رک گئی، اس کی نظریں بستر پر جمی تھیں۔ ”ہوں۔“ کرٹل نے سوچ میں ڈوبی آواز میں کہا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں آپ سے ڈھیر سی باتیں کروں۔ آپ سنتے رہیں، سنتے رہیں۔“ وہ رک رک کر بول رہی تھی۔ ”جو لوگ سمجھتے ہیں میں نے قربانی دی ہے میرا دل چاہتا ہے میں ان کا منہ نوچ لوں۔ میں نے سب اپنی خوشی کے لئے کیا ہے۔ مجھے انسو ہے میں نے آپ کو دکھ دیا ہے۔“ اس کی آواز میں پھر لرزش آ رہی تھی۔ اس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ آنسو نکلنے کو بہا رہے تھے۔

”آگے آؤ!“ کرٹل نے اشارے سے حکمانہ انداز میں کہا۔ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی تھوڑا سا آگے کھسکی۔ ”اور آگے۔“ انہوں نے پھر کہا۔ وہ تھوڑا سا اور آگے ہو گئی۔ آنسو اس کے گالوں پر لکیر کی صورت میں بہہ رہے تھے۔

”ماتا ختم روتے ہوئے بہت خوبصورت لگتی ہو۔ پھر بھی اتنی پیاری آنکھوں پر اتنا ستم ٹھیک نہیں ہے۔“ کرٹل کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

عاشری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے آنسو صاف کرنے چاہے تو کرٹل نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اونہ۔“ وہ بولے اور

جہیز یا جگا ٹیکس!

کیا جہیز دینا نبی کی سنت ہے؟



0303-4158340

☆ محمد طفیل طوفی

محترم عارف محمود صاحب، السلام علیکم! اپنے دوست محترم محمد طفیل طوفی کی ایک فکر انگیز تحریر روانہ کر رہا ہوں۔ طوفی صاحب کویت کے تقریباً تمام اخبارات و رسائل میں لکھتے ہیں۔ آج کل وہ شوگر کی وجہ سے ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور ڈاکٹروں نے ان کا پاؤں کاٹنے کا فیصلہ کیا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ان کی اور تمام بیماروں کی صحت کاملہ کے لئے دعا فرمائیں۔ یہ مضمون جہیز جیسی لعنت کے موضوع پر ہے جو ہمارے معاشرے میں سرطان کی طرح پھیل چکی ہے اور اس وجہ سے بلا مبالغہ لاکھوں بچیاں گھروں میں بیٹھی بوزھی ہو رہی ہیں اور کئی غلط راہوں پر بھی چل پڑی ہیں۔ کیا اس کے لئے ہم سب گناہ گار نہیں ہیں؟ ہم کس کی پیروی کر رہے ہیں اور روز قیامت اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے؟

والسلام

خلیل احمد

مالک

حقیقی نے جن وائس کی پیدائش کا مقصد بڑے واضح الفاظ میں قرآن پاک میں یوں ارشاد

فرمایا ہے۔

ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اور صرف اپنی عبادت (فرمانبرداری) کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ مقصد تخلیق کو پورا کرنے والوں کے لئے بخشش و انعامات کا وعدہ فرمایا اور نافرمانوں کو مختلف انداز میں سزا کا خوف دلایا۔ اس فانی دنیا کو جو کہ چند روزہ ہے، امتحان و آزمائش کا مقام ٹھہرایا گیا اور موت کے بعد دہلی زندگی کو جزا و سزا کا وقت ٹھہرایا گیا۔

اللہ مالک نے اپنی ”لاریب فیہ“ کتاب میں وہ تمام اصول و ضوابط واضح الفاظ میں بیان فرما دیئے جن کے تحت جنت اور دوزخ کا فیصلہ ہو گا۔ قرآن پاک کو تفسیری کے طور پر اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عملی طور پر پوری انسانیت کے لئے ایک بہترین نمونہ قرار دیا گیا۔ یہ بھی وضاحت فرمادی گئی کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے رہو ورنہ یہ تمہیں اپنی پیروی کروا کر اپنے ساتھ دوزخ میں لے جائے گا۔

اب انسان کے اس ازلی دشمن نے اپنے ہزاروں سالہ تجربات کی روشنی میں عجیب و غریب انداز سے دشمن کا کردار ادا کیا جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہا اور ہم سب کو لے ڈوبا۔ اس نے بڑے بڑوں کو چاروں شانے چت کر دیا اور قریباً سبھی مات کھا گئے۔ مزید یہ کہ اس نے اس نقصان عظیم کا پتہ تک نہ چلنے دیا بد تو بد رہے بڑے بڑے نیک اور پرہیزگار افراد کو کبیرہ گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کر دیا اور اس کا ایک ہی حربہ ایمان کا بیڑا غرق کر گیا۔ اسوۂ حسنہ سے ہٹا کر غیر شرعی ہندوؤانہ نظام دے کر اپنے انتقام کی آگ بجھائی۔ اسی کے ذریعے وہ ہم سب سے جانے انجانے میں اپنی پیروی کروانے میں

کامیاب ہو گیا۔ شیطان کے ان خربوں میں سے ایک ایسا حربہ ہے جس میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے؟ وہ ہے ”غیر منمنون نظام نکاح“ جس میں ہم سب نہ صرف جلتا ہیں بلکہ حقائق کی روشنی میں ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے ایمان کا دیوالیہ ٹکٹا جا رہا ہے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ کہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا اسلام میں ”نظام وراثت“ کا ٹھوس قانون موجود ہے۔ پارہ نمبر 4 سورہ نسا آیت نمبر 11 تا 14 میں اس نظام کو حدود اللہ قرار دیا گیا ان ضابطوں کی پابندی کرنے والوں کے لئے جنت کی خوشخبری سنائی گئی اور اللہ کے (قانون وراثت کی) حدود کی نفی کرنے والوں کے لئے فیصلہ صادر فرمادیا گیا اور ذلت کے عذاب کی وارنٹ بھی دے دی گئی۔

”نظام وراثت“ رحمان کا نظام ہے اس کے مقابلے میں نظام جہیز کفریہ نظام ہے۔ نظام وراثت ایک فطری نظام ہے جس میں قطعی طور پر جبری ٹیکس نہیں ہے جس کسی کا ترک ہو گا اور جس قدر ہو گا وہی پسماندگان کو باقاعدہ تناسب کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر فرض کرو کوئی ترک نہیں یا کم ہے تو کوئی بات نہیں لیکن لغتی عمل جہیز جو کفریہ نظام ہے، ایک غیر فطری عمل ہے۔ لڑکی والا چاہے جس قدر مفلس و فلاں ہو، اس کے بچے بھوکے ہوں، شدید بحالی میں مبتلا ہو، صدقہ، زکوٰۃ و خیرات کا مستحق بن چکا ہو، اس کو بہر حال یہ ”جگانیکس“ ادا کرنا لازمی ہے۔ چاہے رشوت لے، چوری کرے، ڈاک ڈالے، کسی کے بچے کو اغوا کر کے رقم کا مطالبہ کر دے۔ حتیٰ کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا جرم کرنا پڑے کر گزرے۔ لیکن بہر حال اس کو پورا کرے اور کچھ نہ ہو سکے تو خیرات یا بھیک مانگ کر یہ جگانیکس پورا کرے۔

لے رہا ہے۔ نہیں بھائی یہ سو فیصد صحیح بات ہے۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ کسی غلط نظام کی وجہ سے جرائم ہوں گے تو وہ شخص باقاعدہ ان سب جرائم میں مجرم ہوگا جو کہ قول، فعل سے منع نہیں کرے گا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا حالانکہ یہ فوت ہو چکا ہوگا لیکن اس سبب سے ہونے والے تمام جرائم میں یہ برابر کا شریک شمار کیا جائے گا۔

اس گندے نظام جہیز کی وجہ سے جرائم کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے اپنانے اور نظام وراثت کو چھوڑنے والے کے لئے لازم کر دیا گیا۔ لہذا ہم نظام وراثت کے مقابلے میں نظام شیطان ”نظام جہیز“ کو اپنا کر ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔ اسلام جیسے پیارے اور امن و سلامتی والے مذہب میں جہیز جیسی ملعون شے کا نام و نشان تک نہیں بلکہ یہ بات تو اس پیارے دین کے فطری اور برحق ہونے کا ثبوت ہے کہ اسلام کی رُو سے ”سلسلہ نکاح میں“ لڑکی والوں کے ذمہ ایک پائی تک کا بوجھ نہیں۔

مختصر یوں سمجھئے کہ لڑکی کی کفالت نکاح کے وقت تک اپنے حالات و وسائل کے مطابق ماں باپ کے ذمہ اور نکاح کے فوری بعد تمام تر ذمہ داری خاوند کے ذمہ۔ کیسا صاف ستھرا، پیارا اور فطری نظام ہے۔ اسلام جیسے پیارے دین میں اسی کو کافی شمار کیا گیا کہ والدین کئی برس کی محنت و مشقت کر کے اپنی لخت جگر کو پال پوس کر حتی المقدور اس کی تعلیم و تربیت کر کے اپنی عزت کو خالق کے حکم کی تعمیل میں بغیر کسی معاوضے کے کسی کے سپرد کر دے۔ بلکہ لڑکی والوں کا یہ احسان عظیم شمار کیا گیا کہ انہوں نے یہ قربانی دی۔ اسی قربانی کی وجہ سے سرکار مقام باپ کا مقام فرما دیا گیا۔

برخلاف اس پیارے نظام کے ہم نے ہندو معاشرے سے یہ لعنت وصول کی کہ لڑکی کے ساتھ ”جگا

کیا یہ سب کچھ ہمارے سامنے نہیں ہو رہا؟ کیا آپ مساجد میں اکثر یہ فریادیں نہیں سنتے۔ ”بھائیو! میں نے بچوں کا نکاح کرنا ہے، میرے بچے کچھ نہیں، شدید پریشان ہوں، خدا کے لئے مجھے صدقہ، خیرات، زکوٰۃ دو۔ کیا تنخواہ دار ملازم اپنی تنخواہ سے بہن، بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے؟ (تنخواہ سے تو اکثر و بیشتر بمشکل روٹی پوری ہوتی ہے) کیا اس لعنتی نظام ”نظام جہیز“ نے رشوت لینا ملازم کی مجبوری نہیں بنا دیا بلکہ اگر رشوت لینا اس کے لئے فرض بھی کہہ دیا جائے تو کوئی جرم نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس کے لئے مجبوری پیدا کر دی گئی ہے کہ رشوت لے کر بہن بیٹی کا نکاح کر دے یا رشوت سے بچ کر بہن بیٹی کو گھر میں بٹھا کر بے غیرت بنا رہے اور زنا کے خطرات مول لے۔

اس گندے نظام کی غلطیتیں اور نجاستیں اس قدر طویل ہیں کہ شاید کوئی بھی حساس انسان ان کو کا کا حقہ بیان نہ کر پائے۔ جب بھی اس لعنتی نظام (نظام جہیز) کی نجاستیں قاضیوں، ناپاکیاں لکھنے بیٹھتا ہوں تو انتہائی کمزور اور کم علم ہونے کے باوجود میرے سامنے اتنے المناک اندوہناک اور پریشان کن واقعات آتے ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کس کو لکھوں اور کس کس کو چھوڑ دوں۔

میں کمزور سا انسان ان سب کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ باتیں دھکی چھپی ہیں؟ نہیں ایسا نہیں یہ واقعات تو ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بار بار اس لعنتی نظام کے خلاف جہاد کے لئے اکسار ہے ہیں لیکن شاید ہم بالکل ہی بے حس اور بے غیرت بن چکے ہیں اور اس قدر دلیر ہو چکے ہیں کہ اپنے ذمے لاکھوں، گروڑوں رشوتیں، چوریاں، ڈاکے، زنا، جھوٹ، دغا بازی، قتل، خودکشیاں، اغواء نہ جانے کیا کیا قبول کرنے کو تیار ہو چکے ہیں۔ آپ سوچیں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے، لکھنے والا ضرور غلو سے کام

بھی پیارے بلکہ ہر شے حتیٰ کہ جان تک ان پر فدا کرنے کو تیار۔ ایک پائی تک جھیز میں نہیں دے رہے۔ کیا قیامت تک کوئی ماں ایسی بیٹی اور ایسا داماد بنے گی؟ قطعاً نہیں۔ اب اسی نکاح کے دیمہ کے بارے میں بھی نوٹ کر لیجئے۔

سیدہ صدیقہ خرماتی ہیں میری رخصتی و عروسی کے دیمہ میں نہ اونٹ ذبح کیا گیا، نہ بھیڑ بکری، دیمہ کا کل کھانا دودھ کا وہ پیالہ تھا جو سعد بن عبادہ کے گھر سے آیا تھا۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح ہوتا ہے۔ جناب علیؑ کا نہ گھر ہے، نہ در، ان کی زرہ فروخت کروا کر سیدہ فاطمہؑ کے لئے کپڑوں اور خوشبو کا انتظام کروایا اور اسی رقم میں سے (اثاث البیت) گھر کا سامان مہیا کیا گیا۔ داماد کے حسب حیثیت داماد سے ہی پورا کر دیا گیا۔ دوسرے داماد جناب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں چکے بعد دیگرے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں نکلیں۔ خوش حال اور مالدار ہیں ان سے پورا کروانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ سب کچھ پہلے ہی سے موجود تھا۔ بہر حال داماد ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تاکہ قیامت تک کسی بچی والے کے لئے بچی کا وجود (زمت) نہ بن سکے۔ بلکہ اسے رحمت قرار دیا گیا ہے۔ جناب رحمت للعالمینؐ نے کیسی مثال قائم فرمادی کہ ہونے والا داماد بیتم ہے بہر حال وہی ذمہ دار ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بچی کا وجود ہمارے لئے باعث پریشانی و غم بلکہ باعث کفر و شرک بن چکا ہے۔ کیا ہم بچی کی خبر سن کر پریشان و غمزدہ نہیں ہو جاتے؟ کیا یہ کفار کی علامت نہیں کہ بچی کی ولادت کی خبر سن کر ان کے منہ سیاہ پڑ جاتے ہیں اور وہ غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ (سورہ قل: 58)

نکس،“ بھی ادا کیا جائے اور بہت بڑی فوج لے کر لڑکی والوں کے گھر دھاوا بولا جائے تاکہ وہ اس جرم کی سزا پا سکے کہ اس نے لڑکی کو کیوں جنم دیا۔ اگر بدبختی و بد نصیبی سے اس ”مجرم“ کی کوئی لڑکی یا لڑکیاں اور بھی ہیں تو پہلے ناکردہ گناہ کی سزا سے فارغ ہو کر یا بصورت دیگر اس سزا کے دوران ہی آئندہ کے لئے بھی فوری تیاری شروع کر دے کہ ان کے لئے بھی ”جنگ نکس“ ادا کرنا ہوگا اور مزید فوجیں حملہ آور ہوں گی۔

ہاں ایک بات کے بارے میں کسی فکر کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ کس طریقے سے پورا کیا جائے کیونکہ اس کا ہونے والا داماد چاہے بریلوی ہو، دیوبندی ہو، الحمد للہ ہو، چشتی ہو، قادری ہو، سہروردی ہو، صابری ہو، نظامی ہو، جلیانی ہو یا کسی بھی جماعت کا ہو چلہ کشی کرنے والا ہو، کچھ بھی ہو کتنا ہی متقی و پرہیزگار ہو پکا نمازی ہو، ”...“ ہو، اشراق کا پابند ہو، چاہے کتنا ہی نیکو کار ہو، اس بارے میں قطعاً معلوم کرنے کی زحمت نہیں کرے گا کہ یہ ”جنگ نکس“ کس طرح سے اکٹھا کیا گیا ہے اور نہ ”حملہ آور“ یہ سوچنے کی زحمت فرمائیں گے کہ یہ گوشت جو ہم کھا رہے ہیں صدقہ، زکوٰۃ و خیرات کا مال ہے۔ ”نیکہ یہ بات تو واضح ہے کہ لڑکی والا ملازم ہے تو رشوت پورا کرنے پر مجبور ہے۔ مولوی ہے تو صدقہ زکوٰۃ و خیرات سے۔ خدا کے لئے سوچئے! ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اللہ مالک کے قانون ”نظام دراغت“ کی نفی کر کے دوزخ اور ذلت کے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سیدنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح ہوتا ہے۔ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ ایک بہت بڑے تاجر ہیں، اپنی محبوب بیٹی کو اپنے محبوب کے حوالے کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں لیکن ایک سوئی تک جھیز میں شامل / ثابت نہیں۔ بیٹی بھی پیاری، ہونے والے داماد

کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور احمقانہ انداز میں لعنتی بننے سے باز نہیں آ رہے۔

مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہم سب کو الٹا لٹکا کے رکھ دیا ہے اس شیطانی نظام کو پورا کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے تمام اہل خانہ کو کیا کیا پڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ عوام الناس اس سے خوب واقف ہیں۔ وہ سنگین اور مہلک نتائج جو ہم سب کو محاصرے میں لے چکے ہیں۔ ان کی فہرست بہت طویل ہے ان کی کر بنا کی ناقابل بیان ہے ان کی تباہ کاریوں کا شکار مجھ جیسے کمزور انسان کے بس میں نہیں۔ صرف ایک بات اشارتاً عرض کرتا چلوں کہ اس لعنت کو پورا کرنے کی خاطر ایک حقیقی ماں اپنی کنواری بیٹی سے زنا کروانے پر مجبور ہو گئی کیونکہ اس لعنت کو پورا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی اور ذریعہ نہ رہا۔ ہماری معلومات میں چند سنگین قسم کے واقعات ہیں جن کو بیان کرتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے۔

”انسان“ جس کو اشرف ہونے کا مقام بخشا گیا، یہ لعنت اسے پستی کے آخری مقام تک لے گئی۔ جنون صرف یہ کہ ہم لڑکی کا صحیح حق ادا کرتے ہیں اور بیٹی کے بڑے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں۔ اللہ کے مقرر کردہ نظام کو ہم سب عام لوگوں نے تو کیا انتہائی نیکیوں اور پرہیزگاروں نے بھی غیر مفید سمجھ کر کمزور و حقیر سمجھا۔ کس قدر افسوس کیا جائے اس مسلمان کی بدبختی پر کہ اس نے خلاق حقیقی کے قانون کی نفی بھی کی اور مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی بھی کھلے عام مخالفت کر کے دونوں جہان کی ذلت و خواریاں اپنے مقدر میں کر لیں۔

یہ لعنتی جہنم سراسر ہندو کا نظام ہے، اسلام جیسے پیارے دین میں اس گندگی کا نام و نشان نہیں۔ جہیز کا اسلام میں کوئی وجود نہیں، نہ قرآن میں اس کا ذکر ہے، نہ حدیث میں نہ فقہ میں۔ مسلمانوں میں یہ رسم ان قوموں

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ آخر کس بات نے ہمیں عملاً کافر بننے پر مجبور کر دیا؟ یہی کہ ہم نے اللہ مالک کی حدود (نظام وراثت) کو اپنی پیچوں کے لئے نامناسب سمجھ کر ہندو نظام ”نظام جہیز“ اپنا لیا۔ افسوس صد افسوس ہماری بدبختی و بد نصیبی پر کہ ہم نے اسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر ہندو نظام قبول کرنے کی حماقت کی اور لڑکی کے زیادہ خیر خواہ بننے کے شوق میں غیر اسلامی نظام قبول کر کے اپنے لئے جہی اور تمام معاشرے کے لئے بھی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کر دیا حالانکہ حق تو یہ ہے کہ ”حقوق العباد“ کے سلسلے میں انسان (ماتفریق مسلم و غیر مسلم) کے حقوق فرداً فرداً واضح طور پر خالق و مالک حقیقی نے جو کہ ماضی، حال اور مستقبل کی ہر بات کا مکمل طور پر جاننے والا ہے اور اس سے بڑھ کر انسان کا کوئی خیر خواہ نہیں۔ اس مالک الملک اور رحمن و رحیم نے متعین فرما دیئے۔ انسانی حقوق کا جو نقشہ اسلام نے پیش فرمایا، دنیا کا کوئی دوسرا دین پیش کرنے سے قاصر ہے اور نہ ہی قیامت تک کوئی پیش کر سکے گا۔

جب اللہ عالم الغیب لڑکی کے حقوق نظام وراثت کی شکل میں عطا فرماتا ہے اور اس کے لئے باقاعدہ طور پر وقت کا تعین کرتا ہے تو ہم کون ہیں کہ اس قانون کو اپنی مرضی سے تبدیل کر کے اس کا حلیہ بگاڑ لیں اور خالق سے بڑھ کر ہمدردی غم خواری کا ثبوت پیش کرنے کی حماقت کریں؟ اللہ کے قانون اور حدود سے منہ موڑ کر دونوں جہان کی ناکامی و نامرادی ہمارا مقدر بن کے رہ جائے گی بلکہ بن چکی ہے کیونکہ ”حدود اللہ“ نظام وراثت جس کو ہم نے ”نظام جہیز“ میں تبدیل کر لیا ہے، نہ صرف انفرادی طور پر سم قاتل ثابت ہو رہا ہے بلکہ پورے معاشرے کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ اس گندے نظام کا بانی ”ہندو“ اور ہم اس کے پیروکار اس ”نظام جہیز“ کو علی الاعلان بار بار لعنت

کیونکہ اس کے پاس اس لعنت کو پورا کرنے کے لئے وسائل نہیں ہوتے خیرات بھی نہیں مانگ سکتے۔ بیٹی کی عمر ڈھل رہی ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کرے اور کیا نہ کرے بیٹی کے بالوں کی سفیدی ان کے دل کی سیاہی کا سبب بننے لگتی ہے۔ آخر کار معاشرے کے کئی بہترین لوگ اسی معاشرے کے بدترین مجرم بن جاتے ہیں۔

عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ہم فی الواقع خلوص نیت سے کسی برائی کو ختم کرنے کے حق میں ہیں تو اس کے لئے لازمی اصول یہ ہے کہ اس کے اسباب کو ختم کر دیں۔ اگر ایسا نہیں کرتے تو ہم بہت بڑے احمق شمار ہوں گے کیونکہ اس حل کے علاوہ ہم جو کچھ بھی کر لیں بالکل بے کار اور محال تو کیا ناممکن ہے کہ ہم اصلاح معاشرہ میں کامیاب ہو سکیں۔ اس انتہائی ناپاک اور لعنتی نظام ”نظام جہیز“ کی موجودگی میں کسی بھی ملازم سے رشوت نہ لینے کی امید رکھنا سراسر خود فریبی ہے کیونکہ اس شیطانی نظام کی موجودگی میں رشوت اور بے ایمانی اس کے لئے لازمی اور مجبوری بن چکی ہے۔ ایماندار رہنے کی صورت میں تو اسے بے غیرت بننا پڑے گا کیونکہ اس کی بہن بیٹی اس کے گھر بیٹھی کنواری بوڑھیوں کی تعداد میں اضافے کا سبب بن جائے گی۔

تاریخ! ہزاروں لاکھوں کی نیندیں ختم ہو چکی ہیں دن کا سکون بھی نہیں رات کی نیند بھی نہیں یہ شیطانی نظام بے شمار کبیرہ گناہوں کی آٹھویں مشین ہے۔ ہمارے علم میں ایسے واقعات ہیں کہ بعض سفید پوش لوگ اسی پریشانی میں دماغی توازن کھو بیٹھے بعضوں کو دل کے دورے پڑنے لگے۔ لڑکیاں وقت پر شادی نہ ہونے کی وجہ سے فطری تقاضے سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی وقت زنا کا ارتکاب کر بیٹھیں نتیجتاً حمل کی صورت میں یا تو اس نے خودکشی کر لی یا اسے قتل کر دیا گیا۔ چولہا سٹھنے کا بہانہ بنا کر حادثاتی موت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کیا یہ سب

سے آئی ہے جن میں بیٹی کو ترکہ نہیں دیا جاتا۔ جن بد نصیبوں بد بختوں کی وجہ سے نکاح کا فریضہ ایک مسئلہ بن گیا ہے ان میں سب سے بڑا حصہ اسی رسم جہیز کا ہے۔ یہ ایک غیر فطری نظام ہے بلکہ اسے غیر انسانی بھی کہہ دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔

آؤں کر اس لعنتی نظام جہیز کے خلاف جہاد کریں۔ تو لا فلاحاً لعنتی نظام کی مکمل نفی کر کے مالک حقیقی کے نظام (نظام وراثت) کو رواج دیا جائے تاکہ ہم دونوں جہان کی کامیابیوں اور کامرائیوں سے ہمکنار ہو سکیں اور لاکھوں کنواری بوڑھیوں کے نکاح کے وقت پر ہو سکیں اور لاکھوں انسان جو اسی گندگی کی وجہ سے بچیوں کے نکاح کے بارے میں ہر وقت غمزدہ پریشان رہتے ہیں وہ سکھ کا سانس لے سکیں۔ بچی پیدا ہونے پر اہل خانہ ماتم زدہ نہ ہوں بلکہ اللہ کی رحمت سمجھ کر بچی کی پیدائش کو بھی مبارک ہی خیال کریں۔ کوئی ملازم رشوت لینے پر مجبور نہ ہو ہزاروں لوگ اسی بنا پر خیرات مانگنے کی لعنت مول لینے سے محفوظ ہو جائیں۔ چولہا سٹھنے کے بہانے معصوم لڑکیوں کے قتل و خودکشی کے واقعات از خود ختم ہو جائیں۔ مجبور لوگ سودی قرضوں سے بچ جائیں زنا کے مواقع خود بخود ختم ہونے لگیں۔ چوری اور ڈاکہ لوگوں کی مجبوری نہ رہے۔ دکانداروں، تاجروں کو کم تولنے، ملاوٹ کرنے، ذخیرہ اندوزی سے بچنا آسان ہو جائے۔ انسان درندہ بننے پر مجبور نہ ہو جائے۔

یاد رکھئے! کوئی انسان پیدا کئی مجرم نہیں ہوتا اس کا ماحول اس کا معاشرہ اس کی مجبوریاں اسے مجرم بنا دیتی ہیں اور یہ جہیز والی (جگا ٹیکس) مجبوری تو ایسی ہے کہ یہاں آ کر ہر ایک کی عقل و حواس جواب دے جاتے ہیں۔ مذہبی لوگوں کا مذہب ایک بے جان لاشہ رہ جاتا ہے۔ روح مردہ ہو جاتی ہے کئی سفید پوش لوگ (متوسط طبقہ) اسی سلسلے میں سوچ سوچ کر نیم پاگل ہو جاتے ہیں

گئیں، وہاں پر کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ نہ پڑھنے میں نہ سننے میں۔ آخر ایسا کیوں؟ کیا نعوذ باللہ نا انصافی ہوئی؟ نہیں قطعاً ایسا نہیں حقیقت یہ ہے نبیؐ نے نہ وہاں کچھ دیا نہ یہاں کچھ دیا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا لہذا حسب حیثیت داماد سے ہی پورا کروا کر اس لعنتی نظام کی جڑ کاٹ دی تاکہ قیامت تک اس گندے نظام کے لئے کوئی جواز نہ نکل سکے۔ لڑکی کا وجود رحمت ہی رہے زحمت نہ بن سکے۔

حقائق کو سمجھنے کے بعد اس گندے اور ناپاک نظام کے خلاف فی الفور جہاد کے لئے تیار ہو جائیے ورنہ اس لعنتی نظام کی بنیاد پر قیامت تک ہونے والے تمام جرائم کے سلسلے میں اللہ مالک الملک کی عدالت میں جواب دہی کے لئے تیار رہئے۔

انتہائی قریبی رشتہ دار ماں باپ، بہن بھائی، بیٹا، بیوی، دوست بے جان لاشوں کو مستقل قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ان سے جلد فراغت میں ہی عافیت سمجھی جاتی ہے۔ کہیں یہ بے جان لاش پھٹ کر سارے ماحول کو بدبودار اور ناپاک نہ کر دے۔ ہم کتنے نالائق اور احمق ہیں اللہ کی بارگاہ اقدس میں بدبودار لاش پیش کر کے کامیاب ہو کا مران ہونے کی غلط فہمی میں ہیں۔ کوئی بے چارہ عشق رسولؐ کے دعوے سے سرور مطمئن نظر آتا ہے اور حال یہ ہے کہ ہم سنت نبویؐ سے ہٹ کر سنت ہندو (نظام جہیز) کو اپنا کر کھلم کھلا اپنے دعویٰ عشق کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اپنے قول کی اپنے ہی فعل سے تکذیب کر رہے ہیں حالانکہ اللہ مالک نے اپنی کتاب قرآن مجید میں قسم کے انداز میں اعلان فرمایا ہے کہ اللہ کا رسولؐ تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

اسلام میں وراثت ہے جہیز نہیں۔



حقائق نہیں ہیں؟ اس سب کے باوجود ہم کتنے ظالم اور بے رحم بن چکے ہیں کہ ابھی تک اس گندے نظام کی سرپرستی کر کے مجبور انسانوں کے سروں پر بوجھ اور گردنوں میں طوق قائم رکھنے کی کوشش میں ہیں۔

اس لعنتی نظام کے نتیجے میں انسانیت پس رہی ہے لوگ ان دیکھی آگ میں رات دن جل رہے ہیں۔ اب تو لوگ اس لعنتی نظام کو پورا کرنے کے لئے اپنے گردے بچنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ کیا کیا تحریر کروں۔ اس بنیاد پر عصمتوں کے سودے بھی ہو رہے ہیں۔ اس گندے نظام کی غلطیتیں اور ناپائیداریاں ان گنت اور ناقابل بیان ہیں۔ کاش کہ ہر مسلک کے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہنے والوں کے علماء حضرات اس سلسلے میں فوری توجہ فرمائیں اور اس لعنتی نظام ”نظام جہیز“ کی قولاً فعلاً مکمل نفی فرمادیں تاکہ قوم سکھ کا سانس لے سکے اور عوام الناس کو زندگی مل جائے۔

اس ظالمانہ نظام کی موجودگی میں تو لوگ مردہ سے بھی بدتر ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کو چند چیزیں جہیز میں دی تھیں؟ اور اللہ کے بندو! جس عمل کو اُمت کی اکثریت علی الاعلان لعنت تسلیم کر رہی ہے کیا وہ عمل سنت نبویؐ ہو سکتا ہے؟ کیا وہ ہستی جو جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجی گئی اس عظیم ترین ہستی سے کوئی ایسا کام ہونا ممکن ہے؟ اس کو سنت نبویؐ تصور کرنا عظیم ترین گستاخی رسولؐ نہیں؟ کہیں ہم اس لعنتی نظام کو سنت نبویؐ کہہ کر سلمان رشدی سے آگے تو نہیں نکل گئے؟ انجانے میں ہم کیا کچھ کہہ گئے؟ سوچئے اس سے پہلے کہ سوچنے کا وقت ختم ہو جائے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زرہ بکوا کر کچھ چیزیں پوری کر دوائی تھیں۔ آپؐ کی دوسری بیٹیوں ام کلثومؓ، اور رقیہؓ جو کہ یکے بعد دیگرے جناب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں

اے قادر مطلق مجھے دستِ شفاء دے
میں جس کو دوا دوں تو اس کو شفاء دے

دستِ شفاء

دانتوں کے امراض اور ہومیو پیتھ علاج

ڈاکٹر رانا محمد اقبال ● ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (D.H.Ms)

● (گولڈ میڈلسٹ) ● ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب

● ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن ● 0321-7612717

● شعبہ طب و نفسیات

نوٹ:- مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں۔ رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں۔ تمام مریضوں سے گزارش ہے کہ وقت لے کر آئیں۔

(2) میں نے صبح شام یہ یہ ادویات کھانی ہیں لہذا صبح شام ایک گلاس دودھ لازمی ہے۔

(3) ہمیں رات کو پیاس تک کرتی ہے اس لئے ایک لڑکا جب گلاس لے کر رات کو ہمارے پاس سوئے۔

(4) ڈاکٹر نے بڑا گوشت منع کیا ہے اس لئے بکرے کا گوشت پکائیں۔

مزید یہ کہ وہ ساری رات نکھانس نکھانس کر (بوجھ

حقہ نوشی) نہ خود سوتے نہ ہی ہمیں سونے دیتے اور

ذہین اتنے کہ نہ تو یہ سوچنا کہ یہ گزرا کیسے کریں گے

اور کس کے گھر جا کر واپسی کا نام بھی نہیں لینا اور ہر وقت

تک بھی کرنا۔ بہر حال یہ مشکل وقت بھی کسی نہ کسی طرح

کٹ ہی گیا۔ مزید بات یہ ہے کہ ان رشتہ داروں کو

ہم نہ پہلے اچھی طرح جانتے تھے اور نہ ہی بعد میں ساری

زندگی ان کی شکلیں نظر آئیں کہ ہم ان سے کوئی حساب

کتاب ہی کر سکتے۔

جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو فیصل آباد کے ایک چھوٹے سے علاقے حاجی آباد میں قیام

پذیر تھے اور یہ علاقہ اس وقت نہایت ہی اجاز اور ویران

تھا مگر اب اتنے عرصے کے بعد گنجان آباد ہو گیا ہے۔

شاید لوگ یقین ہی نہ کریں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ

یہاں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ہوا کرتے تھے جو کہ

آندھی کے ساتھ اپنی Shape بدلتے رہتے تھے اور

جب آندھی آتی تو کچھ نظر نہ آتا۔

بہر حال اس وقت مہمان نوازی کا دور تھا اور

ہمارے ہاں بھی نہ جانے کہاں کہاں سے مہمان ہمارا پتہ

پوچھ کر آ جاتے اور پھر واپس جانے کا نام ہی نہ لیتے۔

گویا کہ دنیا میں ان کے لئے کوئی کام کاج نہ تھا۔

بہر حال جو بھی تھا ہم ان کو بھٹکا رہے تھے اور مصیبت یہ

تھی کہ ان کی شرطیں بھی بڑی عجیب ہوتیں مثلاً

(1) آج سے گھر میں مونگی کی دال نہ پکے گی۔

(3) کلکیر یا فلور/سلف 6 یا 12، اگر کسی صاحب نے کوئی تفصیل پوچھنی ہو تو میرے نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ میں یہاں ایک منجن کا فارموا لکھ رہا ہوں جو کہ ان امراض کے لئے بہت مفید پایا گیا ہے اور بہت سادہ، آسانی ملنے والے اجزاء پر مشتمل ہے۔

(1) لمبوں کے خشک کئے ہوئے پھل 20 ہرہر پیس لیں۔

(2) پس ہوئی دارچینی 50 گرام

(3) سادہ نمک 20 گرام پس ہوا۔

سب کو ملا کر ایک بوتل میں محفوظ کر لیں۔ کھانے کے بعد بلا کریش کریں۔ اس کے بعد ایک چٹکی منجن لے کر نیم گرم پانی کے ساتھ دانتوں پر لگائی جائے۔ پندرہ منٹ کے بعد کلی کر لیں۔ پھر اس منجن کا کرشمہ ملاحظہ کریں۔

(3) دانتوں کا گلنا سڑنا: خوراک کی کمی سے جراثیمی

قسم کی انفیکشن سے یا ادویات کے Re-Action

سے دانت کی ہڈی گلنے سڑنے لگتی ہے اور بالآخر دانت

ہلنے لگتے ہیں اور گل کر مٹ دانتوں سے خالی ہو جاتا

ہے۔ مریض کو کچھ کھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوئی چیز چبانا

مشکل ہو جاتا ہے۔ جب ہم بچپن میں تھے تو میوے

بوزھوں کی دو باتیں دیکھ کر بڑے حیران ہوتے کہ

شربت سے ان کی تواضع کی جاتی تو برف کو کھال کسز دور

پھینک دیتے۔ ہم سوچتے کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ صرف تو

کھانے والی چیز ہے پھر یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ حیران

جب وہ روٹی کھانے لگتے تو جیسی روٹی لیتے اس کے

ٹکڑے کر کے شوربے میں ڈال دیتے پھر پیچ سے سٹیکال

کر کھاتے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے کہ ہم تو مسخ

اکڑی ہوئی روٹی کھاتے ہیں اور یہ کیا کرتے ہیں۔ اب

وقت کے ساتھ سمجھ آئی ہے کہ چونکہ ان بے چاروں کے

بہر حال بات کہاں کی کہاں چلی گئی لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسی نامعقول ہستیاں اب بھی خاصی تعداد میں دنیا میں موجود ہوں گی۔ آپ آسانی کی خاطر انہیں Parasite کہہ سکتے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں کہ دانت اچھے تو صحت اچھی۔ دیے تو میرا وسیع تجربہ بتاتا ہے کہ کوئی بھی مرض اچھی نہیں ہوتی مگر دانت کا درد تو انسان کو بے حال کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دانت کا درد تو پہلو انوں کو بھی پچھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔

اب ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں، وہ ہے دانتوں کی امراض۔ بڑی امراض عمومی طور پر یہ ہیں۔

(1) دانتوں کا ٹیڑھا اگنا یا بد وضع

Deshaipe ہوتا

یہ مرض جسم میں موروثی طور پر ہوتی ہے یا حفاظتی انجکشن کے سائید لافلیٹ کے طور پر نمودار ہوتی ہیں اور ان کا علاج آسان نہیں۔ بہر حال ایک ایکسپٹ ہو میو پیٹھک ڈاکٹر ہی اس مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ باقی Brazeer وغیرہ دقتی حل ہیں۔

(2) دانتوں سے خون آنا اور کیڑا لگنا

(Pyorea)

اس میں دانتوں سے خون آتا ہے اور دانت حساس ہو جاتے ہیں۔ پھر ہلنے لگتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں۔ اگر چہ بسوں ویکوں میں بے شمار منجن اور ادویات لگانے کے لئے ملتی ہیں مگر شاید ہی کوئی دوا effective موثر ہوتی ہو۔ تاہم ہو میو پیٹھک میں اس کا نہایت موثر علاج موجود ہے۔ میں یہاں پر چند ادویات لکھ رہا ہوں حسب علامات استعمال کر سکتے ہیں۔ (1) فاسفورس 6 یا 30، (2) ہائیڈروجن 6 یا 30،

واپس کام نہیں کرتے اس لئے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔
 بہر حال ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو ایسے
 برے حالات سے بچائے۔ آمین! اب میں آپ لوگوں کو ان حالات سے بچنے کی
 ترکیب بتاتا ہوں۔
 (1) دانتوں کی ہر وقت صفائی رکھیں۔
 (2) پان، سگریٹ اور دیگر ایسی فضولیات سے دور رہیں۔
 (3) Cola ٹائپ بوتلیں و مشروبات بھی اس
 مرض کو پیدا کرنے اور بڑھانے میں مددگار ہوتی ہیں۔
 ان سے بھی دور رہیں۔
 (4) پارے کے مرکبات اور کیلول اور کلورین جن
 ادویات یا کھانے والی اشیاء میں پڑتے ہوں ان سے
 اجتناب کریں۔
 (5) جن اشخاص کے والدین یا بہن بھائی انتہائی

کے امراض میں مبتلا ہوں وہ باقاعدگی سے صفائی کریں
 اور دانتوں کے کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک کراتے رہیں۔
 (6) کسی مناسب ماٹھ واش کا انتظام کریں۔
 (7) اگر دانتوں میں خلا یا کھوڑ ہو تو اچھی طرح
 فلنگ کرائیں۔ سخت چیز نہ کھائیں۔ زیادہ ٹھنڈی یا گرم
 اشیاء سے پرہیز کریں۔
 (8) ہومیوپیتھک علاج میں زیادہ استعمال ہونے
 والی ادویات میں کالی سلف، کالی آئیوڈائیڈ، مرک سال،
 میڈوسٹیم تھو جا وغیرہ شامل ہیں۔
 (9) اگر دانت جلد نہ اگتے ہوں تو کلکیر یا فلور 6x
 یا 12x ایک اہم دوا ہے۔
 ان احتیاطوں کے باوجود بھی اگر کوئی مسئلہ ہو تو
 ”دست شفاء“ شعبہ طب و نفسیات ماہنامہ ”حکایت“
 سے مشورہ کر سکتے ہیں۔

معروف قلم کار محمد رضوان قیوم کی منفرد سچی کہانیوں کا نیا مجموعہ

دُکھ بولتے ہیں

اشاعت کے مراحل میں ہے۔ آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرائیں۔ قیمت :-/250 روپے

ملنے کے پتے

ورائٹی بک سٹال

کامل سٹیشنرز اینڈ گفٹ سینٹر

صدر بازار، بینک روڈ - راولپنڈی

D بلاک، سیٹلائٹ ٹاؤن - کراچی

0301-5123961

مرزا کلام احمد قادیانی اور قادیانیت

مرزا کے کاذب ہونے پر اس کی تحریروں میں اختلاف کو دیکھ کر عام معمولی عقل والا آدمی بھی سمجھ رکھتا ہے کہ اس قسم کا آدمی کسی خدائی عہدے کے لائق نہیں ہو سکتا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

0314-4652230

☆ محمد افضل رحمانی

اسی طرح اس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے خدا کا کلام یقین کرتا ہوں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ 220 مندرجہ روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 220)

☆..... جس روز وہ الہام مذکورہ بالا جس میں قادیان میں نازل ہونے کا ذکر ہے ہوا تھا اس روز کشفی طور پر میں نے دیکھا کہ میرے بھائی صاحب مرحوم غلام قادر میرے قریب بیٹھ کر بلند آواز سے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور پڑھتے پڑھتے انہوں نے ان فقرات کو

قرآن وحدیث کی توہین

قرآن شریف خدا کی کتاب اور میرے منہ کی باتیں ہیں۔ (تذکرہ صفحہ 77 طبع چہارم)

☆..... میں خدا کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں ان الہامات پر اس طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر اور جس طرح میں قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام جانتا ہوں

(صفحہ 502)

☆..... پس وہ جو میری جماعت میں داخل ہوا درحقیقت میرے سردار خیر المرسلین کے صحابہ میں داخل ہوا۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ 71 مندرجہ روحانی خزائن جلد 16 صفحہ 258)

☆..... میں وہی مہدی ہوں جس کی نسبت ابن سیرین سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ ابو بکرؓ کے درجے پر ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ابو بکرؓ کو کیا بعض انبیاء سے بہتر ہے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 396 طبع چہارم)

☆..... پرانی خلافت کا جھگڑا چھوڑو، اب نئی خلافت لو ایک زندہ علی تم میں موجود ہے اس کو چھوڑتے ہو اور مردہ علی کو تلاش کرتے ہو۔

(ملفوظات مرزا جلد اوّل صفحہ 400 طبع چہارم)

☆..... میرا شکر کرٹو نے میری خدمت کو پایا یہ ایک بشارت کئی سال پہلے اس نکاح کی طرف تھی جو سادات کے گھر دہلی میں ہوا جس سے بفضلہ تعالیٰ چار لڑکے پیدا ہوئے۔ (نزول المسیح صفحہ 146 مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 524)

☆..... کر بلائے است سیر ہر آنم۔ صد حسین است در گریبانم

ترجمہ: میری سیر ہر وقت کر بلا میں ہے سو (۱۰۰) حسین ہر وقت میری جیب میں ہیں۔

☆..... اور انہوں نے کہا کہ اس شخص (مرزا) نے امام حسنؑ اور حسینؑ سے اپنے تئیں اچھا سمجھا میں کہتا ہوں ہاں میرا خدا عنقریب ظاہر کر دے گا۔

(اعجاز احمدی صفحہ 52)

☆..... بعض نادان صحابہ جن کو درایت سے کچھ حصہ نہ تھا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم مندرجہ روحانی خزائن جلد 21 صفحہ 285)

☆..... جیسا کہ ابو ہریرہؓ جو غبی تھا اور دارایت

بڑھا انا از لہ قریباً من القادیان تو میں نے سن کر بہت تعجب کیا کہ کیا قرآن شریف میں قادیان کا نام بھی لکھا ہوا ہے تب انہوں نے کہا کہ یہ دیکھو لکھا ہوا ہے۔ تب میں نے نظر ڈال کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ فی الحقیقت قرآن شریف کے دائیں صفحہ پر شاید قریب نصف کے موقع پر یہ الہامی عبارت لکھی ہوئی موجود ہے۔ تب میں نے اپنے دل میں کہا کہ واقع طور پر قادیان کا نام قرآن شریف میں درج ہے اور میں نے کہا کہ تین شہروں کا نام اعزاز کے ساتھ قرآن شریف میں درج کیا گیا ہے کہ، مدینہ اور قادیان۔ (ازالہ اوہام صفحہ 76، 77 مندرجہ روحانی خزائن جلد 3 صفحہ 140)

☆..... اور ہم اس جواب میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ میرے اس دعویٰ کی حدیث بنیاد نہیں بلکہ قرآن اور وہ وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی۔ ہاں تائیدی طور پر ہم وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ (اعجاز احمدی صفحہ 36 مندرجہ روحانی خزائن جلد 19 صفحہ 140)

☆..... اور جو شخص حکم ہو کر آیا ہو اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار سے چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔ (تحفہ گلزدہ صفحہ 15 مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 81)

توہین صحابہؓ

☆..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والی قوم میں ایک نبی ہو گا وہ آنحضرتؐ کا بیرون ہو گا اس لئے اس کے اصحاب آنحضرتؐ کے اصحاب کہلائیں گے۔

(تہذیب حقیقۃ الوحی صفحہ 68 مندرجہ روحانی خزائن جلد 22)

جاتے ہیں مگر اس جگہ (قادیان میں آنا) نقلی حج سے ثواب زیادہ ہے اور غافل رہتے ہیں نقصان اور خطرہ کیونکہ سلسلہ آسمانی ہے اور حکم ربانی۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ 352 مندرجہ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 352)

☆..... مرزا قادیان کی زمین کو ارض حرم قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

خدا کا ہم پہ بس لطف و کرم ہے
وہ نعمت کون سی باقی جو کم ہے
زمین قادیان اب محترم ہے
ہجوم خلق سے ارض حرم ہے
(درشین اردو صفحہ 56)

☆..... قادیان تمام بستیوں کی ام (ماں) ہے
پس جو قادیان سے تعلق نہیں رکھے گا وہ کاٹا جائے گا۔ تم
ڈرو کہ تم میں سے نہ کوئی کاٹا جاوے۔ پھر یہ تازہ دودھ
کب تک رہے گا۔ آخر ماؤں کا دودھ بھی سوکھ جایا کرتا
ہے کیا مکہ اور مدینہ کی چھاتیوں سے یہ دودھ سوکھ گیا کہ
نہیں۔ (حقیقۃ الرء یا صفحہ 46 بحوالہ محمدیہ پبلیکیشنز
صفحہ 359)

☆..... ہمارا سالانہ جلسہ ایک قسم کا ظلی حج ہے۔
(الفضل یکم دسمبر 1932)
☆..... ہمارا جلسہ بھی حج کی طرح ہے خدا تعالیٰ
نے قادیان کو اس کام (حج) کے لئے مقرر کیا ہے۔
(مکمل از برکات خلافت صفحہ 5 حوالہ مذکور صفحہ ایضاً)
مرزا قادیانی اپنے کردار کے آئینے میں۔

مرزا کا تھیر جانے کا اعتراف

مفتی محمد صادق جو مرزا کی زندگی میں مرزائیوں
کا مفتی تھا اپنی کتاب ”ذکر حبیب“ میں لکھتے ہیں کہ ایک
شب دس بجے کے قریب میں تھیر میں چلا گیا جو مکان

ابھی نہیں رکھتا تھا۔ (اعجاز احمدی صفحہ 18 مندرجہ روحانی
خزائن جلد 19 صفحہ 127)
☆..... جو شخص قرآن پر ایمان لاتا ہے اسے
چاہئے کہ ابو ہریرہ کے قول کو ردی متاع کی طرح پھینک
دے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ 610 مندرجہ
روحانی خزائن جلد 21 صفحہ 127)

توہین حرمین شریفین

☆..... مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود (مرزا
صاحب) کی مسجد ہے جو قادیان میں واقع ہے۔ جس کی
نسبت براہین احمدیہ میں خدا کا کلام یہ ہے۔ مبارک و
مبارک کل امر سیارک تجمل فیہ اور یہ مبارک کالفظ جو بہ
صیغہ مفعول اور فاعل واقع ہوا ہے قرآن شریف کی آیت
یا رکنا حوله کے مطابق ہے پس کچھ شک نہیں جو قرآن
شریف میں قادیان کا ذکر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
سبحان الذی اسریٰ تا جولد۔ (خطبہ الہامیہ حاشیہ صفحہ 21
مندرجہ روحانی خزائن جلد 16 صفحہ 25)
☆..... عربی عبارت کا اردو ترجمہ: یعنی مسجد اقصیٰ
سے مراد وہ مسجد ہے جسے قادیان میں مسیح موعود نے بنایا
(خطبہ الہامیہ حاشیہ صفحہ 25 مندرجہ روحانی خزائن جلد
16 صفحہ 26)

☆..... معراج میں جو آنحضرت مسجد حرام سے
مسجد اقصیٰ تک سیر فرما ہوئے وہ مسجد اقصیٰ وہی ہے جو
قادیان میں بجانب مشرق واقع ہے جس کا نام خدا کے
کلام نے مبارک رکھا ہے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ 22
مندرجہ روحانی خزائن جلد 16 صفحہ 22)

☆..... اس مسجد مبارک کے لئے پانچ دفعہ الہام
ہوا ہے منجملہ ان کے ایک عظیم الشان الہام ہے۔ فیہ برکاتو
من وظلہ کان امن۔ (تذکرہ صفحہ 83 طبع چہارم)
☆..... لوگ معمولی اور نقلی طور پر حج کرنے کو

عشاء کی نماز سے لے کر صبح کی اذان تک مجھے ساری رات خدمت کرنے کا موقع ملا۔ پھر بھی اس حالت میں مجھ کو نہ نیند نہ غنودگی اور نہ تھکان و تکلیف محسوس ہوئی بلکہ خوشی اور سرور پیدا ہوتا تھا۔ اس طرح جب مبارک احمد صاحب بیمار ہوئے تو مجھ کو ان کی خدمت کے لئے بھی اسی طرح راتیں گزارنی پڑیں تو حضور نے فرمایا کہ زینب اس قدر خدمت کرتی ہے کہ ہمیں اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور آپ کئی دفعہ اپنا تبرک مجھ کو دیا کرتے تھے۔ (سیرت المہدی جلد اول صفحہ 789 روایت نمبر 910 طبع چہارم)

پلنگ کی پٹی یا ٹانگیں

ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت ام المومنین (مرزا صاحب کی بیوی) نے ایک دن سنایا کہ حضرت صاحب کے ہاں ایک بوڑھی ملازمہ مسماۃ بھانو تھی۔ ایک رات جبکہ خوب سردی پڑ رہی تھی، حضور کو دبانے بیٹھی چونکہ وہ لحاف کے اوپر سے دہائی تھی اس لئے اسے یہ پتہ نہ لگا کہ جس چیز کو میں دبا رہی ہوں وہ حضور کی ٹانگیں نہیں بلکہ پلنگ کی پٹی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت صاحب نے فرمایا بھانو آج بڑی سردی ہے۔ بھانو کہنے لگی۔ ”ہاں جی تدے تے تہاڑی لتاں لکڑی وانگوں ہویاں ہو یاں ایں“ یعنی جی ہاں جی تو آپ کی ٹانگیں لکڑی کی کی طرح سخت ہو رہی ہیں۔ (سیرت المہدی صفحہ 722 جلد اول روایت نمبر 780 طبع چہارم)

رحم میں درد

برکت بی بی صلیبہ الہیہ حکیم مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم سائنس ٹیوٹری نے بواسطہ لجنہ اماء اللہ قادیان بذریعہ تحریر بیان کیا ہے کہ ایک دن آپ لیٹے

کے قریب ہی تھا اور تماشا ختم ہونے پر دو بجے رات کو واپس آیا۔ صبح مفتی ظفر صاحب بنے میری عدم موجودگی کی حضرت صاحب کے پاس شکایت کی کہ مفتی صاحب رات کو تھیز چلے گئے تھے حضرت صاحب نے فرمایا ایک دفعہ ہم بھی گئے تھے۔

ایک عورت کا ننگا غسل

یہی مفتی محمد صادق لکھتا ہے کہ حضرت صبح موعود کے اندرون خانہ ایک نیم دیوانی سی عورت بطور خادمہ رہا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے کیا حرکت کی کہ جس کمرے میں حضرت صاحب بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے وہاں ایک کونے میں کھرا تھا جس کے پاس پانی کے گھڑے رکھے تھے، وہاں اپنے کپڑے اتار کر اور ننگی بیٹھ کر نہانے لگی۔ حضرت صاحب اپنے کام تحریر میں مصروف تھے اور کچھ خیال نہ کیا کہ وہ کیا کرتی ہے جب وہ نہا چکی تو ایک اور خادمہ اتفاقاً آنکلی اس نے اس نیم دیوانی کو ملامت کی کہ حضرت صاحب کے کمرے میں اور موجودگی کے وقت ٹوٹنے یہ کیا حرکت کی تو اس نے ہنس کر جواب دیا ”انہوں کچہ دیدا ہے“ یعنی اسے کیا دکھائی دیتا ہے۔ (ذکر حبیب از مفتی صادق صفحہ 38)

جوان لڑکی سے پنکھا جھلانا

ڈاکٹر سید عبدالستار شاہ نے مجھ سے بذریعہ تحریر بیان کیا ہے کہ مجھ سے میری لڑکی زینب بیگم نے بیان کیا کہ میں تین ماہ کے قریب حضرت اقدس کی خدمت میں رہی ہوں۔ گرمیوں میں پنکھا وغیرہ اور اس طرح کی خدمت کرتی تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ نصف رات یا اس سے زیادہ مجھ کو پنکھا ہلاتے گزر جاتی تھی۔ مجھ کو اس اثنا میں کسی قسم کی تھکان و تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ خوشی سے دل بھر جاتا تھا۔ دو دفعہ ایسا موقع ہاتھ آیا کہ

آ جاؤ لڑکیو! تم بھی بیٹھ جاؤ

محترمہ رسول بی بی صاحبہ اہلیہ حافظ حامد علی صاحب نے بذریعہ تحریر بیان کیا کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عورت سونے کا زیور پہن کر آئی تو جس پلنگ پر حضرت ام المومنین اور حضور بیٹھے تھے آ کر بیٹھ گئی۔ ہم لڑکیاں دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ ہم نے کہا اگر ہمیں بھی سونے کی بالیاں اور کڑے وغیرہ ملتے تو ہم بھی حضور کے پلنگ پر بیٹھتیں۔ ام المومنین نے حضور کو بتا دیا کہ یہ لڑکیاں ایسا کہہ رہی ہیں۔ حضور ہنس پڑے اور فرمایا کہ آ جاؤ لڑکیو تم بھی بیٹھ جاؤ۔ (سیرت المہدی جلد دوم صفحہ 292 روایت نمبر 1524 طبع چہارم)

زمانی بیگم کے لئے الہام

محترمہ عصمت بیگم صاحبہ عرفہ زمانی اہلیہ حکیم محمد زماں صاحب نے بواسطہ مکرمہ محترمہ مراد خاتون صاحبہ والدہ خلیفہ صلاح الدین صاحب بذریعہ تحریر بیان کیا کہ ایک روز حضور علیہ السلام سوائے تھے اور میں پیر کی طرف بیٹھ کر آہستہ آہستہ پیر دبار رہی تھی حضور کے پیر مبارک کا انگوٹھا مل رہا تھا اتنے میں اماں جان آئیں اور حضور کو آواز دی کہ سنتے ہو، سنتے ہو، حضور کی آنکھ کھل گئی۔ حضور نے فرمایا کہ ”تم نے مجھے جگا دیا الہام ہو رہا تھا کیا پتہ کہ زمانی کے لئے ہو رہا تھا اس کا بھلا ہو جاتا۔“ (سیرت المہدی جلد دوم صفحہ 285 روایت نمبر 1508 طبع چہارم)

میں ایسے پردے کا قائل نہیں ہوں

بیان کیا حضرت مولوی نور الدین صاحب خلیفہ اول نے کہ ایک دفعہ حضرت مسیح موعودؑ کی سفر میں تھے۔ سنیشن پر پہنچے تو ابھی گاڑی آنے میں دیر تھی۔ آپ بیوی

ہوئے تھے اور میں پیر دبار رہی تھی کئی طرح کے پھل، لپچاں، کیلے، انجیر اور خربوزوں میں سے آپ نے مجھے بہت سے دیئے۔ میں نے انہیں بہت سنبھال کر رکھا کہ یہ بابرکت پھل ہیں ان کو میں گھر لے جاؤں گی تاکہ سب کو تھوڑا تھوڑا بطور تبرک کے دوں۔ جب میں جانے لگی تو حضور نے فرمایا کہ برکت کو دوائی پر غم دے دو اس کے رحم میں درو ہے (ایک سٹرکیٹ والی برنم لیکچر ایک دوائی رحم کی اصلاح کے واسطے ہوتی ہے) یہ مجھے یاد نہیں کہ کس نے دوا لا کر دی۔ حضور نے دس قطرے ڈال کر بتایا کہ دس قطرے روز صبح پیا کرو۔ میں گھر جا کر پیتی رہی پینے کے بعد مجھے حمل ہو گیا تھا جس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ اور دو عورتیں بیٹھی ہیں کہ مجھے حیض آ گیا میں گھبرائی اور تعبیر نامہ دیکھا اس میں یہ تعبیر لکھی تھی کہ جو عورت اپنے آپ کو حائضہ دیکھے وہ کوئی گناہ کرتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا میں نفل پڑھتی اور توبہ استغفار کرتی اور خدا سے عرض کرتی یا اللہ مجھ سے کون سا گناہ ہوا ہے یا ہونے والا ہے تو مجھے اپنے فضل سے بچا اور قادیان آئی حضور کے پاؤں دبار رہی تھی کہ میں نے عرض کی کہ مجھے ایک ایسی خواب آئی ہے جس کو میں حضور کی خدمت میں پیش کرنے سے شرم محسوس کرتی ہوں حالانکہ نہیں آئی چاہئے کیونکہ حضور تو خدا کے بھیجے ہوئے ہیں، آپ سے عرض نہ کروں تو کس کے آگے بیان کروں گی پھر میں نے حضور کے آگے وہ خواب بیان کی۔ حضور نے فرمایا۔ کتاب جو سامنے رکھی ہوئی ہے اٹھا لاؤ۔ میں لے آئی آپ نے کتاب کھول کر دیکھا اور بتایا کہ جو عورت ایسا خواب دیکھے تو اگر حاملہ ہے تو لڑکا پیدا ہو گا اور اگر حاملہ نہیں تو حمل ہو جائے گا۔ میں نے عرض کی کہ مجھے حضور کی دوا اور دعا سے حمل ہے۔ آپ نے فرمایا ان شاء اللہ لڑکا پیدا ہو گا۔ (سیرت المہدی جلد دوم صفحہ 214 روایت نمبر 51 طبع چہارم)

بھری نظروں سے عرض کیا۔ حضور مجھ پر قیامت بیت گئی، بہر حال جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا۔ آپ میری متاثرہ بیٹی کو اپنی زوجیت میں لے لیں تو مجھ پر احسان عظیم کے علاوہ اس حادثہ کا بھی کچھ نہ کچھ ازالہ ہو جائے گا۔ تو مرزا محمود بھڑک اٹھے اور انہیں کمین ہونے کا طعنہ دیا اور شادی سے بھی صاف انکار کر دیا۔ خاموشی کے ایک مختصر واقعے کے بعد جلال الدین شمس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ حضور کم از کم اپنے آدمیوں کو تو سمجھا دیں تاکہ میرے گھر والوں کے ساتھ ایسا واقعہ دوبارہ پیش نہ آوے۔ میاں صاحب نے بڑے درشت لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے میں اپنے گھوڑوں سے کہہ دوں گا لیکن تم بھی اپنی کھوتیاں باندھ کر رکھو۔

مرزا محمود احمد کا ایک کشف

ایک دفعہ خواب میں ہی مجھ پر ایک رعشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور میں کہتا ہوں میں وہ ہوں جس کے لئے انیس سو سال سے کنواریاں اس سمندر کے کنارے پر انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ نوجوان عورتیں جو سات یا نو ہیں، جن کے لباس صاف تھرے ہیں دوزخی ہوئی میری طرف آتی ہیں ان میں سے بعض ”برکت“ حاصل کرنے کے لئے میرے جسم پر ہاتھ پھیرتی ہیں۔ (روزنامہ الفضل 15 جنوری 1944ء بحوالہ قادیانی راسپونڈیوں کے عبرتناک انجام صفحہ 154)

جس نبی اور خلفاء کی یہ حالت ہوگی اس امت کی حالت کا اندازہ خود فرمالیں۔ ہم اگر کچھ کہیں گے تو شکایت ہوگی۔

مرزا کے اختلافات

مرزا کے کاذب ہونے پر اس کی تحریروں میں اختلاف کو دیکھ کر عام معمولی مثل والی آدمی بھی سمجھ رکھتا

کے ساتھ ٹھہرنے لگے یہ دیکھ کر مولوی عبدالکریم صاحب جن کی طبیعت غیور اور جوشیلی تھی۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بہت لوگ اور پھر غیر، ادھر ادھر پھرتے ہیں آپ حضرت صاحب سے عرض کریں کہ بیوی صلبہ کو کہیں الگ بٹھا دیا جائے۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ میں نے کہا میں تو نہیں کہتا۔ آپ کہہ کر دیکھ لیں۔ ناچار مولوی عبدالکریم صاحب خود حضرت صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ حضور لوگ بہت ہیں بیوی صلبہ کو الگ ایک جگہ بٹھا دیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا۔ جاؤ جی میں ایسے پردے کا قائل نہیں ہوں۔ مولوی صاحب فرماتے تھے اس کے بعد مولوی عبدالکریم سر نیچے ڈالے میری طرف آئے، میں نے کہا مولوی صاحب جواب لے آئے۔ (سیرت المہدی جلد اول صفحہ 56 روایت نمبر 77 طبع چہارم)

شاہد مرزا کی شریعت میں ایسا جائز ہو جبکہ آپ تہذیب وغیرہ بھی دیکھ لیا کرتے تھے اور جوان عورتوں سے پاؤں دباؤنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ آئے۔ مزید حوالہ جات ذرا اوٹ پٹانگ قسم کے ہیں لہذا انہیں چھوڑ رہا ہوں۔ شرافت کا دامن چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ البتہ جو میں نے دیکھا ہے آپ دیکھ لیں تو سر پٹ کر رہ جائیں۔

مرزا کے بیٹے اور قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا محمود احمد اپنے چند دوستوں کے ہمراہ مشہور و معروف قادیانی مبلغ جلال الدین شمس کی بیٹی سے ملوث ہو گئے یہ جولائی 1923ء کا واقعہ ہے۔ جناب شمس صاحب قادیانی جماعت کی طرف سے امریکہ کے مشہور شہر شکاگو میں بحیثیت قادیانی مبلغ کام کر رہے تھے۔ انہیں اس جانکاہ حادثے کی خبر پہنچی تو ستمبر 1923ء کو واپس قادیان آئے اور اس واقعہ کی شکایت لے کر مرزا محمود کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور بڑی لجاجت اور امید

اظہار غیب ہے۔ (اشتہار ایک غلطی کا ازالہ صفحہ 3)
دیکھا آپ نے اس عبارت میں محدث ہونے کا
انکار اور ظلی، بردوزی نبی ہونے کا انکار ہے۔

ہے کہ اس قسم کا آدمی کسی خدا کی عہدے کے لائق نہیں ہو
سکتا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

صرف محدث نبوت سے انکار

نئی شریعت کے بغیر نبی ہونے کا دعویٰ

(الف) جس جس جگہ میں نے نبوت یا رسالت
سے انکار کیا ہے صرف ان معنوں سے کیا ہے کہ میں
مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں اور نہ میں
مستقل طور پر نبی ہوں۔ مگر ان معنوں سے کہ میں نے
اپنے رسول مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے
لئے اسی کا نام پا کر اسی کے واسطے سے خدا کی طرف سے
علم غیب پایا ہے۔ رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید
شریعت۔ اس طور کا نبی کہلانے سے میں نے کبھی انکار
نہیں کیا بلکہ انہی معنوں سے خدا نے مجھے نبی اور رسول کر
کے پکارا ہے سو اب بھی میں نبی اور رسول ہونے سے
انکار نہیں کرتا۔ (اشتہار ایک غلطی کا ازالہ صفحہ 4)

(ب) اب جو محمدی نبوت کے سبب نبوتیں بند
ہیں۔ شریعت والا نبی کوئی نہیں آ سکتا اور بغیر شریعت کے
نبی ہو سکتا ہے مگر وہی جو پہلے امتی ہو پس اس بنا پر میں
امتی بھی ہوں اور نبی بھی۔ (تجلیات الہیہ صفحہ 25)

اس کے الٹ صاحب شریعت نبی

ہونے کا دعویٰ

اگر کہو کہ صاحب شریعت افترا کر کے ہلاک ہوتا
ہے نہ ہر ایک مفسر ہی تو ازل تو یہ دعویٰ بے دلیل ہے خدا
نے افترا کے ساتھ شریعت کی کوئی قید نہیں لگائی۔ ماسوا
اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے۔ جس نے اپنی
دلی کے ساتھ چند اوامر اور نہی بیان کئے اور اپنی امت
کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب شریعت ہو گیا۔

☆..... اس عاجز کے رسالہ فتح الاسلام، توضیح
المرام، ازالہ اوہام میں جس قدر ایسے الفاظ موجود ہیں کہ
محدث ایک معنی میں نبی ہوتا ہے یا یہ کہ محدثیت جزوی
نبوت ہے یا یہ کہ محدثیت نبوت ناقصہ ہے یہ تمام الفاظ
حقیقی معنوں پر محمول نہیں صرف سادگی سے ان کے لغوی
معنوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ مجھے نبوت حقیقی کا ہرگز
دعویٰ نہیں۔ سو مسلمان بھائیوں کی خدمت میں واضح کرنا
چاہتا ہوں کہ اگر وہ ان لفظوں سے ناراض ہیں تو وہ ان کو
ترمیم شدہ تصور فرما کر بجائے اس کے محدث کا لفظ میری
طرف سے سمجھ لیں۔ ابتدا سے میری نیت جس کو اللہ خوب
جانتا ہے اس لفظ نبی سے مراد نبوت حقیقی نہیں بلکہ صرف
محدث مراد ہے جس کے معنی رسول اللہ نے مکلم مراد لئے
ہیں۔

(اشتہار مرزا ہیئتہ الملوہ صفحہ 91، 92 مصنف میاں محمود احمد)
☆..... نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ
ہے جو بحکم خدا کیا گیا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ 174 مصنف مرزا صاحب)

اس کے الٹ، نبوت کا دعویٰ

ان (بردوزی اور ظلی) معنوں کی زد سے مجھے
نبوت اور رسالت سے انکار نہیں۔ اس لحاظ سے صحیح مسلم
میں بھی مسیح موعود کا نام نبی رکھا ہے اگر خدا تعالیٰ سے غیب
کی خبر پانے والا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتلاؤ کس نام
سے اس کو پکارا جائے اگر کہو کہ اس کا نام (صرف)
محدث رکھنا چاہئے تو میں کہتا ہوں کہ تحدیث کے معنی کسی
افت کی کتاب میں اظہار غیب نہیں مگر نبوت کے معنی

اس کے الٹ ملاحظہ فرمائیں

(الف) ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہیں (مکتوبات مرزا ابناام ڈاکٹر عبدالکیم مندرجہ الذکر الکیم نمبر 4 صفحہ 23 مصدقہ مرزا اور حقیقۃ الوحی صفحہ 163)
(ب) جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیشگوئی موجود ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ 163)

(ج) (اے مرزا) جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور بیعت میں داخل نہ ہوگا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا اور جہنمی ہے۔ (رسالہ معیار الاخبار صفحہ 8 ابہام مرزا)
(د) دیکھو خدا نے میری وحی اور میری تعلیم اور میری بیعت کو کتنی نوح قرار دیا اور تمام انسانوں کے لئے اس کو مدار نجات ٹھہرایا۔ (حاشیہ اربعین نمبر 4 صفحہ 7)

مسیح ابن دوبارہ نازل ہوگا

ہو الذی ارسل رسول بالہدی الخ یہ آیت جسانی اور سیاست ملکی کے طور پر حضرت مسیح کے حق میں پیشگوئی ہے اور جس غلبہ کاملہ دین کا وعدہ دیا گیا ہے وہ مسیح کے ذیل ظہور میں آئے گا۔ مسیح دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے ان کے ہاتھ سے اسلام جمع آفاق میں پھیل جائے گا۔ (مخلص از براہین احمدیہ صفحہ 498، 499)

اس کے الٹ

قرآن شریف قطعی طور پر اپنی بینات میں مسیح کے فوت ہو جانے کا قائل ہے۔ (حوالہ ابہام صفحہ 142 طبع اول صفحہ 60 طبع دوم)
قرآن مجید میں مسیح ابن مریم کے دوبارہ آنے کا کہیں ذکر نہیں۔ (ایام اصح اردو صفحہ 146)



اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی۔

(رسالہ اربعین نمبر 4 صفحہ 6-7)

اتنی سی عبارت میں کئی اختلاف پائے جاتے ہیں پہلے نبی ہونے کا انکار کیا اور صرف محدث ہونا مانا۔ دوسری عبارت میں محدث ہونے کا انکار کیا اور نبی ہونے کا اقرار۔ تیسری میں بغیر شریعت کے نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ چوتھی میں صاحب شریعت نبی ہونے کا مدعی بن گیا۔

میرے انکار سے کوئی کافر نہیں ہوتا

(الف) ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعویٰ کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا۔ (تریاق القلوب طبع اول صفحہ 130 طبع دوم صفحہ 325)
(ب) مسیح کے نزول کا عقیدہ کوئی ایسا نہیں جو ہماری ایمانیات کی جزو یا ہمارے دین کے رکنوں میں ہو بلکہ صد ہا پیشگوئیوں میں سے ایک پیشگوئی ہے جس کو حقیقت اسلام سے کچھ بھی تعلق نہیں جس زمانہ میں یہ پیشگوئی بیان نہیں کی گئی تھی اس زمانہ تک اسلام ناقص نہیں تھا اور جب بیان کی گئی تو اس سے اسلام کچھ کامل نہیں ہو گیا۔

(ازالہ ابہام طبع اول صفحہ 140)

(ج) اس جگہ تو انقلاب کا دعویٰ نہیں وہی اسلام ہے جو پہلے تھا۔ وہی نمازیں ہیں جو پہلے تھیں دین میں کوئی بات چھوڑنی نہیں پڑی جس سے اس قدر حیرانی ہو۔ مسیح موعود کا دعویٰ اس حالت میں گراں اور قابل احتیاط ہوتا جبکہ اس کے ساتھ دین کے احکام کی کمی بیشی ہوتی اور ہماری عملی حالت دوسرے مسلمانوں سے کچھ فرق رکھتی۔

(آئینہ کمالات طبع اول صفحہ 339)

دائرتے

عمر بھر ہم یوں ہی غلطی کرتے رہے
دھول چہرے پہ تھی اور ہم آئینہ صاف کرتے رہے

0324-7576738

☆ محمد حسنین علی

کس حد تک حقیقت پر مبنی ہیں۔ وہ اسی بات پر مطمئن ہے کہ جو دائرہ اس نے بنا لیا ہے وہ خالصتاً درست ہے۔

جس کا دائرہ جتنا بڑا اور وسیع ہو، وہ خود کو اتنا بڑا دانشور سمجھ لیتا ہے۔ اس دائرے کی بنیاد پر وہ اپنی ترجیحات کا انتخاب کر لیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ان ترجیحات میں پتنگی آ جاتی ہے اور وہ ترجیحات اس کے نظریات بن جاتے ہیں جنہیں وہ کسی قیمت پر بدلنا نہیں چاہتا۔ انہی نظریات کی بنیاد پر وہ اپنی خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ سب کی خواہشات ملتی جلتی ہیں مگر اختلاف یہ ہے کہ ہر کوئی اسی جستجو میں ہے کہ اس کی خواہشات پوری ہو جائیں اور دوسرے محروم رہ جائیں۔

ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ سب اس کی عزت کریں مگر دوسروں کی عزت کرنا تو وہ پسند ہی نہیں کرتا۔ اسی طرح ہر کوئی چاہتا ہے اس کا کوئی مخلص دوست ہو مگر وہ خود مخلص دوست بننے کی زحمت نہیں کرتا۔ ہر کوئی دوسروں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے مگر دوسروں کو فائدہ پہنچانا گراں سمجھتا ہے۔ ہر ماں کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی کا

قارئین اللہ رب العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے جس میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے جس سے وہ اپنی زندگی کے معاملات کو سمجھتا ہے اور رہنمائی لیتا ہے۔ انسان نے اپنے ذہن میں سوچ کا ایک دائرہ تخلیق کر لیا ہے جو اسے چیزوں کو سمجھنے اور فیصلہ کرنے میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس دائرے کو تخلیق کرنے والا وہ خود ہے۔ یہ دائرہ بچپن سے ہی اس کے ذہن میں بننا شروع ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو چیز اس دائرے میں گرتی ہے اسے سمجھنا اس کے لئے نہایت آسان ہوتا ہے مگر مشکل تب پیش آتی ہے جب کوئی چیز اس دائرے سے باہر گرتی ہے۔ اب اس مقام پر آ کر کچھ تو اس پر غور تک نہیں کرتے اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر زیادہ تر اسے کھینچ کر اپنے دائرے میں لے آتے ہیں اور اپنی ترجیحات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اس طرح وقت کے ساتھ ان کا دائرہ بڑا اور وسیع ہو جاتا ہے۔ مگر کوئی یہ سوچنے کو تیار نہیں کہ جو دائرہ اس نے بنالیا ہے اس کی بنیاد کیا ہے اور اس کی بنیاد پر وہ جو فیصلے لے رہا ہے وہ

اگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ چیزیں انسانوں کے مقابلے میں کچھ نہیں بدلیں۔ رہی بات مہنگائی کی تو اس نے چیزوں کو مہنگا مگر انسان کو سستا کر دیا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ پہلے انسان اشیاء خریدتے تھے اور اب اشیاء سے انسان خریدے جاتے ہیں۔

اس دور حاضر میں آپ جس انسان سے بھی پوچھیں تو وہ آپ کو یہی بتائے گا کہ وہ بہت پریشان ہے اور طرح طرح کی پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہے کہ پریشانیاں جو اس کو گھیرے ہوئے ہیں ان کی اصلیت کیا ہے اور ان کی وجہ کیا ہے؟ جبکہ اگر وہ تجزیہ کرے تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ بیشتر کا تو ذمہ دار وہ خود ہی ہے اور باقی اس نظام کی گندگی کی وجہ سے اسے پیش آ رہی ہیں مگر وہ کبھی بھی یہ مان لینا گوارا نہیں کرتا کہ یہ ساری پریشانیاں جن سے وہ دوچار ہے اس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں۔ وہ تو اسے اپنی بد قسمتی سمجھتا ہے اور بے شمار لوگوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور وہ اپنے گزرے وقت کو یاد کر کے یہی حسرت کرتا رہتا ہے کہ کاش! ایسا ہو جاتا۔ کاش! میں اس طرح کر لیتا۔

وہ اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتا رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی اس کے ساتھ نیکی کرے اور اس کی پریشانیاں ختم ہو جائیں مگر دوسروں کی پریشانیاں نہ تو اس کو نظر آتی ہیں اور نہ ہی وہ چاہتا ہے کہ وہ ختم ہو جائیں۔ اس کی تو بس یہی خواہش ہے کہ سب اس سے ہمدردی کریں اور اس کا احساس کریں مگر اس کے اپنے دل میں دوسروں کے لئے احساس دور تک نظر نہیں آتا۔ وہ خود تو دوسروں سے احساس کا سوالی ہے مگر اس کی اپنی زبان پر یہی الفاظ ہوتے ہیں ”احساس کرنے کا وقت نہیں رہا۔“



خاندان اس کے حقوق پورے کرے اور اس کو وہ سب خوشیاں دے جس کی وہ خواہش مند ہے مگر یہی عمل اس کا بیٹا کرے تو وہ اس کو بیوی کا غلام لگتا ہے۔ وہی ماں یہ چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی کی ساس بہت اچھی ہو مگر وہ خود اچھی ساس بننے کی زحمت نہیں کرتی۔ بہنوں کی خواہش ہے کہ ان کے بھائی ان کے فرمانبردار رہیں اور ان کو اپنے معاملات میں شامل کریں مگر ان کے اپنے شوہر ایسا کریں تو یہ ان کے لئے تکلیف دہ بات ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ سب اس کو اچھا کہیں مگر دوسروں کو اچھا کہنا وہ گناہ سمجھتا ہے۔

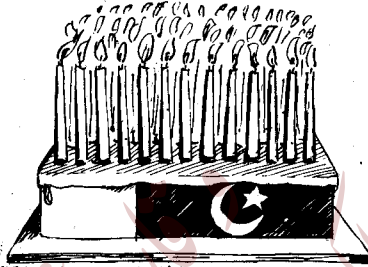
کچھ عظیم لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دوسروں میں عیب نکالنے کا ٹھیک لیا ہوا ہے۔ انسان تو انسان وہ خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں عیب نکالنے میں ورنہ نہیں کرتے۔ کسی کا انہیں چہرہ پسند نہیں آتا تو کسی کے ہاتھ، کچھ تو پورے کے پورے وجود ہی انہیں پسند نہیں آتے اور کوئی غلطی سے ان کا عیب ظاہر کر دے تو پھر کیا اس کی ایسی شامت آتی ہے کہ وہ دوبارہ ایسی غلطی کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاتا اور پھر اس کے وہ عیب بھی کھل کر سامنے آتے ہیں جو کہ شاید اس میں موجود بھی نہیں ہوتے۔

رہی بات رشتوں کی تو سب دماغ سے جڑ چکے ہیں، دل کے رشتوں کا تو رواج ہی چلا گیا ہے۔ انسان نے پیانہ تخلیق کر لیا ہے جو اسے پیکش کر کے بتاتا ہے کہ کس سے کتنا فائدہ لیا جاسکتا ہے۔ پھر وہ اس پیکش کے مطابق ان لوگوں کے لئے احساس پیدا کرتا ہے جو اس پیکش میں نہیں آتے وہ لوگ اس کے لئے فضول ہیں، جن سے وہ تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتا۔

نئی نئی ایجادات نے انسان کو حیران کر دیا ہے، لوگ جدید اشیاء کو دیکھ کر دنگ رہ گئے ہیں مگر انسان میں جو جدت آئی ہے اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ جبکہ

ایک مقدس امانت، اللہ کے بھیدوں میں سے ایک بھید

پاکستان



واللہ، پاکستان اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ یہ محض زمین کا ایک ٹکڑا نہیں ہے بلکہ ایک مقدس امانت ہے۔ اس کے ساتھ آنے والے وقت کے بہت سے اہم ترین معاملات وابستہ ہیں۔ جو محض اس امانت میں خیانت کرے گا وہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ پائے گا۔

گلاسکو۔ انگلینڈ

☆ محمد صدیق

پر یہ لوگ اسے بھی ڈاج دینے کی کوشش کریں گے کہ ابھی ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں ہم کس بات کا حساب کتاب دیں۔ پل صراط پر گزرتے وقت ایسے لوگ بغیر چینگ کے گزرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم کس بات کی تلاش دیں۔

ہم لوگ پچاس سال پہلے پاکستان سے آ کر برطانیہ آباد ہوئے۔ اس وقت ہمارے ملک میں کرپشن خال خال تھی لیکن یہاں آ کر جوں جوں ہم کرپشن اور لوٹ مار کی سٹوریاں سنتے رہے ہمارے تو اوسان خطا ہوتے گئے۔ یہی وہ ملک تھا جس کے لئے دس لاکھ شہدا کا خون بہایا گیا تھا۔ اسی ملک میں بڑے بڑے عہدوں پر رہ کر بھی ملک بنانے والوں نے ایثار اور قربانی کی مثالیں قائم کیں۔ یقیناً کی زندگی گزارنے سے گریز کیا تاکہ قوم کے سامنے اچھی مثالیں قائم کی جاسکیں

قوم کو 70 واں یوم آزادی مبارک ہو۔ ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ اب تک پاکستان کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا لیکن جو ہر آنے والے حکمران نے اس وطن کے ساتھ کیا وہ دشمنوں نے بھی نہیں کیا ہوگا۔

اس ملک کے سیاست دانوں کی ہمیشہ سے یہ ریت رہی ہے کہ ملکی خزانے ہڑپ کر گئے اور جب پونچھ پر پیر آیا تو واویلا مچانا شروع کر دیا اور مسلسل میں نہ مانوں کی رٹ لگائے رکھی۔ پانامہ کیس میں شریف خاندان کے خلاف ان کے فراہم کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق ہی تحقیق کی گئی جس میں جگہ جگہ تضادات کی وجہ سے خود ان کی اپنی پوزیشن کمزور ہوئی۔ اب حقائق سامنے آنے پر یہ لوگ میں نہ مانوں کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ قبر میں منکر نکیر کے آنے

کردار ادا کرے گی۔ مثلاً غزوہ ہند کی مشہور حدیث جس کے مطابق ایک اسلامی ملک پہلے ہندوستان فتح کرے گا اور پھر اہل یہود کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑے گا۔ اسی طرح روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ میرا دین پوری دنیا میں کمزور ہوگا تو دہاں سے اٹھے گا۔

ایک موقع پر فرمایا۔ ”مجھے مشرق سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی ہیں“۔ جس پر علامہ اقبال نے قسم کھا کر کہا۔

میر عرب کو آتی تھی جہاں سے ٹھنڈی ہوائیں وہی میرا وطن ہے، وہی میرا وطن ہے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں مدینے کے بعد پاکستان دوسری ریاست ہے جو اسلام کے نام پر بنی ہے لیکن مدینے سے مماثلت کا معاملہ صرف یہاں تک ہی محدود نہیں۔

مدینے کو اس وقت مشرکوں (بت پرستوں) سے خطرہ تھا۔ ان مشرکوں کی مدد یہودی کر رہے تھے۔ پاکستان کو بھی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مشرک (بت پرست) ریاست انڈیا سے خطرہ ہے جس کی مدد اسرائیلی یہودی کر رہے ہیں۔

مدینے کی مشرکوں کے خلاف تین جنگیں ہوئیں اور چوتھی جنگ فیصلہ کن تھی جس میں مکہ کو فتح کر لیا گیا۔

پاکستان کی بھی مشرکوں (انڈیا) کے ساتھ اب تک تین بڑی جنگیں ہو چکی ہیں، چوتھی جنگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فیصلہ کن ہوگی۔ دونوں کے نام کا مفہوم بھی ایک ہی ہے۔

پاکستان کا مطلب ہے پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ۔

مدینہ کو پہلے مدینہ النبی اور بعد میں مدینہ طیبہ کہا

لیکن بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اس کو اس طرح سے لوٹا کہ انگریزوں اور سکھوں نے بھی نہ لوٹا ہو گا۔ اس ملک سے خراج وصول کرنا اپنا حق سمجھا۔

یہاں یورپ کے ممالک میں الیکشن کے دوران میدان میں آنے والی سیاسی پارٹیاں اپنا منشور پیش کرتی ہیں کہ کون عوام کو زیادہ سے زیادہ فوائد مہیا کر سکتا ہے لیکن لگتا ہے کہ پاکستانی سیاسی پارٹیوں کے منشور میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر لوٹا ہی شامل رہا ہے کیونکہ ایسا یہ لوگ عرصہ دراز سے کر کے بھی دکھا رہے ہیں۔

یہ ملک اللہ کی امانت ہے۔ یہ لغاریوں، مزاریوں، زرداریوں، بھٹو، بے نظیروں اور شریفوں کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ خبردار! جو بھی اللہ کی عطا اس وطن کو نبیوں کی طرف سے دیکھے گا، اس کو نقصان پہنچائے گا یا اس کو اپنا خاندانی راجہ سمجھے گا، اس کا انجام برا ہوگا۔

بڑے بڑے فرعون، قارون اور نرود آئے، اللہ نے ان کو عبرت کا نشان بنا دیا۔ تمہاری کیا حیثیت ہے؟ آئیے! ذرا پاکستان کے بارے میں کچھ حقائق پیش کرتا ہوں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وطن اللہ کا بھید اور امانت ہے اس کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے۔

پاکستان 27 رمضان المبارک کو وجود میں آیا۔ مولانا طارق جمیل صاحب کے بقول یہ اتفاق نہیں بلکہ انتخاب تھا۔ اللہ نے اس غظیم ریاست کو وجود میں لانے کے لئے سال کی سب سے بہترین رات منتخب کی تھی۔ بہت سے نیک لوگوں کا یقین ہے کہ پاکستان لیلۃ القدر میں وجود میں آیا۔

مستقبل کے حوالے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث میں سعودی عرب سے مشرق کی سمت کی ریاست کا ذکر آتا ہے جو اسلام کی ترویج و ترقی میں اہم

بہترین ثابت ہوئے اور سیاستدانوں نے ملک کا دیوالیہ نکال دیا۔

ان اشعار کے حوالے سے دو چیزیں ایسی ہیں جو آج ہمیں نظر آرہی ہیں۔ ایک پیشگوئی ہے کہ پاکستان کی مدد منگول کریں گے۔ ان کے دور میں چینی لوگوں کو منگول کہا جاتا تھا۔ آج پاکستان چین متحد ہو چکے ہیں۔ دوسری انک تک کا علاقہ کھونے کی بات کو اس تناظر میں دیکھیں کہ افغانستان میں موجود 2 اکھ فوج افغان آرمی سخت پاکستان دشمن ہے اور اس کی قیادت انڈیا کے زیر اثر ہے اور ان کا پاکستان میں انک کے علاقے تک دعویٰ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے پاک فوج انڈیا کے ساتھ جنگ میں مصروف ہو تو یہ موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ کر دیں۔ گمان غالب یہی ہے کہ ان کے خلاف پاکستان کی مدد افغان طالبان کریں گے۔

غزوہ ہند لڑنے والی جس عظیم فوج کا ذکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہے وہ پاک فوج ہی ہے۔ اس پر ایک دلیل اور بھی ہے۔ غزوہ ہند لڑنے والی فوج اسرائیل کے خلاف بھی لڑے گی یعنی یہودیوں سے۔ آج اس خطے میں جو مسلمان ممالک موجود ہیں ان میں سے پاکستان ہی واحد اسلامی ملک ہے جس کے اسرائیل اور انڈیا کے خلاف بیک وقت معاملات خراب ہیں۔

یہ شرط نہ افغانستان، نہ بنگلہ دیش اور نہ ایران پوری کرتا ہے۔

اب نعمت اللہ شاہ دلی کی پیشگوئیوں کے حوالے سے ایک واقعہ پیش ہے۔

آپ کی پیشگوئیوں کو سن کر ایک 25 سال کا جوان 1857ء کی جنگ آزادی میں شریک ہوا۔ وہ فتح کے لئے پُر امید تھا لیکن اس جنگ کے دوران اس کو ایک بزرگ ملے اور اس سے کہا۔ ”تم کو جس فتح کی

جانے لگا جس کا مطلب ہے پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ۔

حضرت نعمت اللہ شاہ دلی نے آج سے 850 سال پہلے نہ صرف قیام پاکستان کی پیش گوئی فرمائی تھی بلکہ اس ملک سے اللہ نے جو کام لینے ہیں ان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے ایک شعر کہا جس کا ترجمہ ہے۔

”انگریزوں کی حکومت صرف ایک صدی تک قائم رہے گی۔“ نعمت شاہ دلی کے اس شعر پر لارڈ کرزن نے پابندی لگوا دی تھی۔

پھر فرمایا۔ ”ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا اور بہت خون خرابہ ہوگا۔“

”مسلمان دارالسلام میں امان حاصل کر لیں گے۔“ اشارہ مہاجرین کی طرف ہے۔

65ء کی جنگ کا بھی ذکر کیا کہ 17 دن چلے گی اور مومنوں کو اللہ فتح دے گا لیکن 71ء کی جنگ کے بارے میں دلچسپ شعر کہا۔ ترجمہ: ”اسلام کا نعرہ 23 سال تک بلند رہے گا جس کے بعد دوسری مرتبہ ان پر قہر ٹوٹے گا۔“

پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا لیکن ٹھیک 23 سال بعد سازشیوں نے اس میں لسانیت کا زہر گھول دیا۔ پھر نعمت شاہ نے پاکستان کو ایک زبردست جنگجو لیڈر ملنے کی پیشگوئی کی ہے جس کی قیادت میں پاکستان کی انڈیا کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہوگی جس کی ابتدا میں پاکستان انک تک KPK اور پنجاب کے کچھ شہر کھو دے گا لیکن مسلمان جنگ جاری رکھیں گے اور بالآخر انڈیا کو مکمل طور پر مغلوب کر دیا جائے گا۔

جہاں تک جنگجو حکمران کی بات ہے تو وہ کوئی سپہ سالار ہی ہو سکتا ہے۔ ہم نے پاکستان کی 70 سالہ تاریخ میں دیکھ لیا ہے کہ جرنیل ہمیشہ پاکستان کے لئے

حساب کتاب کرتے ہیں۔ زاپچے نکالتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد گاندھی نے پنڈت ونبوی بلا کر حساب کتاب لگوا دیا اور پھر کہا کہ پاکستان اور انڈیا میں 4 جنگیں ہوں گی اور چوتھی جنگ فیصلہ کن ہوگی۔ گاندھی نے یہ نہیں بتایا کہ فارع کون ہو گا۔ تاہم اس کے بعد اس نے انڈیا کو پاکستان کے خلاف جنگ سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ پاکستان کو اس کا حق دلوانے کے لئے مرن برت رکھ لیا جس پر اس کو قتل کر دیا گیا۔

اسی طرح ڈیوڈ بن گوریان جو اسرائیل کے بانیوں میں سے تھا، اس نے پاکستان کے حوالے سے پیشگوئی کی تھی کہ بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ پاکستان درحقیقت ہمارا اصلی اور حقیقی نظریاتی جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی و فکری سرمایہ اور جنگی و عسکری قوت و کیفیت آگے چل کر کسی بھی وقت ہمارے لئے باعث مصیبت بن سکتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح سوچ لینا چاہئے، بھارت سے دوستی نہ صرف ہمارے لئے ضروری ہے بلکہ مفید بھی ہے۔ ہمیں اس تاریخی عناد سے لازماً فائدہ اٹھانا چاہئے۔ جو ہندو پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ یہ تاریخی دشمنی ہمارے لئے زبردست سرمایہ ہے لیکن ہماری حکمت عملی ایسی ہونی چاہئے کہ ہم بین الاقوامی دائروں کے ذریعے ہی بھارت کے ساتھ اپنا رابطہ رکھیں۔ ("یروٹلم پوسٹ" 9 اگست 1967ء)

عالم کفر کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

عیسائیت، یہودیت، مشرکین اور ملحدین۔

بہت کم لوگوں کو احساس ہو گا کہ پاکستان اس وقت بھی ان چاروں سے بیک وقت برسرِ پیکار ہے اور ان سب کے لئے درِ دُسر بنا ہوا ہے۔ مشرکین کی نمائندہ

خوش خبری دی گئی تھی، یہ وہ جنگ نہیں ہے۔ اس میں ابھی 90 سال باقی ہیں۔ ایک ملک بنے گا جو عالم اسلام کا مرکز بنے گا اور تم اس کو دیکھو گے۔"

یہ سن کر وہ جوان جنگ چھوڑ کر چلا گیا اور انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ 90 سال بعد پاکستان بنا۔ وہ جوان زندہ رہا اور 160 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اسلام آباد کے H-8 قبرستان میں دفن ہوا جہاں اس کی قبر کی تختی پر یہ سارا معاملہ درج ہے۔ اس کی قبر قدرت اللہ شہاب کی قبر کے نزدیک ہے۔ قبر پر اس کا نام عبداللہ محبوب لکھا ہوا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شخص حضرت مہاجر مکی تھے۔ واللہ اعلم!

ہالینڈ کی نیشنل لائبریری میں ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک دستاویز موجود ہے جو حضرت بری امام سے منسوب ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک دن ہمارا یہ شہر تمام عالم اسلام کا مرکز بنے گا۔ بری امام صاحب اسلام آباد میں دفن ہیں۔ وہ آج سے 300 سال پہلے گزرے ہیں۔

شیخ فہد نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اب پاکستان مسجد کے حکم میں ہے اور اس کی حفاظت فرض ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے قیام پاکستان سے غالباً چھ سال پہلے اپنی بیوی کو وصیت کی تھی کہ پاکستان بن جائے گا، تم وہاں چلی جانا۔

صوفی برکت علی نے فرمایا تھا۔ "ایک آئے گا

جب پاکستان کی ہاں اور ناں میں دنیا کی ہاں اور ناں ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری قبر پر آ کر تھوک دینا۔

یہ بات صرف ہمارے بزرگوں تک محدود نہیں کفار کے بدوں نے بھی اس حوالے سے پیش گوئیاں کر رکھی ہیں۔ مثلاً ہندو ہر بڑا یا خاص کام کرنے سے پہلے

پاسکا۔ اسرائیل نے دو بار آگے بڑھنے کی کوشش کی تو پاکستان کے ہاتھوں رسوا ہوا۔ روس پاکستان کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ امریکی جنگی ماہرین کے مطابق امریکہ کی افغانستان میں ناکامی کی وجہ پاکستان ہے۔ پاکستان کے ساتھ ایک اور معاملہ بھی عجیب و غریب ہے کہ پاکستان کو نقصان پہنچانے والوں کو اللہ دنیا میں ہی نشان عبرت بنا دیتا ہے۔ مثلاً سقوط مشرقی پاکستان کے ذمہ دار سارے کردار جنہوں نے پاکستان کو توڑا تھا، اللہ نے ان کو ان کے خاندانوں سمیت مٹا دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا سارا خاندان غیر طبعی موت مرا اور آج درحقیقت اس کا کوئی نام لیوا موجود نہیں۔ بلاول بھٹو حقیقت میں بلاول زرداری ہے۔ شیخ مجیب الرحمن اپنے پورے خاندان سمیت مارا گیا صرف اس کی ایک بیٹی باقی بچی۔ اسی طرح اندرا گاندھی نہ صرف خود قتل ہوئی بلکہ اس کا بیٹا راجیو گاندھی بھی قتل ہوا اور دوسرے بیٹے نجی گاندھی کا 33 سال کی عمر میں طیارہ کریش ہو گیا۔ یوں اس کا پورا خاندان ختم ہو گیا۔

دنیا بھر میں اس وقت عالم اسلام کے خلاف ایک آپریشن ہارنٹ نٹ کے نام سے ایک پراکسی جنگ جاری ہے جس میں خوارج کے ذریعے اسلامی ملکوں کو بہت تیزی سے تباہ کیا جا رہا ہے۔ پاکستان وہ واحد ملک ہے جہاں اس جنگ میں عالمی قوتوں کو شکست ہوئی ہے اور خوارج کو عملی اور نظریاتی دونوں محاذوں پر پسپائی کا سامنا ہے۔

پاکستان کے خلاف لڑنے والوں کا کیا حال ہوتا ہے؟

طاہر یلہ شیف کو روس نے ”شیطان“ کا نام دے رکھا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ مرنا نہیں ہے۔ اس شخص کو امریکہ ازبکستان میں روس کے خلاف سال ہا

ریاست انڈیا ہے جبکہ یہودیوں کی اسرائیل۔ جدید الحاد کی سب بڑی نمائندہ ریاست روس ہے جو اپنے وقت کی سپر پاور تھی۔ جب وہ اپنے الحادی نظریات کو پوری طاقت سے پھیلا رہی تھی تب پاکستان کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی۔

امریکہ پاکستان کا بہ ظاہر اتحادی ہے لیکن اب دنیا جان چکی ہے کہ افغانستان میں امریکہ کو درحقیقت کس کے ہاتھوں شکست کا سامنا ہے۔

یہ پیشگوئی قدرت اللہ شہاب کی کتاب میں بھی موجود ہے جس کے مطابق 1959ء میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر تھے تو اس وقت ان کے تعلقات ایک یورپی باشندے سے ہوئے جس نے قدرت اللہ شہاب کو بتایا کہ اگرچہ امریکہ اور روس ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن پاکستان کو دونوں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ پھر اس نے وضاحت کی کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ پاکستان کی مسلح افواج کا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین افواج میں ہوتا ہے اور یہ حقیقت نہ روس کو پسند ہے نہ امریکہ کو۔

روس کی نظریں افغانستان اور پھر بحیرہ عرب پر ہیں جن کو قابو کرنا پاک فوج کی موجودگی میں ناممکن ہے (جزل ضیاء نے بعد میں اس کو ج ثابت کر دکھایا) جبکہ امریکہ اسرائیل کا حلیف ہے اور جانتا ہے کہ اگر عالم اسلام کی جانب سے عالمی طور پر جہاد کا اعلان ہوا تو پاکستان کی فوج اور ہمتی آبادی بھی کسی حکم کا انتظار کئے بغیر اسرائیل پر چڑھ دوڑے گی۔

یہ پیشگوئی غزوہ ہند والی حدیث میں بھی ہے اور نعت شہادہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔

اکھنڈ بھارت، گریٹر اسرائیل اور صہیونی تحریک کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان ہے۔ انڈیا پاکستان کی وجہ سے اب تک صرف کشمیر پر قابو نہیں

میں صرف تھر کا کوئلہ ہی سعودی عرب کے کل تیل کے ذخائر سے زیادہ مالیت کا ہے۔ پاکستان سوئی نہیں بنا سکتا لیکن دنیا کے جدید ترین میزائل بنا چکا ہے۔ پاکستان کے نوکلیر میزائل پروگرام کا مقابلہ اس وقت دنیا میں صرف امریکہ اور چین کر سکتا ہے۔ باقی ممالک کو اس معاملے میں پاکستان پیچھے چھوڑ چکا ہے۔

کیا یہ سب واقعی محض اتفاقات ہیں؟

پاکستان کے خلاف بے پناہ سازشیں ہونے کے باوجود اب تک اللہ تعالیٰ نے اس کو بچایا ہے۔ کیسے؟ اس پر اگر لکھا جائے تو شاید ایک پوری کتاب کی ضرورت پڑے۔ یہاں 65ء کی جنگ کے واقعات بھی نہیں لکھے جاسکتے جس میں اللہ تعالیٰ نے بالکل ویسے ہی پاکستان کی مدد فرمائی تھی جیسے اصحاب بدر کی فرمائی تھی۔

واللہ، پاکستان اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ یہ محض زمین کا ایک ٹکڑا نہیں ہے بلکہ ایک مقدس امانت ہے۔ اس کے ساتھ آنے والے وقت کے بہت سے اہم ترین معاملات وابستہ ہیں۔ جو شخص اس امانت میں خیانت کرے گا وہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ پائے گا۔ علامہ اقبالؒ جن کو ایک دنیا اللہ کا دلی ماتی ہے،

انہوں نے اپنی عمر کا آخری حصہ اس پاکستان کے بارے میں لوگوں کو آگاہی دیتے گزار دیا۔

صرف ایک مضمون میں پاکستان کے حوالے سے سب کچھ نہیں سمیٹا جاسکتا۔ کوشش کی ہے کہ کچھ چیدہ چیدہ معاملات پر لکھا جائے۔ جن پاکستانیوں تک یہ پیغام پہنچ رہا ہے وہ اس کو آگے پہنچا کر اپنا پاکستانی ہونے کا حق ادا کریں۔

پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور یہ قائم رہے گا۔ ان شاء اللہ!



سال استعمال کرتا رہا لیکن اس شخص کو جب پاکستان کے خلاف لانچ کیا گیا تو کچھ ہی عرصے بعد یہ پاک فوج کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ اسی طرح سری لنکا کے خلاف لڑنے والی تامل تحریک کے لیڈر پر بھارن کو لوگ سورج دیوتا کہتے تھے کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کو موت نہیں آتی لیکن جب تاملوں نے پاکستان کھلاڑیوں پر لاہور میں حملہ کیا تو جواباً پاک فوج نے سری لنکن فوج کے ساتھ مل کر ان تاملوں کے خلاف آپریشن کیا جس میں سورج دیوتا مارا گیا۔

عجیب بات ہے کہ پاکستان کے خلاف لڑنے والے اکثر خارجیوں کو تین چار سال سے زیادہ کی مہلت نہیں ملتی۔

اب اس مضمون کو سمیٹتے ہوئے ذرا ان اتفاقات

پر غور فرمائیے۔

پاکستان آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک نہیں لیکن اس کے باوجود دنیا میں سب سے زیادہ نمازی، روزے دار، زکوٰۃ دینے والے، مساجد، علماء، حفاظ اور حاجی پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ پاکستان دنیا میں دعوت و تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

پاکستان دنیا میں جہاد کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے اہم سٹریٹجک لوکیشن دی ہے اور دنیا کی کئی بڑی سپر طاقتیں بیک وقت کسی نہ کسی طرح پاکستان پر انحصار کرتی ہیں۔ یہی حال پاکستانی سمندر کا بھی ہے خاص کر گوادار کا۔

پاکستان کو اللہ نے پانچ موسم دیئے ہیں اور دنیا کا سب سے بڑا انہری نظام۔ کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان صحیح معنوں میں اپنی زمینوں سے پیداوار لے تو پورے براعظم کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔

پاکستان کے پاس بے پناہ معدنی وسائل ہیں جن

آزادی اور گناہ

میں اللہ سے دعائیں مانگتا رہتا ہوں کہ اسے صرف اتنی سی دیر کے لئے دنیا میں بھیج دے کہ اس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں اور وہ مجھے کہہ دے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔



راوی: راشد

☆ حمید رانا

بعض کہتے تھے کہ مجھے پہلی بیوی کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی اور بعض کہتے تھے کہ پہلی بیوی کا سلوک میرے ساتھ اتنا برا تھا کہ میں نے شادی سے توبہ کر لی ہے۔ حقیقت کچھ اور تھی جو میں آج جب میری ٹانگیں قبر میں ہیں اور موت کا فرشتہ نظر آنے لگا ہے، یہ حقیقت بے نقاب کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔

میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔ 1947ء میں میری عمر تیس سال تھی۔ میرے لئے رشتے ڈھونڈے جا رہے تھے۔ ماں باپ جو رشتہ پسند کرتے تھے، میں اسے ٹھکرا دیتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جو لڑکی مجھے پسند تھی اس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ میری ماں نے سب سے پہلے اسی

میری بیوی مر گئی تھی۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی۔ جو لوگ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ بڑھاپے میں بھی کر لیا کرتے ہیں لیکن میں نے تیس سال کی عمر میں بھی دوسری شادی نہ کی۔ میرے والدین اور دوست زور دے دے کر تھک گئے، میں نہیں مانا۔ میرے دو بچے پیدا ہوئے تھے۔ ایک چھ ماہ کا ہو کر مر گیا اور دوسرا دس ماہ زندہ رہا۔ مجھے اولاد کی خاطر شادی کر لیتی چاہئے تھی۔ میری ماں کی بھی یہی خواہش تھی۔ دو رشتے مل گئے تھے۔ ان میں سے ایک گھرانہ تو بہت ہی بُری طرح پیچھے پڑ گیا تھا مگر میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ سب حیران تھے کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔

بیوی بنا دے گا تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

اکثر یوں ہوتا ہے کہ انسان دعائیں مانگ مانگ کر پاگل ہوتا رہتا ہے اور اللہ سنتا ہی نہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات غصے سے منہ سے نکل گئی تو لفظ بہ لفظ پوری ہو گئی۔ یہی واقعہ میرے ساتھ ہوا۔ ہم اپنی قیامت ٹوٹ پڑی کہ زمین اور آسمان کانپ گئے۔ ملک تقسیم ہو گیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ امرتسر میں تو مسلمانوں اور سکھوں کی جھڑپیں 1947ء کا سال چڑھتے ہی شروع ہو گئی تھیں جن میں مسلمانوں کا پلہ بھاری نہ رہا تو معرکہ برابر کا رہتا تھا مگر پاکستان کی پیدائش کے ساتھ ہی سکھوں نے زبردست حملے شروع کر دیئے۔ اب ان کے ساتھ ہندو بھی تھے، پولیس بھی تھی اور ہندو گورنمنٹ کی انہیں پوری مدد حاصل تھی۔ مسلمانوں کے پاس اتنا اسلحہ نہیں تھا، ان کی پناہ اور منزل پاکستان تھی۔

ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں سے اگلے پچھلے بدلے لینے کے لئے دور دور سے سکھ اکٹھے کر لئے اور وہاں کے مسلمانوں کے بچے بچے کو قتل کرنے اور ہماری ہر ایک جوان لڑکی کو زندہ اٹھا لے جانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ مسلمان محلوں پر ان کے حملے منظم اور بڑے ہی سخت تھے۔ مسلمانوں کے گھروں میں وہ بوتلوں کے بم پھیلتے تھے۔ آگ لگاتے تھے۔ مردوں اور بچوں کو قتل کرتے اور لڑکیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے ہمت سے بڑھ کر مقابلہ کیا اور ریفوجی کیمپوں میں پہنچنے کی بھی کوشش کرنے لگے لیکن وہاں تک وہی زندہ پہنچ سکے جو وقت سے پہلے نکل گئے تھے اور جو زیادہ سے زیادہ سامان اپنے ساتھ لے جانے میں وقت ضائع کرتے رہے انہیں بڑی ہی ظالمانہ سزا دیکھنی پڑی۔

میں ان دنوں کی دہشت ناک کہانی نہیں سنا

لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔ ماں کو میں نے ہی وہاں بھیجا تھا۔ وہ ہماری برادری کا خاندان تھا۔ اس میں اور میرے خاندان میں فرق یہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس خاندان میں تعلیم زیادہ ہو گئی تھی۔ تعلیم کی تو میرے خاندان میں بھی کی نہیں تھی لیکن ہم کاروباری لوگ تھے اور اس خاندان کے لوگ اچھی ملازمتوں میں چلے گئے تھے اور اس گھر میں تعلیم کی ڈگریاں بھی تھیں۔ روپے پیسے کے لحاظ سے وہ لوگ ہم سے بہتر تو نہیں تھے لیکن ڈگریوں اور سرکاری عہدوں کی بدولت ہم سے اونچے سمجھے جاتے تھے۔ اسی نشتے میں انہوں نے لڑکی کا رشتہ مجھے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چونکہ ہماری اپنی برادری تھی، اس لئے آپس میں عورتوں کا پردہ نہیں تھا۔ میں لڑکی کو اچھی طرح جانتا تھا، وہ مجھے جانتی تھی۔ اکٹھے کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ میں میٹرک پاس کر کے والد صاحب کے کاروبار میں شامل ہو گیا تھا۔ لڑکی نے 1946ء میں ایف اے کر لیا تھا اور 1947ء میں جب امرتسر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا وہ تھر ڈائیز میں پڑھتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ لڑکی نے حقارت سے کہا ہے کہ میں میٹرک پاس ڈکاندار سے شادی کر کے اپنے خاندان کی توہین نہیں کرنا چاہتی۔

مجھے اتنا غصہ آیا کہ دل میں پہلی بار خیال آیا کہ لڑکی کو اغوا کر کے اسے خوب ذلیل کروں۔ اس غصے میں میں نے کوئی دوسرا رشتہ قبول نہ کیا۔ جس عورت نے مجھے بتایا تھا کہ اس لڑکی نے مجھے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے، اسے میں نے کہا کہ اس لڑکی کو کہہ دینا کہ اگر تم عورت ذات نہ ہوتی تو میں اپنی توہین کا بدلہ لٹاکر لیتا۔ پھر بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں بدلہ نہ لے سکا تو اللہ تمہیں اس تکبر کی سزا حاضر و دے گا۔ یہ الفاظ اس تک پہنچ گئے، جواب میں اس نے کہا۔ ”اگر تمہیں یہ امید ہے کہ اللہ مجھے تکبر کی سزا دینے کے لئے تمہاری

گھر کے افراد کھڑے تھے کیونکہ اکیلے اکیلے نکلے تھے۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے یہی توقع تھی کہ کسی بھی وقت کسی سکھ کی برچھی میرے جسم میں داخل ہو کر مجھے ختم کر دے گی۔ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ سکھ آتے تھے تو میں نالی میں اوندھے منہ بے سدھ لیٹ جاتا تھا۔ اسی طرح چھپتے اور رینگتے میں ایک مکان کے کھڑے کے پیچھے چلا گیا۔ تھڑے کے نیچے نالی بہتی تھی۔ اندھیرے میں میرا سر کسی انسان سے ٹکرا گیا۔ وہ عورت تھی، اس نے بڑی زور سے چیخ ماری۔ وہ مسلمان ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”خاموش رہو میں مسلمان ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے پیچھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ اکیلی تھی، میں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر اسے ساتھ لے کر فوراً وہاں سے نکل بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ سکھ قتل اور لوٹ مار کر رہے تھے۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ساتھ لے کے جاؤں گا، اللہ کو یاد کرو، کچھ یاد ہے تو پڑھو۔ ہم ان شاء اللہ نکل جائیں گے۔“

وہ سرگوشیوں میں کچھ پڑھنے لگی اور ہم وہاں چھپے رہے۔ وہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک ایک منٹ پورے پورے گھنٹے کے برابر تھا۔ رات کا آخری پہر تھا جب محلے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ کئی مکان جل رہے تھے۔ ہر طرف ہیبت اور موت تھی۔ عورت سسکیاں لے رہی تھی اور میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں تھڑے سے باہر آیا اور اٹھے بغیر ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے اسے بلایا اور کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلتی آئے۔ اب اگر میں آپ کو اس سفر کے ایک ایک منٹ کی بات سنائے لگوں جو ہم نے امرتسر سے لاہور تک کیا تھا تو یہ قصہ بڑا لمبا ہو جائے گا۔ میں مختصر سی باتیں سن کر اصل بات کی طرف

چاہتا جب امرتسر شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور مسلمان کاٹے جا رہے تھے یا زندہ جلائے جا رہے تھے۔ یاد کرتا ہوں تو اب بھی دل دہشت سے کاپٹنے لگ جاتا ہے۔ ہم کاروباری لوگ تھے۔ ہزار ہا روپے کا مال، نقدی اور زیورات پھینک کر بھاگ آئے کوئی نہیں چاہتا تھا۔ ہم اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ فساد و چار دنوں میں ٹھنڈا ہو جائے گا تو سب کچھ اٹھا کر پاکستان چلے جائیں گے۔ امرتسر کی گلیاں اور سڑکیں مسلمانوں کے خون میں ڈوب گئیں اور ایک روز آگ کا طوفان ہمارے محلے میں آ گیا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا، ہمارے صحن میں بڑی زور کا دھماکا ہوا اور اس کے فوراً بعد سارے محلے میں دھماکے سنائی دینے لگے۔ یہ بوتلوں کے بم تھے جو سکھ باہر سے مسلمانوں کے گھروں میں پھینک رہے تھے۔ ہم تو کئی دنوں سے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ بچوں اور جوان لڑکیوں کو اندرونی کمروں میں چار پائیوں کے نیچے چھپا دیا گیا۔ سورج غروب ہو گیا اور فوراً ہی سکھوں کا شور اور لٹکارا مچنے لگی۔ چیخ و پکار بھی سنائی دینے لگی اور محلے میں سے شعلے بھی اٹھنے لگے۔ اگر ہمارے پاس اسلحہ ہوتا تو ہم مقابلہ کرتے۔ ہمارے پاس چھریاں اور چاقو تھے یا کسی کسی گھر میں کلہاڑی بھی تھی۔ مقابلے کا مطلب خودکشی تھا۔ پھر بھی مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ زیادہ تر کوشش بھاگنے کی تھی اور ہم نفسا نفسی کے عالم میں بھاگنے لگے۔ کسی نے بچہ اٹھایا، کسی نے لڑکیوں پر چادریں ڈالیں اور انہیں ساتھ لے کر نکلے۔ ان میں سے بہت تھوڑے زندہ نکل سکے۔

میں جب گھر سے نکلا تو سکھوں کا ریا گلی سے گزر رہا تھا۔ میں اندھیرے میں ہو گیا۔ سکھ درندوں کی طرح دھاڑتے میرے قریب سے گزر گئے۔ میرے

مجھے اپنے ساتھ دیکھ کر اتنا زیادہ حیران ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ میٹرک پاس دکاندار کے ساتھ چلنے سے تمہاری توہین ہوگی۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”سوچ لو، اگر پسند کر دو تو میرے ساتھ چلو ورنہ اکیلی چلی جاؤ۔“ میں نے اس کی کمزوری اور بے بسی پر طنز کی تھی۔

”تم گوارا کر لو گے کہ ایک مسلمان لڑکی اکیلی وحشی سکھوں کے درمیان سے گزرے؟“ اس نے کہا اور فوراً ہی اس کے آنسو نکل آئے۔ قریب ایک درخت تھا، وہ اس کے سہارے بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ وہ میری نگاہ میں مسلمان لڑکی نہیں بلکہ وہ لڑکی تھی جس نے مجھے نفرت سے ٹھکرا دیا تھا۔ میرے چہرے سے اس نے شاید معلوم کر لیا تھا کہ میری نیت صاف نہیں اور میں اسے سزا دینا چاہتا ہوں۔ میرا دماغ اس عمر میں کیا اور نادان تھا، میں واقعی وہی سوچ رہا تھا جو وہ سمجھ رہی تھی۔ اس نے اچانک کہا۔ ”میں اکیلی نہیں چل سکتی۔ اگر تمہاری غیرت بالکل ہی مرگئی ہے تو مجھے اپنے ہاتھوں مار ڈالو، میں اپنے آپ کو تمہارے سپرد کرتی ہوں جو سلوک تمہارے دل میں آتا ہے کر لو۔ مجھے سکھوں کے حوالے نہ کرو۔“ میری گردن اور زیادہ اونچی ہو گئی۔

وہ آخر لڑکی تھی اور باعزت خاندان کی لڑکی تھی، خوف سے اس کی جان نکل رہی تھی۔ اس پر جو رات کو جیتی تھی وہ بڑی ہی بھیانک واردات تھی۔ ان کے باورچی خانے میں پہلا دھماکا شام کے وقت ہوا۔ دتی ہم دروازے میں سے باورچی خانے میں گرا۔ اس کی ماں اور چھوٹی بہن باورچی خانے میں تھیں، وہیں ختم ہو گئیں۔ گھر کے باقی فرد کبھی کمروں میں چھپتے اور کبھی چھت پر چڑھ جاتے۔ باہر فساد یوں کاغل غباڑہ بڑھتا جا رہا تھا اور ان بے چاروں کو کہیں چھپنے کی جگہ نہیں مل

آتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا محلہ شہر کے وسط میں نہیں تھا ورنہ نکلنا مشکل ہو جاتا۔ شہر کے ایک پہلو میں ہونے کی وجہ سے ہم شہر سے جلدی نکل گئے اور جب صبح روشن ہوئی تو میں نے ایک تو یہ دیکھا کہ امر ستراتی دور پیچھے رہ گیا تھا کہ اس کی سب سے اونچی عمارتوں کی منڈیریں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ ہم اندھیرے میں بہت ہی تیز چلتے رہے تھے۔ تھوڑا فاصلہ تو ہم نے دوڑ کر بھی طے کیا تھا۔

صبح کی ابتدائی روشنی میں مجھے دوسری جو چیز نظر آئی اس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا ڈالا، وہ یہ تھی کہ میرے ساتھ جو عورت آ رہی تھی وہ ایک جوان لڑکی تھی اور یہ لڑکی وہی تھی جس نے مجھے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ میں میٹرک پاس دکاندار کے ساتھ شادی کر کے اپنے خاندان کی توہین نہیں کرنا چاہتی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو وہ اتنی تیز چلتے چلتے اس طرح رک گئی جیسے زمین نے اچانک اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ میری حالت یہ ہوئی جیسے میں نے سارا ہندوستان فتح کر لیا ہو۔ دل میں خوشی کی ایسی لہر آئی کہ میں بھول ہی گیا کہ میرا خاندان زندہ ہے یا مر گیا ہے اور اگر زندہ ہے تو کہاں ہے اور کس حال میں ہے اور میری منزل کہاں ہے اور میرا انجام کیا ہوگا۔ یہ خوشی ایسی تھی جیسے میں سارے امرتسر کو جلا کر اس لڑکی کو اٹھا لایا ہوں۔ میں اس لئے خوش نہیں تھا کہ جس لڑکی کو میں نے پسند کیا تھا وہ میرے رحم و کرم پر تھی بلکہ میرے خوش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ لڑکی کو سکبر کی سزا مل گئی تھی اور اللہ نے اسے میرے قدموں میں پھینک دیا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میرے منہ میں ایک ہی بار بہت سی باتیں آ گئیں اس لئے زبان بند رہی۔ آخر لڑکی کی زبان حرکت میں آئی، اس نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

سنایا تو اس کی صرف چھین ہی نہیں نکلیں بلکہ دو بار اس پر غشی طاری ہو گئی۔ ہمارا وہاں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ دور سے ہمیں گولیوں کے دھا کے سنائی دے رہے تھے۔ میں لاہور سے اچھی طرح واقف تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں کئی بار لاہور آیا تھا لیکن اس آنے اور اگست 1947ء کے آنے میں بہت فرق تھا۔ مجھے لاہور کا راستہ معلوم تھا مگر اس راستے پر اب موت کا راج تھا۔ میں ریلوے لائن اور سڑک سے بہت دور ہٹ کر جانا چاہتا تھا۔ یہ تو لاہور پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ عام راستوں سے ہٹ کر سفر کر کے میں نے کتنی غلطی کی تھی۔ سڑک پر اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ مہاجرین کے جو قافلے پیدل چلے تھے، ان میں سے قسمت والے ہی لاہور پہنچے تھے۔ سڑک اور ریلوے لائن پر چلنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ راستے میں کہیں بھٹکیں گے نہیں، سیدھے لاہور پہنچ جائیں گے۔ میں نے ایسی غلطی نہیں کی۔ لڑکی سے میں نے کہا کہ اشو چلیں۔ اگست کی گرمی نے جسم کی نمی اور خوف نے طاقت چوس لی تھی۔ لڑکی کا پیاس سے منہ کھل گیا تھا۔ میں نے جب اسے کہا کہ اشو چلیں تو میں نے اس کا انتظار نہیں کیا۔ میں چل پڑا اور وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو افلاطون سمجھ رہا تھا۔ میرے اندر کی حالت بہت ہی بری تھی مگر لڑکی پر میں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کا رکھوالا صرف میں ہوں اور اس کی جان میری مٹھی میں ہے۔ اس سے مجھے عجیب طرح کا سرور حاصل ہو رہا تھا۔

راستے میں ہم پر کیا گزری اور ہم نے کیا دیکھا، اس کا میری آپ بیتی کے ساتھ گہرا تعلق نہیں اس لئے میں اس کا ذکر بے معنی سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کبھی واہگہ گئے ہوں تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ شمال کی طرف دریائے راوی ہے جو واہگہ سے سات آٹھ میل دور

رہی تھی۔ دھاکوں، چیخوں اور سکھوں کی لکار نے ان کے دماغ بے کار کر دیئے اور ان کی حالت کبوتر کی طرح ہو گئی جو باز کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ حویلی کا دروازہ بند تھا، اندر سے زنجیر چڑھی ہوئی تھی اور دروازے کے ساتھ انہوں نے میزیں، کرسیاں اور چار پائیاں رکھ دی تھیں تاکہ دروازہ کھل نہ سکے۔ سکھوں نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ گھر کے افراد کمروں میں چھپ گئے اور یہ لڑکی بیت الخلاء میں جا چھپی۔

دروازے پر کھڑائیوں اور برجیوں کی ضربیں پڑ رہی تھیں اور یہ لڑکی بے ہوش ہوئی جا رہی تھی۔ آخر انہوں نے دروازہ توڑ لیا اور دروازے کے آگے رکھی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے چیخوں، سکھوں کی گالیوں اور بے کاروں کا ہنگامہ سنائی دینے لگا۔ ان آوازوں سے لڑکی کو صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کا خاندان ذبح کیا جا رہا ہے۔ بیت الخلاء کمروں سے دور اور الگ تھا۔ لڑکی وہاں سے نکلی اور باہر نکل گئی۔ وہ جان اور عزت بچانے کے لئے نکلی تھی لیکن اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ جان بچا سکے گی یا عصمت یا دونوں ہی گنوا بیٹھے گی۔ اللہ کی ذات کے سوا اسے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر ایک ہی گھر آگے گئی تو اسے بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ قریب ایک مکان کا تھڑا تھا جس کے نیچے سے نالی گزرتی تھی، وہ اس کے نیچے چلی گئی۔ تھڑا اتنا اونچا تھا کہ اس میں بیٹھا جا سکتا تھا، یہ لمبا بھی تھا۔ پھر میں بھی اسی تھڑے میں جا چھپا اور ہماری ملاقات ہوئی۔

میں نے یہ بھیا تک واردات چند فکروں میں سنا دی ہے۔ پڑھنے والے تصور بھی نہیں کر سکیں گے کہ یہ واقعہ کس قدر ہولناک تھا اور یہ ایک معجزہ تھا کہ لڑکی دہشت سے ہی مر نہ گئی۔ اس نے جب مجھے یہ واقعہ

”اس حال میں پہنچ کر بھی تم اپنے فیصلے پر قائم ہو کہ میٹرک پاس دکاندار کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرو گی؟“

”اگر تمہیں اس حال میں بھی طعنے دے کر لطف آتا ہے تو اور زیادہ طعنے دے لو۔“ اس نے کہا اور رو پڑی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ”تمہارا رویہ دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ تم لاہور جا کر مجھے تنہا چھوڑ دو گے۔ میں.....“ وہ ہر گئی اور ذرا سوچ کر بولی۔ ”میں تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔ ساتھ رکھو گے تو ساری عمر.....“ اور وہ ہچکیاں لینے لگی۔

مجھے اس رات کا ایک ایک منٹ اور اس کے اور میرے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ایسی رات ہے جو میرے دل اور دماغ پر سوار ہو گئی اور شرشار کی طرح ساری عمر سوار رہے گی۔ اس وقت میرا دماغ کچا تھا۔ اتنے سال گزر گئے ہیں کہ میں اس رات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ روز بروز ذہن میں گہری ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے یہ حرکت کی تھی کہ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا اور اس لڑکی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف تھپتا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی اور نہ ہی بازو میرے ہاتھ سے چھڑایا۔ ایک آدھ منٹ بعد وہ سر کر میرے قریب ہو گئی۔ میں کروت بدل کر پہلو کے بل ہو گیا اور اس کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے ہاری ہوئی سی آواز میں کہا۔

”تمہاری طرح میں بھی اتنی ڈری ہوئی ہوں کہ جی چاہتا تھا تم مجھے اپنے ساتھ لگا لو۔“ اور وہ بچوں کی طرح منہ میرے سینے میں چھپا کر اور ایک بازو میری گردن میں ڈال کر سسک سسک کر رونے لگی۔ میری جو حالت ہوئی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک کانڈال میں اتر گیا۔ میں آج اس گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اسے اس لئے اپنے

ہے، میں اسی راستے سے آ رہا تھا۔ اس طرف کا علاقہ ہموار نہیں، سرکنڈوں کا جنگل ہے، کھڈ ہیں اور پانی کے تالاب بے شمار ہیں۔ وہ علاقہ گزرنے کے قابل نہیں۔ چھپنے اور چھپ چھپ کر چلنے کے لئے بہت موزوں ہے۔ ہم آبادیوں سے دور دور کیڑوں کموڑوں کی طرح چلتے رہے اور سورج غروب ہو گیا۔ مجھے اپنے گھر والوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا کہ زندہ ہیں یا مارے گئے ہیں اور اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں۔ دل ان کے غم سے ڈوب رہا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا لیکن یہ لڑکی ساتھ تھی جس پر میں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ساری دنیا میں مجھ جیسا دلیر نہیں کوئی نہیں ملے گا۔ وہ روتی تھی تو میں رعب سے اسے چپ کر دیتا تھا۔ شام کے وقت ہم نے ایک جوہڑ سے گندا پانی پیا اور سرکنڈوں کے اندر کچھ خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔ میں لیٹ گیا، وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر وہ بھی لیٹ گئی۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا، میں اپنوں کا انجام سوچ سوچ کر بے حال ہو رہا تھا۔ مستقبل کے متعلق بھی کچھ پتہ نہ تھا۔

”تم جاگ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”سکھ یہاں تو نہیں آجائیں گے؟“

”ہاں میں جاگ رہا ہوں۔“ میں نے بے رخی سے کہا۔ ”تمہیں نیند آئی ہے تو بے فکر ہو کر سو جاؤ، سکھ آ گئے تو میں سنبھال لوں گا۔“

وہ چپ ہو گئی۔

”تم لاہور بھی پہلے بھی گئے ہو؟“ اس نے بڑی ہی دبی دبی آواز میں پوچھا۔ ”لاہور پہنچ کر ہم کہاں جائیں گے؟“

”یہ لاہور پہنچ کر سوچیں گے۔“ میں نے پہلے سے زیادہ بے رخی سے کہا۔

”میں کہاں جاؤں گی؟“

کئی بار گرا اور وہ بھی گری۔ سرکنڈوں کے جنگل سے نکل کر ہم چلنے لگے۔ میں آگے تھا۔ ایک بار پیچھے دیکھا تو لڑکی نظر نہ آئی۔ اندھیرا گہرا تھا، میں پیچھے گیا تو وہ بیٹھی ہوئی تھی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ میں چونکہ تلخ سی بے چینی کا شکار تھا اس لئے مجھے غصہ آ گیا اور غصے میں ہی اسے اٹھنے اور چلنے کو کہا۔ وہ ہاتھ زمین پر رکھ کر اٹھنے لگی تو اس کے منہ سے ہائے نکل گئی۔ میں مرد تھا مگر میری ٹانگیں اکڑ چکی تھیں، وہ تو لڑکی تھی۔ پا پیادہ سفر کی تھکان کے ساتھ دہشت اور غم نے جسم میں ذرہ بھر طاقت نہیں رہنے دی تھی۔ بھوک اور پیاس کا اثر الگ تھا۔ اچانک میرے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی، میں اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا اور اسے کہا۔

”میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔“ وہ آگے نہ آئی، میں نے غصے سے گرج کر کہا۔ ”آؤ میری پیٹھ پر آ جاؤ۔“ میں گھٹنوں کے بل ہو گیا۔

وہ میری پیٹھ کے ساتھ لگ گئی اور بازو میری گردن کے گرد ڈال دیے۔

مجھے اٹھنے کے لئے طاقت کا آخری ذرہ بھی صرف کرنا پڑا۔ میں تو اپنا جسم بھی نہیں ٹھیکٹا سکتا تھا، اسے کیسے اٹھاتا؟ لیکن میری مرادگی ٹکست قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں چل پڑا مگر ہر قدم پر لگتا تھا کہ گر پڑوں گا۔ بمشکل دس قدم چلا تھا کہ وہ میری پیٹھ سے اتر گئی اور کہنے لگی۔ ”میں اپنے پاؤں پر چلوں گی، تم مجھے نہیں اٹھا سکو گے۔“ میں خاموش رہا اور ہم دونوں چلتے رہے۔ میں اب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہم دونوں میں سے کون پہلے گرے گا..... ہم لاہور پہنچ کر گرے۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ آج کل جہاں محمود بوٹی بند ہے، ہم اس طرف سے لاہور میں داخل ہوئے تھے۔ صبح کی روشنی میں شاہی مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے، بس ان میناروں کو دیکھنا تھا کہ میرا جسم ریت ہو گیا اور میں گر

قریب نہیں کیا تھا کہ میں ڈر رہا تھا بلکہ میری نیت پر شیطان غالب آ گیا تھا۔ ایسی حالت میں جب ہمارے ارد گرد اور سر پر موت منڈلا رہی تھی، میں نے لڑکی کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ حالانکہ میں گمراہ اور بدکار آدمی نہیں تھا۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اس سے پہلے میرے خیالات اور میرا اخلاق پوری طرح صاف ستھرا اور پاک رہتا تھا۔ یہ شاید انتقامی جذبہ تھا کہ میں نے ایسی ذلیل حرکت کی لیکن لڑکی نے ایسی بات کہہ دی اور ایسی حرکت کی کہ میں پانی پانی ہو گیا۔ میرا دماغ میرے قابو سے باہر ہو گیا۔ یہ بھی سوچنے کے قابل نہ رہا کہ میں کیا کروں۔ اس لڑکی کو تو بالکل علم نہیں تھا کہ میری نیت کیا ہے مگر میں یوں سمجھ رہا تھا جیسے وہ میری نیت بھانپ گئی ہے۔ اس سے مجھے غصہ آ گیا اور میں چلنے لگا۔

تھوڑی دیر گزر گئی تو میری بے چینی بڑھ گئی، وہ نادانی کی عمر تھی، آج جب ذہن پختہ ہو گیا ہے تو میں اس وقت کی حالت بیان کر سکتا ہوں اور سمجھ بھی سکتا ہوں۔ میں جسے بے چینی اور غصہ کہتا ہوں وہ دراصل گناہ کا احساس تھا جو مجھے بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ کبھی تو ذہن امر ترس چلا جاتا اور کبھی لاہور پہنچ جاتا اور جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ میں نہ امر ترس میں ہوں، نہ لاہور میں اور میں کسی بھی وقت سکموں کے تھے چڑھ کر اپنی جان اور یہ لڑکی گونا گونا بیٹھوس گا تو میرا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکی سے کہا۔ ”یہاں پڑے رہنا خطرناک ہے۔ مجھے امید ہے کہ صبح سے پہلے پہلے ہم لاہور پہنچ جائیں گے۔ اٹھو چلیں۔“

وہ اس قدر ٹھکی ہوئی تھی کہ بڑی مشکل سے اٹھ سکی۔ ہم سرکنڈوں سے نکلے۔ زمین ہموار نہیں تھی۔ گڑھے زیادہ تھے اور ان میں ساون کا پانی تھا۔ میں بھی

بڑا۔ لڑکی میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی، اس نے سسکی کے

لہجے میں پوچھا۔ ”لاہور آ گیا ہے؟“

لاہور آ گیا تھا، چار پانچ دیہاتی گزر رہے

تھے، ہمارے پاس رک گئے۔ ہم نے بتایا کہ امرتسر سے

آئے ہیں تو وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے، ان کا گاؤں

قریب ہی تھا۔ ان کی خاطر تواضع اور ہمدردی نے

ہماری سٹھکن دور کر دی۔ پھر انہوں نے ہمیں والٹن کمپ

میں پہنچا دیا۔ وہاں تو قیامت کا منظر تھا۔ ہم دونوں اس

ہجوم میں شامل ہو گئے اور دوسروں کی طرح اپنے رشتہ

داروں کو ڈھونڈنے لگے۔ یہ وہم میرے دل میں بیٹھ گیا

کہ اس لڑکی کو اپنا ایک بھی عزیز مل گیا تو یہ مجھ سے الگ

ہو جائے گی۔ میرے میرے ذہن میں یہ وہم پختہ ہوتا

جا رہا تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور یہ اس کی

مجبوری تھی کہ میرے ساتھ آ گئی ہے۔ ایک روز میں

اسے پارک کے برآمدے میں بٹھا کر اپنے رشتہ داروں

کو ڈھونڈنے نکل گیا۔ واپس آیا تو وہ ایک جوان آدمی

کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اس آدمی نے بڑے اچھے

کپڑے پہن رکھے تھے، لڑکی مسکرا رہی تھی، میں آ رہا

تھا، مجھے دیکھ کر لڑکی نے اس آدمی سے کچھ کہا، اس نے

بھی میری طرف دیکھا اور چلا گیا۔ میں نے لڑکی سے

پوچھا کہ یہ کون تھا؟ اس نے بتایا کہ لاہور کا رہنے والا

ہے۔ یہاں مہاجرین کے لئے کمپ کے دفتر میں کام

کرتا ہے، پوچھ رہا تھا کہ کہاں سے آئی ہو اور کہاں جاؤ

گی۔

میں نے پوچھا۔ ”اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟“

اس نے حیران سا ہو کر کہا۔ ”ہنسنا کوئی جرم تو نہیں، وہ

ہمدردی سے باتیں کر رہا تھا، میں نے رونا مناسب نہیں

سمجھا۔“

”تمہارا رونا صرف میرے لئے ہے۔“ میں نے

احتقاس کی طرح کہا۔ ”اور تمہاری ہنسی دوسروں کے لئے

ہے۔“

وہ چپ رہی۔ اس شام میں نے ایک بار پھر اس

آدمی کو اس کے پاس دیکھا، مجھے آتا دیکھ کر وہ چلا گیا۔

میرے دل میں یہ وہم پیدا ہو گیا کہ اسے اپنے رشتہ دار

تو مل نہیں رہے، اب وہ کوئی اپنے جیسا گرجوٹ اور

اپ ٹو ڈیٹ آدمی تلاش کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر

لیا کہ اسے اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دوں گا۔ اگلے روز

مجھے میرا سارا خاندان مل گیا۔ وہ لوگ امرتسر رہنوی جی

کمپ میں پہنچ گئے تھے جہاں سے وہ بڑا ہی کھن سفر

طے کر کے لاہور پہنچے۔ لڑکی کا کوئی رشتہ دار نہ مل سکا،

بعد میں تصدیق ہو گئی کہ اس کے گھر کا کوئی ایک بھی فرد

زندہ نہیں رہا۔

بہت ذلیل و خوار ہو کر لاہور میں ایک مکان مل

گیا۔ پھر کاروبار کی بنیاد رکھی۔ لڑکی ہمارے ساتھ

تھی، ذرا ماؤں جم گئے تو میری شادی اس لڑکی کے

ساتھ کر دی گئی۔ جس روز ہماری شادی ہوئی اس روز وہ

بہت روئی، اسے رونا ہی چاہئے تھا۔ آپ بھی سمجھ سکتے

ہیں کہ وہ کیوں روئی تھی۔ اس کا اپنا کوئی بھی زندہ نہ

تھا۔ اس کے ماں باپ زندہ ہوتے تو سوچ سمجھ کر اور

طور طریقے سے شادی کرتے اور شاید میری نسبت کسی

بہتر آدمی کے ساتھ اس کی شادی کرتے۔ اب اس کی

شادی ہوئی تو کیا ہوئی، ایک فرض تھا جو ادا ہوا ورنہ یہ

شادی نہیں ماتم تھا مگر مجھ پر یہ وہم غالب آ گیا کہ یہ

اس لئے روئی ہے کہ اسے مجبوراً ایک میٹرک پاس

دکاندار کے ساتھ شادی کرنی پڑی ہے اور وہ دلی طور پر

مجھے پسند نہیں کرتی۔ اس خیال یا دہم کے اثر سے میر

اس کے ساتھ ردیہ یہ ہو گیا کہ میں اس پر حکم چلانے

لگا۔ میں جو بات کرتا حاکموں کی طرح کرتا۔

وہ بے شک مجبور تھی لیکن اونچے اور باعزت

خاندان کی لڑکی تھی، ایک روز اس نے مجھے کہا۔ ”میر

ایک ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ اسے بیوی کی ساری کیفیت بتائی۔ ایکسرے دکھایا اور سالمی ہسپتال والوں کی رپورٹ بھی دکھائی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں کوئی نئی دوائی نہیں دے سکتا، وہی دوائیاں اور انجکشن جاری رکھیں۔“ پھر اس نے مجھے یہ کہہ کر خبردار کیا۔ ”آپ مریضہ سے دور رہیں ورنہ آپ کا بھی یہی حال ہو جائے گا۔“ یہ تو مجھے دو ڈاکٹر اور گھر والے سارے کہہ چکے تھے کہ میں بیوی سے دور رہوں۔ میں نے یہ پرہیز کیا بھی تھا لیکن میرے اندر ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں جب بیوی سے دور ہوتا تھا تو دل بے چین ہو جاتا تھا۔ اب جب اس آخری ڈاکٹر نے بھی وہی بات کہی تو میں نے ارادہ کر لیا کہ ہر وقت بیوی کے کمرے میں رہوں گا اور اس کی تیمارداری کروں گا۔

میں نے دوائیاں جاری رکھیں۔ دو روز بعد کا واقعہ ہے کہ رات کا وقت تھا، میں بیوی کو دوائی دینے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ اب اچھی طرح بول بھی نہیں سکتی تھی لیکن مجھے پاس بٹھا کر وہ ایسی روانی سے بولنے لگی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جو الفاظ کہے وہ میں ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ اس نے کہا۔

”اللہ نے مجھے تکبر کی بڑی سخت سزا دی ہے لیکن میں تو یہ کہوں گی کہ اللہ نے تو مجھے معاف کر دیا تھا، آپ نے معاف نہیں کیا۔ آج دس سال گزر گئے ہیں، آپ نے پورے دس سال مجھے سزا دی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ میں آپ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتی رہی۔ آپ مجھے ہر بات حکم کے لہجے میں کہتے تھے اور میں آپ کا حکم بجالا کر خوش محسوس کرتی تھی مگر اس دکھ نے میرا سینہ کھالیا ہے کہ میں آپ کے دل میں اپنی محبت پیدا نہ کر سکی۔ میرے

آپ کی بیوی ہوں، روٹی کپڑے پر رکھی ہوئی نوکرانی تو نہیں، کبھی میرے ساتھ پیار اور محبت کی بھی بات کر لیا کریں۔“

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس کی اس بات کو اس رنگ میں لیا کہ وہ مجھے کم پڑھا لکھا سمجھ کر نصیحت کر رہی ہے اور مجھے تہذیب سکھا رہی ہیں میں نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ اسے روٹی کپڑے پر رکھی ہوئی نوکرانی ہی سمجھتا رہا۔ پھر یہی رویہ میری عادت ہو گئی۔ میں نے کئی بار اسے روتے دیکھا تو بھی اس کے ساتھ ہمدردی نہ کی۔ اور دس سال گزر گئے۔ دو بچے ہوئے، دونوں مر گئے۔ یہ اضافی غم تھے۔ میری بیوی کی صحت کچھ عرصے سے گر رہی تھی، میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ گرتے گرتے وہ اس حالت کو پہنچ گئی کہ اسے کھانسی آنے لگی اور ہلکا ہلکا بخار بھی۔ ایک روز وہ چار پائی سے اٹھی ہی نہیں ڈاکٹر دکھایا تو اس نے کہا۔ ”ایکسرے کی میں ضرورت تو نہیں سمجھتا پھر بھی سینے کا ایکسرے کرا ہی لیں۔ اللہ کرے میں نے غلط سمجھا ہو، یہ دق ہے اور پھیپھڑوں میں پھیل چکا ہے۔“

ایکسرے نے تشخیص کی تصدیق کر دی۔ دونوں پھیپھڑے زد میں آ چکے تھے۔ علاج شروع کر دیا گیا لیکن مرض آخری مرحلے تک پہنچ چکا تھا۔ مری سالمی ہسپتال میں لے گئے۔ وہاں سے صاف جواب مل گیا۔ بڑے ڈاکٹر نے کہا۔ ”داخل کرنا بیکار ہے۔“ ہم اسے واپس لے آئے اور اس نے زندہ رہنے کی آس ختم کر دی۔ ہم نے اسے نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ وہ خود ہی سمجھ گئی تھی۔ گھر آتے ہی اس نے مجھے کہا کہ اب کوئی دوائی نہ لانا۔ بے فائدہ پیسے خرچ ہو رہے ہیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ کسی چیز نے میرے دل کو پنچے میں جکڑ لیا۔ میرا سر چکرا گیا۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور

گیا تھا۔ میرے کچھ کہنے اور نہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اس پر نزع کی کچی طاری ہو چکی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ رات گزر رہی تھی اور پھر رات گزر گئی۔ صبح کی اذان کے وقت اس نے آنکھ کھولی۔ میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر دبا یا اور پھر اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس نے گہرا سانس لیا اور بات ختم ہو گئی۔

وہ مر گئی تو اس کے ساتھ ہی میں بھی مر گیا۔ میرا سر جو بیوی کو دیکھ کر حاکموں کی طرح اونچا ہو جاتا تھا، گناہ کے بوجھ سے جھک گیا۔ پشیمانی اور پچھتاوے نے مجھے نیند اور آرام اور کام کرنے کی لگن سے محروم کر دیا۔ یہی ایک احساس مجھے کائنات کی طرح جیسے لگا کہ میں دس سال ایک جرم کرتا رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی وہ رات میرے ذہن میں اٹک کے رہ گئی جب میں اور وہ سرکنڈوں میں لیٹے تھے اور میری نیت خراب ہو گئی تھی۔ میں اس کے مرنے کے بعد کئی راتیں اس کی قبر پر گیا اور ردو کر اس سے معافی مانگی مگر چین نہیں آیا۔ اس کے بغیر گھر خالی ہو گیا۔ اپنے بچے جو مر گئے ہیں بھی یاد نہیں آئے۔ مجھے بچوں کی ماں یاد آتی رہی۔ اب بھی اسی شدت سے یاد آتی ہے۔ میں اللہ سے دعائیں مانگتا رہتا ہوں کہ اسے صرف اتنی سی دیر کے لئے دنیا میں بھیج دے کہ اس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں اور وہ مجھے کہہ دے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں ایسی دعا کبھی قبول نہیں ہوگی۔

میں نے گناہوں کی بخشش کے لئے صوم و صلوة کی پابندی کی، خیرات بے دریغ کی مگر چین نصیب نہیں ہوا۔ آخر گناہوں کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے کچھ سکون ملتا ہے یا آج پہلی بار اقبال جرم کر کے سکون محسوس کر رہا ہوں۔“



دو بچے مر گئے لیکن آپ کو زندہ اور سلامت دیکھ کر میں بچوں کا غم بھول گئی۔ میں اپنے ان ماں باپ اور بہن بھائیوں کو بھی بھول گئی جو امرتسر میں مر کر دیں کی مٹی میں مل گئے ہیں۔ میں نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی لاشوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ میں نے اپنا وجود آپ کے وجود میں گم کر دینے کی بہت کوشش کی مگر آپ مجھے جنس اور اپنے آپ کو بہت بلند سمجھتے رہے۔“

وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی، میری زبان جو حکم دینے کی عادی ہو گئی تھی اکڑ گئی، دماغ سن ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”دس سال پہلے کی وہ رات آپ کو یاد ہو گی جب ہم سرکنڈوں میں چھپ کر لیٹے تھے تو آپ نے مجھے اپنے قریب کر لیا تھا۔ میں آپ کی نیت اور خواہش سمجھ گئی تھی لیکن آپ پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھی۔ میں آپ کو یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ وقت ایسی خواہش کے لئے نہیں ہے لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر دیا تھا کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کا احسان بھول جاؤں گی اور آپ کو غیر سمجھوں گی۔ میں نے آپ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہمیشہ آپ کی غلام رہوں گی۔ میں نے صحیح معنوں میں غلام بن کر دکھایا مگر آپ نے مجھے غلام سے زیادہ کچھ نہ سمجھا۔ یہی میرا مرض تھا۔ مرنے کا کوئی غم نہیں، میں دل میں یہ اطمینان لے کے مر رہی ہوں کہ آپ کو کبھی ناراض نہیں کیا۔ اگر بھولے بھٹکے کوئی دکھ آپ کو میں نے پہنچایا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ دوسری شادی جلدی کر لیتا۔“ یہاں آ کر وہ رو پڑی۔ اس سے پہلے وہ اچھی خاصی طرح باتیں کر رہی تھی۔ دوسری شادی کا لفظ منہ سے نکلا تھا کہ وہ رو پڑی اور روتی رہی اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

پھر میں نے بولنا شروع کیا لیکن وہ صرف اٹلے سدھے الفاظ تھے۔ میرے دل اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ



بیٹا یہ جو دنیا ہے کتے کی دم کی طرح ہے اس کو پکڑنے کی خواہش اور کوشش میں صرف چیخ و پکار اور محکن ہی ہاتھ آتی ہے۔

☆ طارق بلوچ صحرائی

عمر بھر کی کمائی میں بھی ایک عزادار نہیں ملتا۔ یہاں اکثریت آپ کو چالاک لے گی اور چالاک شخص سے بڑا کوئی بے وقوف نہیں ہوتا۔ ان کے کان کا سے میں گرنے والے سکوں کی جھنکار کے منتظر رہتے ہیں اور شاید کا سے میں پڑے ان سکوں کی وجہ سے وہ اس میں زندگی کا میٹھا شہد ڈال کر پینے کی لذت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

بابا کہتے ہیں۔ زندگی کا جام پینے کے لئے تمہارے پاس ایک ہی کاسہ ہے اگر اس کو سکوں سے بھر دو گے تو پھر پیاسے رہ جاؤ گے۔ یہاں کوئی فرض ادا کرنے والا نہیں ہوتا اسی لئے تو اکثریت کو حقوق نہیں ملتے۔ ان کی زندگیاں کتاب، علم اور روشنائی سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں قلم کی بجائے عقیدے کا خنجر ہوتا ہے، اسی لئے یہاں انسانیت لہو لہو پھرتی ہے۔ یہاں لفظ قرطاس پر اترنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ شاعری، اشعار اور غالب مرنے لگتے ہیں لائبریریوں کی جگہ تھینر کھٹنے لگتے ہیں اور پھر زندگی کی شاعری میں قلم اور سوچ، لفظ اور معانی خواب اور خوشبو، روشنی اور

انسان بھی عجیب ہے، عمر بھر بیساکھیاں بناتا رہتا ہے اور خود چلنا بھول جاتا ہے۔ وقت کے قبرستان میں کچھ لوگ تابوت کی مانند ہوتے ہیں جن کے در اور دل کسی صدا اور دستک سے نہیں کھلتے۔ دروازوں کو ہمیشہ کھلا رہنا چاہئے، جانے والوں کے لئے بھی اور آنے والوں کے لئے بھی۔ سنت رب بھی یہی ہے۔ جب کوئی رب سے مایوس ہو جائے تو آسمان والا بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر سے محبت کی نعمت واپس لے لی جاتی ہے اور پھر ایسا شخص تمام عمر دوسروں کی خامیاں تلاش کرتے اور کڑھتے ہوئے گزار دیتا ہے۔

غلام قوموں کا بھی عجیب مزاج اور مقدر ہوتا ہے ان کے دلوں کے برتن نفرتوں کا تیزاب رکھنے کی وجہ سے کھر درے اور بدنما ہو چکے ہوتے ہیں۔ رحمت خداوندی ہمیشہ بے عیب اور محبت کے پھولوں سے مہکتے برتنوں میں آتی ہے۔ یہاں غربت راج کرتی ہے، خوشیوں میں غربت، رویوں میں غربت، لبوں میں غربت، دلوں میں غربت اور ظرف میں غربت۔ یہاں

جاتی تھی اور دوسرا بھورے رنگ کا وہ کتا جو ہمیشہ بھونکتے ہوئے چیختے ہوئے اپنی ذم کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا گھومتا رہتا تھا مگر کبھی وہ اپنی ذم کو نہ پکڑ سکا تھا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا، میرے دودھ کے دانت ابھی فنا کی اذیت سے نا آشنا تھے۔ میں جب بھی بابا سے پوچھتا یہ کتا ایسا کیوں کرتا تھا؟ تب یہ اپنی ذم نہیں پکڑ سکتا تو چلاتا اور گھومتا کیوں رہتا ہے؟ اس کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔ بابا مسکراتے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑ لیتے اور خاموش ہو جاتے۔

اس دن شام نے گہرے سیاہ بادلوں کی سہ پٹی رکھی تھی اس رات میں تاریکی کے شانوں پر سر رکھ کر بہت رویا تھا اس رات بھی میں ہار گیا تھا ہمیشہ کی طرح اس شام میں کئی ہفتوں کے بعد اپنے والدین سے ملنے پڑوس میں ان کے گھر پہنچا تھا اس دن وہ دونوں بہت اداں تھے۔ میری ماں کی عمر کی کلائیوں سے جوانی کی چوڑیاں کب کی اتر چکی تھیں اس کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی اس کے برف چہرے پر درود کی نیلی رگیں ابھر آئی تھیں جھریوں نے چہرے کو کچھ کر لیا تھا اور میرا باپ بھی عمر کے اس حصے میں تھا جہاں لوگ جھولے جیسی نیند کی خواہش لئے فقط نیند کی رسم پوری کرتے ہیں ورنہ حقیقتیں انسان کو سونے نہیں دیتیں۔ اس عمر کے حصے میں کارواں سے پھڑ جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس عمر میں ذرا سی کسی کی بے رخی زخم بن جایا کرتی ہے۔

دونوں علم والے تھے، علم والے ردعمل نہیں دیتے، خوش ملے تو بھی خاموشی سے شکر ادا کرتے ہیں دکھ کا پہاڑ بھی گر جائے تو چیخ و پکار نہیں کرتے۔ اس دن دونوں کی آنکھیں ویران تھیں، جب میں نے ان کا حال پوچھا تو ماں بولی پتر تم شہر کی بے راستہ بھیڑ میں گم

اجالا، رنگ اور دھنک، جو جمالیات کے استعارے ہیں، ہجرت کرنے لگتے ہیں۔

ادب جو جمال کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کے ذوق کی تربیت کرتا ہے مفلسی کی قبا پہنے کسی درگاہ میں پڑا رہتا ہے۔ یہاں محبتیں ہجر اوڑھ لیتی ہیں۔ نین دید کے فاقوں سے مرنے لگتے ہیں اور آنکھ میں ٹھہرے ہوئے لوگ اجل کی جھیل کے ٹھہرے ہوئے ٹیڑھے رخ پانی کی تہہ میں اتر جاتے ہیں۔ غلام قوموں سے علم اٹھایا جاتا ہے۔ جہاں علم کی پیاس مر جائے تو وہاں خون کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے۔ میں لفظوں کی جگالی کرنے والا شخص تھا مگر میرا باپ ہمیشہ گہرے چپ کی بکل لئے پھرتا تھا۔ وہ کہتا تھا جہاں شور ہوگا وہاں شعور نہیں ہوگا۔ وہ بہرہ کر دینے والی خاموشی کا قائل تھا وہ کہتا تھا بحث مباحثہ، فضول گفتگو اور شور بندے کو اندر سے خالی کر دیتا ہے اور جو اندر سے خالی ہو جائے وہ فٹ بال کی طرح جوتے کی نوک پر دھر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ فٹ بال بھی اندر سے خالی ہوتا ہے۔ جوتا بھی اندر سے خالی ہوتا ہے اسی لئے پاؤں میں پہن لیا جاتا ہے۔ وہ کہتا تھا جہاں لاشوں کی بے حرمتی ہو جہاں ضمیر نہ کانپتے ہوں وہاں زمین کانپ جایا کرتی ہے۔

میری روح کی کیمسٹری بھی عجیب ہے جب زندگی اونٹوں کے قافلے کی طرح سیدی قطار در قطار اور خاموشی سے چل رہی تھی اور جب منزل پر پہنچانے کی ذمہ داری قافلہ سالار کی ہوتی تھی مجھے اس وقت بھی کارواں والوں سے قسمیں لینے کی عادت تھی۔ مجھے بھولنا نہیں آتا میری یاد ایزیاں نہ بھی رگڑے میرے اندر درد کے چشمے پھونٹے رہتے ہیں۔ زندگی میں مجھے دو چیزیں کبھی نہیں بھولیں۔ گاؤں میں ہماری زمینوں پر لگے ایک سبز شیشم کے پیڑ سے لپٹی ہوئی وہ ایک کاسی جس جو مجھے ایک لمحے کے لئے وجود سے عدم میں لے

طارق بلوچ صحرائی

2 اگست 1967ء کو ریتالہ خورد میں پیدا ہوئے۔ سات کتابیں لکھیں۔ دو افسانوی مجموعوں کو خوب پذیرائی ملی۔ کتاب ”سوال کی موت“ کو یو بی ایل ایوارڈ کے لئے نامزد کیا گیا۔ ”گو نگے کا خواب“ اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ بکئے والی کتاب ہے۔ بانو قدسیہ صاحبہ کی زندگی کی آخری تحریر اسی کتاب کا دیباچہ ہے۔

ہو چکے ہو اور اللہ کسی کو انتظار کا دکھ نہ دے۔ بیٹا خاموشیاں تعلق نگل جایا کرتی ہیں۔ میں نے بابا کی طرف دیکھا وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے تمہاری زباں سے گرے تو تلے الفاظ اب بھی گاؤں کی حویلی میں پھیل کے درخت کے نیچے گرے پڑے ہیں۔ بیٹا زہر احساس بھی ہوتا ہے بچھو کی کیا اوقات ہے۔ بیٹا موت تک زندہ رہنے میں کوئی قناعت بھی نہیں ہے اور پھر میں ہار گیا میرے ساتھ بھی عجب المیہ ہے۔ میری جیت کچھ عرصے کے بعد ہارنے لگتی ہے۔ میری ہر کامیابی نیچلی کی طرح اتر جاتی ہے۔ اس دن مجھے لگا میں کسی بڑے شہر کی مصروف ترین شاہراہ کے درمیان لگا ایک تنہا گرد آلود درخت ہوں جس پر شور اور آلودگی کی وجہ سے کوئی پرندہ بھی اپنا آشیانہ بنانے کو تیار نہیں۔ اس دن مجھے ایسے محسوس ہوا میں ہاتھ میں آئینہ لئے خود سے چپ رہا ہوں اور اپنی برنگلی چھپانے کے لئے سیاہ شب کا خطرہ ہوں۔

ہر آدمی صرف اپنے حصے کے خواب دیکھتا تھا اسی لئے تو نیند سے خیمے آباد تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے اس طرح محتاج تھے جیسے خنی سائلوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس دور میں کوئی مسافر سفر کرتا ہوا کسی آبادی میں پہنچتا تھا تو رات قیام کے لئے جو بھی در کھٹکھٹا تھا اس گھر کا باسی اسے اپنے گھر کی خوش بختی تصور کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے مہمان بناتا تھا اور اسے اللہ کی رحمت تصور کرتے ہوئے اس کی خوب خاطر مدارت اور مہمان نوازی کرتا تھا۔ اسی لئے تو لوگوں کی عمریں لمبی ہوا کرتی تھیں کیونکہ جتنا وقت آپ مہمان نوازی کو دیتے ہیں اتنا وقت آپ کی زندگی کا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس دور میں لوگوں کی ضرورتیں اور خواہشات کم ہوا کرتی تھیں۔

بابا کہتے تھے میری روحانی عمر کئی صدیوں کی ہے مگر تیری ماں کی روحانی عمر شاید بگ بنگ سے بھی پہلے کی ہے۔ لوگ زندگی کو انعام سمجھ کر شکر گزاری سے بسر

اور پھر میں یادوں کے جنگل میں کھو گیا۔ اداس خاموش، کم صم یادیں، پرانے گیتوں جیسی بھولی بھری یادیں، سلیمن زدہ یادیں۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ہم گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا برسات میں گھروں کی چھتیں پکا کرتی تھیں اور گھر کے پرانے برتن کچڑ نہیں ہونے دیا کرتے تھے۔ اس دور میں در دستوں سے آباد اور زخمی تھے۔ گھروں کو جانے والی پگڈنڈیاں آہٹوں سے زندہ تھیں۔ محلے آباد تھے، راستے

اور پھر میں یادوں کے جنگل میں کھو گیا۔ اداس خاموش، کم صم یادیں، پرانے گیتوں جیسی بھولی بھری یادیں، سلیمن زدہ یادیں۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ہم گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا برسات میں گھروں کی چھتیں پکا کرتی تھیں اور گھر کے پرانے برتن کچڑ نہیں ہونے دیا کرتے تھے۔ اس دور میں در دستوں سے آباد اور زخمی تھے۔ گھروں کو جانے والی پگڈنڈیاں آہٹوں سے زندہ تھیں۔ محلے آباد تھے، راستے

جس کو جس کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، نوج کر لے جاتا ہے۔ یہاں نفسا نفسی کا عالم ہے۔ یہاں شناسا بھی اجنبیت پہن کر پھرتا ہے۔ کسی صوفی، سالک کے الہام کی طرح یہاں انسانیت نظر نہیں آتی اور لوگ یہاں فقط جینے کے سلطان میں مبتلا ہیں۔ امن اور سکون یہاں مسافروں کی طرح رہتے ہیں۔

پھر میں کئی دن تک سوچتا رہا۔ میرے ساتھ بھی عجیب الیہ ہے میں دیر تک سوچوں تو میرے سامنے سے شیشم کے ساتھ لپٹی کاسنی نیل میری نظروں سے ہٹ جاتی ہے اور میرے سامنے بھورے رنگ والا وہ کتا آ جاتا ہے جو اپنی ڈم کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں گھومتا اور بھونکتا رہتا ہے۔ جب والدین شہر آنے کے لئے راضی نہ ہوئے تو میں ان سے جھگڑا کر کے شہر آ گیا یہاں آ کر میں نے بہت سے کاروبار کئے ہر جائز و ناجائز ذرائع سے میں نے بے حد دولت اکٹھی کی یہاں میں نے ایک بہت بڑا گھر تعمیر کروایا۔ دنیا جہاں سے اس کی تعمیر کے لئے اشیاء منگوائیں۔ اس کی لکڑی برازیل سے ٹائلیں ناروے سے اور دوسرا بہت سامان امریکہ اور یورپ سے منگوایا تو میرے گھر کو دیکھنے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ کچھ سالوں کے بعد میرے والدین بھی زمین مزارعوں کے حوالے کر کے میرے خاطر میرے گھر کے ساتھ تیسرے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ میں ہر مہینے کچھ دیر کے لئے ان سے ملنا ضرور جاتا تھا اگرچہ میری بیوی کو ان سے ملنا پسند نہیں تھا مگر میرے بچے دادا دادی کے دیوانے تھے۔

میرے پاس زندگی کی ہر نعمت موجود تھی، میرے ساتھ وہی ایک الیہ تھا میری جیت کچھ عرصہ بعد ہارنے لگی تھی۔ میرے اندر ایک عجیب سی بے چارہ شروع ہو جاتی تھی، میں شوق سے خریدی ہوئی چیز وہ سب اکٹھے لگا تھا۔ انہی چیزوں سے مجھے بورے

کرتے تھے لوگ جانتے تھے یہ کائنات عشق کی نسبت سے ملی ہے اسی لئے تو زندگی کے ساز میں سوز بہت ہے۔ کبھی کبھی بچہ معذور بھی پیدا ہوتا تھا مگر کبھی بھی روحانی و اخلاقی طور پر اپنا بچ پیدا نہیں ہوتے تھے۔ پھر ایک دن میں نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کی ضد شروع کر دی۔ میری ماں کی آنکھوں میں برسات برسنے لگی۔ بابا بولے بیٹا شہر جا کر کیا کرو گے؟ میں نے بھی پڑھائی کے دوران کچھ عرصہ شہر میں میں گزارا ہے۔ شہر نئے زمانوں کا کرب لئے غدھال یادوں کے ساتھ ضعیف لمحوں میں جی رہے ہیں۔ مجھے وہ زندگی پسند نہیں آئی۔ جب میں نے ضد کی تو بولے بیٹا جو وقت کی ڈھلوان سے پھسل جائے تو اسے بے چہرہ آوازیں بہت تک کرتی ہیں اور دور تک اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہے ہماری زمینوں پہ اگے شیشم کے سبز پیڑ کے ساتھ لپٹی کاسنی نیل کتنی بھلی لگتی ہے۔ نیل اور اس کے پھولوں کے چہروں پر کتنا پرسکون تبسم ہے۔ اطاعت میں جو راحت ہے، وہ فتح میں بھی نہیں۔ شہروں میں ہر شخص نے انا کی دستار پہنی ہوئی ہے اور وہ دوسروں کے جھکنے کا انتظار کر رہا ہے۔ انسان امیر وقت کی کرنسی سے ہوتا ہے مگر شہروں میں کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ سفر زندگی کا رس نچوڑ ڈالتا ہے۔ یہاں ہر لمحہ ہر کوئی سفر میں رہتا ہے مگر کوئی بھی سفر کی دعا پڑھتا نظر نہیں آتا۔ یہاں ہر شخص کے چہرے پر کوئی نہ کوئی مرثیہ لکھا ہوا ہے۔ یہاں شہر کے لوگ سومات مزاج ہیں اور کسی نا معلوم غزنوی سے خوف زدہ پھرتے ہیں۔ یہاں لوگ کیکر اگاتے ہیں اور فاختہ کے بیٹھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ یہاں کی کہانیاں اپنا عنوان خود تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ یہاں محبت کی شاعری متروک ہو چکی ہے اور لوگ اپنی عربیانی چھپانے کے لئے دوسروں کو تنگ کر دیتے ہیں۔ یہاں

گناہ اور اعتراف

وہ لمحے بدترین ہوتے ہیں جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے لیکن وہ لحاظات پر عظمت ہوتے ہیں جب انسان اپنے گناہوں کو سامنے رکھ کر اپنے ضمیر کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے اپنے ضمیر سے یہ کہتا ہے کہ لاؤ، یہ بوجھ میرا ہے، میں اسے اتار پھینکتا ہوں تو فرشتے بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔

ایک گناہ کو چھپانے کے لئے دو گناہ کرنے پڑتے ہیں۔ ان دو کو چھپانے کے لئے کچھ اور گناہ کرنے پڑتے ہیں حتیٰ کہ انسان گناہوں کی بھول بھلیوں میں بہک جاتا ہے۔ وہ اپنے راستے خود بند کر لیتا ہے اگر وہ اپنے پہلے گناہ کا سامنا کرے اور اس کا اعتراف خدا کے حضور کر لے تو خدا اس کا ہاتھ تھام کر ان بھول بھلیوں سے باہر لے آتا ہے۔

ہوں۔

پھر مجھے اس کاسنی تیل کے چھوٹے چھوٹے پھول یاد آتے جو سرسبز شیشم کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور پھر مجھے وہ کتا یاد آ جاتا جو اپنی ہی ذم کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں بھونکتا اور گھومتا رہتا تھا۔ پھر میں کچھ دنوں کے لئے گاؤں چلا گیا گاؤں کی صبح کسی دھندلے کی طرح کتنی حیا دار ہوتی ہے کھیتوں کھلیاؤں میں فطرت ہر لمحہ مسکراتی رہتی ہے۔ میں سوچنے لگ گیا ہم بھی کتنے ظالم ہیں۔ ہم اخلاقی، ذہنی اور روحانی اپنا بیج پیدا کر رہے ہیں۔ گاؤں میں ہماری حویلی خالی تھی۔ مکان مکینوں کے بغیر قبرستان ہوتا ہے اور پھر میں واپس شہر لوٹ آیا۔ اس شام خلاف توقع عجیب بات ہوئی میری بیوی جو میری اس حالت پر پریشان تھی میرے پاس آئی اور

ہونے لگی تھی جو کبھی مجھے بے حد محبوب ہوتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ہی میں نیا رنگ کر داتا تھائی ٹائلیں لگواتا تھا لان کے پودے بدلتا تھا مگر کچھ عرصہ بعد مجھے انہی چیزوں سے ٹھن آنے لگی تھی۔

مجھے اپنے والدین سے اختلاف تھا اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکے تھے، ان کو مال و دولت سے کوئی محبت نہ تھی۔ میں نے ایک دن بابا سے کہا مجھے لگتا ہے آپ میری کامیابی اور دولت سے خوش نہیں ہیں اسی لئے تو چپ رہتے ہیں اور میرے گھر نہیں آتے۔

بابا بولے بیٹا مجھے خاموش ہی رہنے دو میں نے لب کھولے تو تم اپنے ہی تعفن سے مر جاؤ گے۔ دولت سے تم سنا بن سکتے ہو مگر سکون نہیں، چاند سے مرعوب نہیں ہوا کرتے اس کی روشنی مستعار لی ہوتی ہے۔ سنو، صدا کا وجود کانوں سے متصل ہوتا تو کسی کو خوشبو کی آواز سنائی نہ دیتی شبنم کی گریہ زاری اور ہواؤں کے نغمے سنائی نہ دیتے۔ بدلی رت نے ایک دن بہار سے کہا کوئی بھی کہیں بھی مادرا نہیں ہے۔ سنو، پہلے پہل دنیا میں کھرا ہی کھرا تھا اور اندھیرا لوگ سردی سے ٹھنھرتے رہتے تھے پھر اس نے پتھر سے پتھر کو رگڑ کر آگ جلاتا سیکھ لیا یہ اس کی پہلی دنیاوی کامیابی تھی پھر اس کی ہر دنیاوی کامیابی اس کو پتھر کا بنا جاتی ہے۔

میں وہاں سے چلا آیا پھر کئی مہینے اپنے والدین سے ملنے مصروفیات کے باعث نہ جاسکا۔ وقت گزرتا رہا۔ مجھے میرا گھر برا لگنے لگ گیا ہر چیز سے نفرت ہونے لگی تھی پھر وہ المیہ میری جیت کچھ عرصہ کے بعد ہار میں بدلنے لگی تھی۔ دل بے چین تھا اور عجیب طرح کی بے سکونی تھی۔ کبھی مجھے لگتا مرکز بدل گیا ہے مگر محور وہی ہے کبھی لگتا محور بدل گیا ہے مگر مرکز وہی ہے کبھی مجھے لگتا میں بھر اور وصال کے درمیان کا ایک لمحہ

بیٹا ہمارے سوا تمہارا ہے ہی کون جب فرشتے اللہ رب العزت سے کہتے ہیں تیرا بندہ دنیا کے میلے میں گم ہو گیا ہے تیرے بلانے پر بھی تیری طرف رجوع نہیں کر رہا تو، تو ان کو عذاب کیوں نہیں کرتا؟ رب مسکراتا ہے فرشتو، میں ان کو تنہا کیسے چھوڑ دوں ان کا میرے سوا ہے ہی کون؟ بیٹا اگر آپ فرائض پورے کریں گے تو آپ کے حقوق چل کر آپ کے گھر پہنچیں گے۔ جب میں کاشمکاری کرتا تھا تو مصنوعی کھاد اور کیڑے مار دواؤں کا بے جا استعمال کر کے منافع کے لالچ میں قوم کی صحت کے ساتھ کھیلتا تھا اسی لئے تم نا فرمان تھے۔

پھر میں نے زمینوں پر قدرتی طریقے سے کاشت کی اور اس کی مخلوق کی صحت کا خیال کیا تم میں کچھ تبدیلی آئی مگر پھر بھی کچھ فاصلہ رہا پھر مجھے یاد آیا میں اپنی گاڑی گلی میں کمزری کرتا تھا جس سے لوگوں کو گزرنے میں تکلیف ہوتی تھی یہ مخلوق رب تعالیٰ کا کنبہ ہے جو اس کو ناراض کرے گا وہ خود خوش کیسے رہے گا؟ آج میں نے گاڑی اپنے گیراج میں کمزری کر دی تھی اور آج ہی تم میرے پاس چلے آئے۔

بیٹا یہ جو دنیا ہے کتے کی ذم کی طرح ہے اس کو پکڑنے کی خواہش اور کوشش میں صرف چیخ و پکار اور ٹھکن ہی ہاتھ آتی ہے۔ یہ ذم کسی بھی دنیا دار سے پکڑی نہیں جاسکے گی۔ بیٹا میری ایک نصیحت ہے رحمت للعالمین کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس کی مخلوق کے لئے رحمت بن جاؤ۔

میرے والدین کے میرے گھر شفٹ ہونے سے پہلے ہی میرے دل کو سکون کی دولت مل گئی تھی اور میرے یاد کے گلشن میں صرف شیشم سے لپی ہوئی سفید پھولوں والی کاشی بیل تھی کیونکہ میرے اندر کے نفس کا کتا اپنی دم پکڑنے سے تاب ہو چکا تھا۔



بولی مجھے لگتا ہے ہم امی ابو سے زیادتی کر رہے ہیں ان کی خدمت اور دیکھ بھال ہمارا حق بنتا ہے ہمارے بچے بھی دادا دادی کو بہت یاد کرتے ہیں مجھے ان کے پاس لے چلو میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اور ان سے درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے پاس رہیں۔

آج خلاف توقع بابا کی گاڑی گلی میں نہیں تھی ہم دونوں بچوں سمیت والدین سے ملنے اس کے گھر پہنچے میں نے ماں کے پاؤں چھوئے اور ان سے معافی کی درخواست کی ماں رونے لگ گئی اس کی سسکیاں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ ماں بولی میں تمہیں صرف اس شرط پر معاف کر سکتی ہوں جب تمہارا باپ تمہیں معاف کر دے۔ میں بابا کے پاؤں میں لپٹ گیا اور روتے اور سکتے ہوئے بوا۔ بابا مجھے معاف کر دو مجھے سکون نہیں ہے میری جیت ہماریں بدلنے لگ جاتی ہے میرے اندر اداسی اور خوف نے بھرا کر لیا ہے۔ میرے اندر بے چینی حد سے بڑھ گئی ہے مجھے معاف کر دیں۔ شاید مجھے سکون مل جائے۔

بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے مجھے اٹھا کر گلے لگا لیا بولے پتر اداسی اور خوف سے بکی آزادی کے لئے صدقہ دینا پڑتا ہے اور اس کا صدقہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے رب ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتا ہے۔ زندگی کے سفر کی منزل رضائے الہی ہے اور اس سفر کی کامیابی سکون ہے۔ سکون صرف سکون بانٹنے (Guilt free) زندگی گزارنے اور اللہ کے ذکر میں ہے اور ذکر کیا ہے؟ یہ احساس کہ عمل کرتے وقت یہ یاد رکھنا کہ نہ صرف وہ ہمیں دیکھ رہا ہے بلکہ اس عمل کے لئے ہم جواب دہ بھی ہیں یہی ذکر ہے۔

”بابا میں نا فرمان بنا رہا آپ دکھ سہتے رہے بابا آپ نے مجھے سمجھایا کیوں نہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

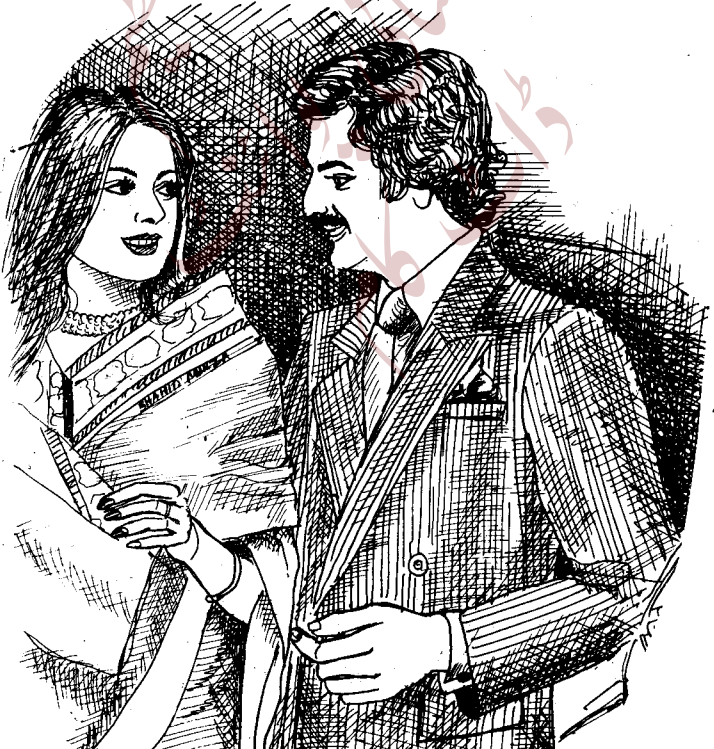
لالہ

”اگر میرے داماد جی کو ذرا سا بھی نقصان ہوا تو میں تم لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کروں کہ دنیا دیکھے گی۔“

قسط: 9

راوی: ڈاکٹر ممتاز اصغر

☆ محمد رضوان قیوم



ہوئے کہا۔ ”دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ کچھ کھائیں بیٹیں۔ میں تمہیں تمہارا من چاہا کھلاتی پلاتی ہوں.....“ اوئے یہ تم نے کیا بھیک منگوں جیسا جوڑا پہنا ہوا ہے۔ میں تمہیں ریڈی میڈ جوڑا دلواتی ہوں۔“

میرے مالی حالات واقعی بڑے خراب تھے۔ قرض پکڑ کر شاہدہ کی شادی میں جھونک دیا تھا۔ مجھے خود اپنے وجود سے بدبو محسوس ہو رہی تھی۔ ”تم ایسا کر کے میری عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچاؤ۔“ میں نے اسے کہا۔

اس نے بڑے عجیب مگر ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ”عبدالرحمان! تمہاری اور میری زندگی میں اتنا کچھ برا ہو چکا کہ اب عزت بے عزتی، غیرت کی باتیں کرنا فضول اور بے معنی ہے اور ویسے بھی اب ہم دونوں کے درمیان کیا کچھ چھپاؤ ڈھکارہ گیا ہے؟“ اس دن میں نے اور فریدہ نے خوب کھایا پیا اور گھوٹے پھرے۔

میں جب گھر گیا اور میں نے ابا کو بتایا کہ نصیر شاہ کے گھر والے اتنی تاریخ کے لئے آرہے ہیں تو وہ بھڑک اٹھے۔

”کہاں سے شادی کرے گا؟ تجھے نظر نہیں آ رہا گھر میں روکھی سوکھی روٹی کھانے کو ایک ٹکا بھی موجود نہیں ہے۔ نہیں نہیں انہیں چھ ماہ کے لئے ٹال دے۔“ ابا غصہ میں آگے میں مصیحا چپ ہو گیا۔

دوسرے روز واقعی نصیر شاہ، میری بہن، فریدہ کی ماں اور مظہر ہمارے گھر پھل، مٹھائی کا بڑا ٹوکرا اور ہمارے گھر میں موجود تمام لوگوں کے لئے ان سب کپڑوں کا ایک ایک جوڑا لے کر آئے۔ ابا کے لئے قیمتی شیردانی، کرت پاجامہ وغیرہ۔ ابا جو پہلے ہی ابھی ذہنی طور پر شادی کے لئے تیار نہ تھے انہوں نے ان لوگوں کو دیکھ

”انداز کی کیا کہانی تھی، مجھے تمہارے ایک ایک کرتوت کا علم ہے لیکن یہ سب کچھ بیکار ماضی کی باتیں ہیں۔ عبدالرحمان! مجھے یہ سب کچھ سن کر دکھ، افسوس ہوتا ہے۔“ فریدہ نے اپنی آنکھوں میں آنی نمی کو اپنی چادر کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ایک آدھ روز میں میرے گھر سے ابا جی، اماں اور ہو سکتا ہے بھابی یا ساجدہ تمہارے گھر میری شادی کی حتمی تاریخ لینے آ جائیں۔ حالانکہ یہ کام تو لڑکے والوں کا ہوتا ہے۔ خدا کے واسطے اپنے ابا سے کہنا ہمیں کوئی لمبی تاریخ نہ دے دیں۔“

”فریدہ! سچی بات یہ ہے ہمارے پاس کھانے، پینے جوگا کوئی روپیہ دھیلہ نہیں ہے۔“ میں نے اسے مایوسی سے کہا۔ ”ہم شادی کہاں سے کر سکتے ہیں؟“ فریدہ نے ہونکا بھرا اور پھر اس نے مجھے کہا۔ ”تم روپے پیسے کی فکر نہ کرو، میں اس کا بندوبست بھی کر دوں گی۔“

”پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟“ میں نے سختی سے کہا۔ ”تم نے پہلے بھی مجھے چوری کر کے روپے دیئے تھے۔ یاد نہیں ہے، میں اور تم بہت بڑے عذاب میں پڑ گئے تھے۔“

”ہاں، عبدالرحمان! میں تمہارے عشق میں دیوانی ہوں بلکہ تم نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”فریدہ! تم اب ٹھیک ہو۔“ میں نے کہا۔ ”پاگل نہیں ہو۔“

”اچھا چھوڑو بے کار فضول کی باتیں۔“ اس نے اکتا کر کہا۔ ”میں تمہیں شادی کے لئے پیسہ اور زیور دوں گی۔ یقین کرو اس بار چوری نہ کروں گی۔“

میں افسردگی میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”تم پریشان نہ ہو۔“ اس نے مجھے تسلی دیتے

ششدر ہو کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

”ابے چل باہر، میری نظروں سے دُخ ہو جا۔“
نصیر شاہ نے مظہر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تجھے بزرگوں کے سامنے ایسے بات کرنے کی کیسے جرأت ہوئی؟“
مظہر شرمندہ ہو کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

”چلو، آپ کی یہ بات بھی ہم مان لیتے ہیں۔“
نصیر شاہ نے مفاہمت آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ دو ماہ بعد عبدالرحمان کی بارات ہمارے گھر لے آئیں۔“

”دو ماہ بعد بھی ہمارے یہی حالات رہیں گے۔“
ابا نے کہا۔ ”کیا میرے پاس دو تین ماہ بعد کہیں سے روپے آ جائیں گے؟“

دراصل ابا کو کوئی مناسب جواب سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے تھے۔ باتوں باتوں میں نصیر شاہ نے ابا کو کہا کہ مجھے چند روز میں عدالت کی طرف سے بہت جائیداد، مکانات، دکانیں ملیں گی، ان میں سے ایک خوبصورت مکان ڈاکٹر شکلا کی جانب سے خالی کردہ ہے، اس میں فریڈہ کو بیاہ کر لے جایا جاسکتا ہے۔

”یہ کیوں بھئی؟ اس گھر میں کیا برائی ہے؟ ارے یہ کیا بلبے کا ڈھیر ہے؟“ ابا نے غصہ سے کہا۔

”بھائی جی! ناراض نہ ہوں۔“ فریڈہ کی ماں نے کہا۔ ”ہم نے آپ سے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔“

”آپ لوگوں نے اگر فریڈہ کو اس گھر میں بیاہنا ہے تو ٹھیک درنہ.....“ ابا مزید طیش میں آ کر بولے۔

”ورنہ کیا؟“ فریڈہ کی ماں پھر بولی۔ نصیر شاہ نے میری طرف تشویش والی نگاہ ڈالی۔ شرمندگی کے مارے میں اس سے نگاہیں نہ ملا سکا۔

”تم کیا کہتے ہو عبدالرحمان؟“ نصیر شاہ نے اپنی گردن موڑ کر مجھ سے پوچھا۔

”جی، میں آپ سے شام کو ملوں گا۔“ میں نے

کر بڑی بے رخی سے اپنا منہ دیوار کی جانب کر لیا۔ وہ صبح پڑھنے لگے۔ وہ کافی دیر تک یہ عمل کرتے رہے۔ وہ لوگ اپنی اور میں اپنی جگہ پشیمان سے ہو گئے۔ ماحول میں مکمل خاموشی طاری تھی بہن شاہدہ نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

”اباجی! سہیانے والے آئے ہیں۔“
”ہاں، مجھے پتہ ہے۔“ انہوں نے بڑے رد کھے پن سے کہا تھا۔ ”میں کیا کروں؟“

”بھائی صاحب! ہم بیٹی فریڈہ کی شادی کے لئے تاریخ لینے آئے ہیں۔“ فریڈہ کی ماں درمیان میں بولی۔ ”ہماری طرف سے تقریباً تمام تیاری مکمل ہے۔“

”ہاں مولوی صاحب! اب بہت دیر ہو گئی ہے۔“
نصیر شاہ نے بھی کہا۔ ”ہم بیٹی والے ہیں، زیادہ دیر بیٹی کو اپنے گھر بٹھانا اچھی بات نہیں ہے۔“

ابا نے دھیمے الفاظ میں کہا۔

”ارے بھائی! آپ کو ہماری مالی مشکلات کا تو پتہ ہی ہے۔ ہم ان حالات میں کیسے شادی کر سکتے ہیں؟ میری خواہش ہے کہ آپ لوگ چھ مہینے تک رک جائیں۔“

”ارے مولوی صاحب! گھر کی بات ہے، کچھ خرچ میں کروں گا، کچھ آپ کریں۔“ نصیر شاہ نے ابا سے کہا۔

”ارے آپ کیوں دیں گے؟ میں اپنے بیٹے کی شادی کا تمام خرچہ خود کروں گا۔“ ابا نے تیز لہجے میں کہا۔

”کہاں سے کرو گے؟“ مظہر درمیان میں بولا۔
”تم میرے داماد ہو، داماد ہی رہو۔“ ابا نے غصے سے کہا۔

”میرے ساتھ ایسی طعنیہ باتیں نہ کرو۔“
گھر میں موجود تمام لوگ ابا کی یہ بات سن کر سکتے میں آ کر پریشان ہو گئے۔ بالخصوص فریڈہ کی ماں نے

کہا۔ ”یہ بات ہم وہاں طے کر لیں گے۔“
 ”اس کا مطلب ہے کہ ہم نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔“ نصیر شاہ نے کہا۔ ”چلو بھی، فریدہ کی ماں! اس وقت مولوی صاحب غصے میں ہیں۔“

”بھائی! ہم نے آپ کی بیٹی کو پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ آپ کو سدھیوں کے ساتھ حسن سلوک سے ملنا چاہئے۔“ فریدہ کی ماں نے جب یہ جملہ کہا تو ابا مزید بھڑک اٹھے۔

”یہ آپ کا مجھ پر کوئی احسان نہیں۔“ وہ تیز آواز میں چلانے لگے تو شاہدہ نے روتے ہوئے ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
 ”ابا جی! خدا کے واسطے چپ کر جائیں۔“ شاہدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”میرا ہی کچھ خیال کر لیں۔“
 میں نے بات سنبا لے کے لئے ان لوگوں کو کہا کہ چائے پی کر جانا۔ تو فریدہ کی ماں نے کہا۔
 ”داماد جی! اس سے بہتر تھا کہ تم ہمیں زہر پلا دو۔“

”اپنی زبان کو قابو میں رکھ فریدہ کی ماں!“ نصیر شاہ نے غصہ سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”اور غصہ تھوک دو۔“ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اور ہاں عبدالرحمان شام کو ڈیرے پر لازمی آتا۔“
 پھر نصیر شاہ نے ابا سے الوداعی ہاتھ ملانا چاہا تو ابا نے بے رخی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ لوگ چلے گئے تو غصہ سے بھرے ابا نے ان کی خوب تذلیل کی۔
 ”میں آپ کا احترام کرتا ہوں ابا جان!“ میں نے ابا کو کہا۔ ”لیکن پہلی بار آپ کے سامنے یہ گستاخی کرنے لگا ہوں کہ میں خود نصیر شاہ کے ڈیرے پر جا کر وہاں اپنی شادی کی حتمی تاریخ دے دوں۔“

”میری طرف سے جہنم میں جا۔“ ابا نے بھڑک کر کہا۔ ”تو نے جو کرنا ہے اپنی ذمہ داری پر کر۔ میں نہ تو پوچھا۔“

”کون سی خوشخبریاں؟“ میں نے حیران ہو کر ”ایک خوشخبری میں تمہیں ابھی سنا دیتا

تیری شادی کے کسی معاملہ میں شرکت کروں گا، نہ کسی بات کا ذمہ دار ہوں گا۔“

میں اس کے بعد سیدھا شیدے کے پاس گیا۔ اسے میں نے تمام صورت حال بتائی۔ بالخصوص اپنے کنگھے پن اور فریدہ کی جانب سے زیور اور نقدی دینے کے بارے میں گفتگو کی تو اس نے کہا چل موہن داس کے پاس چلتے ہیں۔

ہم جب موہن داس کے پاس پہنچے تو ساری بات سن کر اس نے مجھے کہا کہ تو فریدہ سے بے دھڑک زیور روپیہ پکڑ لے۔ کیونکہ اب نصیر شاہ کو بہت جائیداد مل گئی ہے۔ اس کے پاس بہت مال دولت ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اگر فریدہ نے اس بار اس کی چوری کی تو وہ اتنا بڑا ایکشن لے گا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واقعی وہ زیور اور روپیہ فریدہ کی ملکیت ہو۔“

”عبدالرحمان! ٹو کہاں سے شادی کے پہاڑ جتنے اخراجات برداشت کرے گا؟“ شیدے نے درمیان میں کہا۔ ”تمہارا مکان اور دکانیں پہلے ہی گرو دی رکھی ہوئی ہیں۔ قرضہ تم پر چڑھا ہوا ہے۔ تمہارے پاس پھولی کوڑی بھی نہیں ہے۔ چل وہ بعد میں نصیر شاہ جیسا وعدہ کر رہا ہے فریدہ کے صے کی جائیداد میں سے روپیہ دے کر چھڑا لے گا لیکن ٹو سر پر آئے اس بھاری خرچہ کے بارے میں سوچ۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ تو فریدہ سے مال پکڑ لے۔ یہ مجبوری کا سودا ہے۔ بتا تیرے سامنے اس کے سوا اور کون سا راستہ ہے؟“

”ارے عبدالرحمان! تیرے لئے مزید خوشخبریاں ہیں۔“ موہن داس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”کون سی خوشخبریاں؟“ میں نے حیران ہو کر

تجھے پہلے ہی کہا ہے کہ یہ باتیں نصیر شاہ کے سامنے اس کے مشورہ سے کروں گا۔ یہ خوشی تجھ سے سنبھالی نہیں جائے گی تو کہیں کوئی گزبزد کر دے گا۔ اسے سر پرانز ہی رہنے دے۔ چل نصیر شاہ کے پاس چلتے ہیں۔

ہم لوگ نصیر شاہ کے ڈیرے پر پہنچے تو اس نے ہمیں اپنے ڈیرے کی بیشک میں نہیں بٹھایا بلکہ ڈیرے کے اندر اپنے بڑے کمرے میں لے گیا۔

”ارے سب آؤ، داماد جی اور ان کے جگری دوست آئے ہیں۔“ اس نے سب کو آواز دی۔

”پہلے مظہر، بیچا پھر بہن شاہدہ کمرے میں آئے اس کے بعد فریدہ کی ماں اور بڑے دھیمے شرمیلے قدموں کے ساتھ شرماتے ہوئے فریدہ بھی وہاں آ گئی۔

”ارے آ جاؤ، چل سامنے بیٹھ جا۔“ نصیر شاہ نے پیار بھرے انداز میں اس سے کہا۔ ”اب تیری کوئی پردے والی بات تو ہے نہیں۔“

فریدہ اپنے چہرے پر چادر ڈال کر ایک طرف چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”ارے کیا بات ہے آج تینوں جگری دوست جتھے کی صورت میں مجھ غریب کے ڈیرے پر آئے ہو؟ نصیر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔“

”آج بڑا خاص الخالص دن ہے۔“ موہن داس بولا۔ ”آج آپ نے بہت اہم بلکہ بہت تاریخی فیصلے کرنے ہیں۔ آج میں آپ کو بہت سی خوشیوں کی خبر سناؤں گا۔“

”پہیلیوں میں نہ ڈالیں، بتائیں آپ کون خوشخبریاں سنانے والے ہیں؟“ فریدہ کی ماں نے ج کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ آج ہم آپ کو فریدہ عبدالرحمان کی شادی کی حتمی تاریخ دیں گے۔ ایک تو

ہوں۔“ موہن داس نے کہا۔ ”اور دوسری خبر کے بارے میں نصیر شاہ سے مشورہ کرنا پڑے گا کیونکہ یہ حساس اور احتیاط والا معاملہ ہے۔“

”یار! میرا دل ہول رہا ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”چل پہلی ہی خوشخبری بتا دے۔“

”ارے پگے، ٹو اب فریدہ سے شادی کرنے کے بعد ایک بہت بڑی جائداد اور زرعی اراضی کی مالک جاگیر دارانی کا شوہر ہوگا۔“ موہن داس نے کہا۔ ”میں نے بھاگ دوڑ کر کے ساجدہ اور فریدہ کے حصے میں آنے والی جائداد کی قانونی منتقلی کروا دی ہے۔ فریدہ کے حصے میں پانچ فیسی مکان اور 9 کھلے زمین آئی ہے۔ اس کی ویلیو اس وقت تیری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔“

میں یہ سن کر خوشی سے پھولے نہ سما۔

”ارے یہ ٹو نے بڑی پھر کی طرح کام کیا۔“

شیدابولا۔

”میں نے یہ سارا کام تیرے یار کے لئے کیا ہے۔“ اس نے مجھے گلے لگا کر کہا۔ ”ارے ہم پولیس والے ضرور ہیں لیکن یاروں کے یار ہیں۔“

”ابے شادی کے بعد ہم دوستوں کو چھوڑ تو نہیں دے گا؟“ شیدہ نے کہا۔

”تم میرے دوست تھوڑی ہو۔“ میں نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے مخلص، ہمدرد بھائیوں کی طرح ہو۔“ میں نے ہمیں آزمایا ہے۔“ پھر میں نے موہن داس کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اچھا یہ تو بتاؤ کہ میرے لئے دوسری خوشخبری کیا ہے؟“

تجسس کے مارے میرا حال ہے۔

”بس یوں سمجھ لے آج کل اوپر والا تجھ پر بڑا مہربان ہے۔“ موہن داس نے مجھے گدگداتے ہوئے کہا۔ ”تیرے ستارے بڑے عروج پر ہیں۔ میں نے

کو بتایا کہ میں نے آپ کو جو جائیداد کوٹ سے ملی ہے اس میں سے قاتلوں میں آنے والی زمین (دو کنال کرشل) کو آپ کے حصہ میں ڈلو کر اسے اپنے نام کر دیا ہے۔ یہ دیکھیں آپ نے جو زمینوں جائیداد کی تفصیل کی فہرست مجھے دی تھی اس میں یہ زمین شامل نہ تھی۔ اسے میں نے مل ملا کر آپ کے کھاتے میں ڈال کر اپنے نام کر دیا ہے اور ویسے بھی یہ رقبہ آپ کا تھا ہی نہیں، یہ لا وارث رقبہ تھا۔“ نصیر شاہ نے ششدر انداز میں پہلے منہ بنایا اور پھر مصنوعی سا مسکرا کر بولا۔

”ارے یہ تو آپ کی کم از کم مزدوری بنتی تھی۔“ فریدہ کی ماں بولی۔

”بھائی! آپ نے جو کام بھی کرنا تھا ہمیں کم از کم اعتماد میں لیتے۔“

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں بہن جی!“ موہن داس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ پریشان ہیں تو میں اسے کل ہی آپ کی جانب موڑ دیتا ہوں۔“

”ارے نہیں موہن صاحب! یہ عورت تو خواہ خواہ فضول باتیں کر رہی ہے، اسے کیا معلوم کہ ہمیں جو آج جاگیر ملی ہے وہ آپ کی بدولت ملی ہے۔“ شیدا نکھیں سے حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کنائے میں کہنا چاہ رہا تھا کہ موہن داس نے بڑے طریقہ سے اپنا الوسید کا کیا ہے۔

وہاں موجود سب خوشی سے چمک رہے تھے بالخصوص نصیر شاہ، مظہر، چچا جبکہ ساجدہ مسلسل اپنا سر زمین کی جانب جھکائے بنی ہوئی تھی۔ ساجدہ کی شکل و صورت بڑی دلکش جاذب نظر تھی۔ جبکہ فریدہ سانولی اور عجیب سے نفوس کی حامل تھی۔

”ہاں، تو داماد جی! آپ کا اب کب بارات لانے کا پروگرام ہے؟“ فریدہ کی ماں نے بڑے چھتے ہوئے انداز میں مجھ سے کہا۔ ”مولوی صاحب تو ہم

خوشی، دوسری یہ کہ میں نے ساجدہ، فریدہ کے حصے میں آنے والی تمام جائیداد، زمین باقاعدہ قانونی طور پر میونسپلٹی کروا کر کلیئر کروا لی ہیں۔“

”کیا کہا؟“ نصیر شاہ نے چونک کر کہا۔ وہ خوشی سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ موہن صاحب! آپ نے اتنا بڑا اور مشکل کام اتنی جلدی کر دیا ہے۔ ارے میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالو میں یہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“

”یہ سچ ہے، اس کا یقین کر لیں۔“ موہن داس نے اطمینان سے کہا۔ ”میں جو کام کرتا ہوں خلوص اور دل جمعی سے کرتا ہوں۔ شاہ صاحب آپ کی جانب سے دیئے گئے سارے روپے پیسے میں نے سچ جگہ لگائے ہیں۔ ہاں اس کا جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے ایک آدھ بوتل کیٹرس شراب کی ضرورت اپنی مزدوری کی شکل میں لی ہے۔“

”ارے واہ موہن صاحب!“ نصیر شاہ نے جوش و خروش سے کہا۔ ”میں تو اب نواب بن گیا ہوں۔ دل خوش کر دیا موہن صاحب! کیٹرس کی بوتل تو کیا اس سے جو بھی قیمتی شراب کے کارٹن پہ کارٹن پلاؤں گا اور اس کے ساتھ آپ کو منہ مانگا ناعام بھی دوں گا۔“

”ارے میں پولیس والا ہوں، اپنا انعام خود ہی نکال لیتا ہوں۔“ موہن داس نے کہا۔

”کیا مطلب میں آپ کی یہ آخری بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں؟“ نصیر شاہ بڑی چپکٹی باتیں کرتے ہوئے یلدم رک گیا۔

”ارے آپ تو اس طرح پریشان ہو گئے جیسے کہ میں نے آپ کا کوئی تاج محل مار لیا ہو۔“

”نہیں نہیں موہن صاحب! مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ تب ہی تو میں نے آپ کو اپنی پوری جائیداد کو کلیئر کروانے کا کہا تھا۔“ پھر موہن داس نے نصیر شاہ

گی۔

سے شدید ناراض ہیں۔ لگتا ہے ہم نے ان کی بھینس مار لی ہے۔“

”اللہ کی بندی، موقع محل دیکھ کر کوئی بات کیا کر۔“ نصیر شاہ نے غصے سے کہا۔ ”دیکھ نہیں رہی داماد جی اور ان کے دوست ہمارے لئے کئی خوشیاں لے کر آئے ہیں۔“

”عبدالرحمان! سوا مہینے کی تاریخ دے دیں؟“ شیدے نے مجھے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اتنے میں ڈاکٹر شکلا کا مکان بھی ہم توڑ چھوڑ کر نیا ڈالیں گے۔“

”یار! تُو جیسا مناسب سمجھ دینی بات کر دے۔“ میں نے شیدے کو کہا۔ ”میری طرف سے کوئی اعتراض نہیں؟“

”ارے خیر سے تیری بہن شاہدہ موجود ہے، یہ آخری فیصلہ کرے گی۔“ رونکھی ہو گئی اور اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

”ارے بہن! بس اگلے سے اگلے مہینے کے پہلے جمعے کا دن رکھ لیتے ہیں۔ میرے خیال میں اس دن دوپہر کے روز ہم بارات لے آئیں گے۔“ شیدے نے کہا۔

میں نے شاہدہ کو سر کے اشارے سے کہا کہ تو ہاں کر دے۔

شاہدہ نے سب کے سامنے تاریخ دے دی۔ ”چل بے مظہر! بازار سے پتے والی برنی کی اچھی مٹھائی اور موہن صاحب کے لئے تین کیٹرس کی بوتلیں لا۔“ نصیر شاہ نے مظہر کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔ مظہر اسی وقت بازار چلا گیا۔

”اچھا چل چند اور ضروری باتیں طے کر لیں۔“ مظہر کے جانے کے بعد نصیر شاہ نے کہا۔

جو باتیں طے پائیں ان میں سے چند یہ تھیں۔ (1) فریدہ بیاہ کر ڈاکٹر شکلا کی کوٹھی میں جائے

(2) ابا کو منا کر انہی سے نکاح پڑھوایا جائے گا۔

(3) ڈاکٹر شکلا کی خالی کوٹھی کی مرمت کا خرچ

میرے ذمہ تھا جس پر لاگت کا تخمینہ 900/- روپے آ

رہا تھا اس کی ہاں شیدے نے میری کسر پر ہاتھ مار کر بھر

لی تھی۔ حالانکہ میں نے اسے کہا تھا کہ اتنے روپے کہاں

سے آئیں گے لیکن وہ نہ مانا تھا اس نے میری جانب

سے ہاں کر دی۔ اس محفل میں بارات کے کھانے وغیرہ

کے دیگر معاملات بھی طے ہوئے۔ شیدے نے وہاں کہا

کہ میں اپنے دوست کی شادی کی ”دوٹی“ لے کر آؤں

گا۔

(دو لہے کا گہرا دوست دیگر دوستوں کے ساتھ

شغل میلا کے لئے بیٹنڈا باجے کے ساتھ دولہا کے لئے

تھنڈا لاتا ہے۔)

موہن داس نے فریدہ سے پوچھا۔ ارے بھابی

تمہارے دولہا کو شادی والے روز کون سا لباس

پہنائیں۔

”ان کا جوڑا میں خود خریدوں گی۔“ فریدہ نے

شرماتے ہوئے کہا۔

”تم خریدو گی؟“

”ہاں، میں۔ کیوں، کیا میں اپنی محبت چاہت

کے لئے ایسا بھی نہیں کر سکتی؟“ اس کی یہ ایسی مضحکہ خیز

فرمائش سن کر سب ہنسنے لگے۔

”فریدہ! تُو صرف اپنی پسند بتا دو۔“ اس کی ماں

نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”باقی ہم پہ چھوڑ دے۔“

حالانکہ یہ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی، یہ تو بڑوں کا

کام ہوتا ہیں فریدہ نے ضد بھرے انداز میں کہا۔

”نہیں، میں اپنا اور عبدالرحمان کا شادی کا جوڑا

خود پسند کروں گی۔ آپ لوگوں نے ساجدہ کی مٹگنی کے

وقت بڑا گنواروں والا لباس خریدا تھا۔“

”شاہ جی! میں آپ کو نہ تو ڈرا رہا ہوں اور نہ ہی آپ کو کوئی ایسی بُری خبر سنا رہا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں۔“ موہن داس نے اطمینان سے کہا۔

”جو کہنا ہے جلدی کہہ دو۔“ نصیر شاہ نے تشویش زدہ انداز میں آنکھوں کے ذیلے گھمائے۔

”دراصل معاملہ یہ ہے کہ انسپکٹر تاجا رام اسی ہفتہ موسیٰ خان کو اپنی حوالات سے فرار کرائے گا۔“ موہن داس کی جگہ شیدے نے کہا۔ ”تاجا رام نے تھانے کی حوالات میں موسیٰ خان سے ملوایا ہے۔ موسیٰ خان نے مجھے کہا ہے کہ میں ہر صورت میں عبدالرحمان سے اپنا پستول ضرور لوں گا اور اسی کے ہاتھوں سے لوں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی یہ کام تو تم خود بھی کر سکتے ہو۔“ نصیر شاہ نے کہا۔

”شاہ صاحب! وہ ایک دشمن دار اور ضدی پٹھان ہے۔“ شیدا بولا۔ ”انسپکٹر تاجا کہتا ہے کہ ایسا کر لینا عبدالرحمان کے حق میں بہتر رہے گا۔“

”اس میں کچھ ہرج بھی نہیں ہے۔“ موہن داس نے شیدے کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”شیدا عبدالرحمان کو موسیٰ خان کا پستول دے گا اور وہ اسے اس کے حوالے کر دے گا۔“

”دیکھ لو مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ

اپنے سر پر تشویش انگیز انداز میں ہاتھ رکھا۔

”اس ساری بات کا کوئی سرچر نہیں ہے۔ ایک گرفتار ملزم ایسی شرط کیسے منوا سکتا ہے؟“

”شاہ جی! یہ آپ کے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔“ موہن داس نے کہا۔ ”بہتر ہے یہ معاملہ آپ ہم دونوں پر چھوڑ دیں۔ اسے ہم دونوں خود اپنے طریقہ سے سنبھال لیں گے۔“

”ارے کہیں موسیٰ خان داماد جی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“ نصیر شاہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

نصیر شاہ نے فریدہ کی ماں کی جانب دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی، میں اپنی بیٹی کو اس کے دولہا اور اس کے عر دی کپڑوں کے لئے پیسے دے دوں گا، میری بیٹی اپنی مرضی سے کپڑے لے گی۔“

”ارے بھالی! جوتے، بنیان دیگر چیزیں بھی آپ خریدیں گی؟“ شیدے نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”نہیں یہ چیزیں یہ خود خریدیں گے۔“ فریدہ نے کہا۔

نصیر شاہ نے دو بڑے نوٹ اپنی جیب سے نکال کر مجھے دے دیئے کہ ان سے جوتے اور بنیان وغیرہ خرید لوں۔

اے ایس آئی موہن داس نے کوئی بات نصیر شاہ کے کان میں کی تو نصیر شاہ نے اس کمرے میں موجود سب عورتوں کو کہا کہ چلو تم سب یہاں سے جاؤ، ہم نے کچھ اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔

”اب کون سی ضروری باتیں کرنی ہیں؟“ فریدہ کی ماں نے طنزیہ کہا۔ ”ہمارے سامنے کرلو۔“

”عورتوں کے سامنے کرنے والی باتیں کر لی ہیں۔“ نصیر شاہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”اب کچھ مردوں والی باتیں کرنی ہیں۔“ ساری عورتیں کمرے سے چلی گئیں۔

”سب قریب قریب آ جاؤ۔“ موہن داس نے کہا۔ ”بڑا اہم اور حساس معاملہ ہے۔“ اے ایس آئی موہن داس نے جب یہ جملہ کہا تو میرا دل ڈولنے لگا۔

”موہن صاحب! آج خوشی کا موقع ہے۔“ نصیر شاہ نے ہونٹوں کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ڈرانے والی یا ہولناک بات یا بُری خبر نہ سنانا۔“

گندگی کے آس پاس رہنے والا آخر بدبو کا احساس کھودیتا ہے۔ غلط افکار بھی ایک گندگی ہیں، پہلے بُرے لگتے ہیں پھر ماحول کے اثر سے بھلے لگنے لگتے ہیں۔

جواد حیدر - تلہ سنگ

”تو آپ کا کیا مطلب ہے؟“ نصیر شاہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”آپ خود ہی ذرا غور کریں۔“ موہن داس نے جواباً کہا۔ ”اب تک جو ہم نے آپ کا اور آپ کے داماد جی کا اتنے بڑے نامکن اور دشوار ترین کاموں میں ساتھ دیا ہے اس میں آپ کو رتی بھر کھوٹ یا بے ایمانی نظر آئی ہے۔ اگر آپ کو ہماری نیت پر شک ہے تو ہم ابھی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”ارے نہیں، آپ میری بات کو غلط سمت لے جا رہے ہیں۔“ نصیر شاہ نے فوراً منہج کر کہا۔ اتنے میں اتفاق سے مظہر مٹھائی اور شراب لے آیا۔

میں جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا، میں نے گرم ماحول کو خوشگواریت میں بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ خوشی کا موقع ہے، بحث کرنے کی بجائے اس سے لطف انداز ہوتے ہیں۔ چلو مٹھائی کھاؤ اور شراب پیو۔ یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔“

مظہر چار بوتلیں شراب کی لایا تھا۔ ان میں سے اس نے تین ہماری محفل میں دیں اور بقیہ ایک وہ اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ شراب کے مخصوص گلاس نصیر شاہ نے اپنی چارپائی کے نیچے سے نکالے تھے۔

مجھے یہ ماحول دیکھ کر دلی طور پر کراہت محسوس رہی تھی۔

”داماد جی! تم اندر جاؤ۔“ نصیر شاہ نے میرے

”ارے اس کی مجال ہے کہ وہ ہمارے یار کا بال بھی بیکا کر سکے۔“ موہن داس نے غصے سے کہا۔ ”ہم اپنے یار کی پیٹھ کے پیچھے اور آگے ڈھال کی مانند کھڑے ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ شیدے نے میری کمر پر تھکی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں موسیٰ خان کا پستول گولیوں سے خالی کر کے دوں گا۔ میں نے پستول چیک کیا ہے اس میں صرف دو گولیاں ہیں، وہ میں اپنی جیب میں رکھوں گا اور دوسرے میں انسپکٹر تیجا کو کہوں گا کہ وہ خالی ہاتھ موسیٰ خان کو حوالات سے فرار کرائے۔“

”اگر میرے داماد جی کو ذرا سا بھی نقصان ہوا تو میں تم لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کروں کہ دنیا دیکھے گی۔“ نصیر شاہ نے تنبیہ کے انداز میں دونوں کو کہا۔

”شاہ صاحب! یہ آپ کا داماد اب بن رہا ہے۔“ شیدے نے غصے سے اپنی آواز کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے یہ ہمارا جگری دوست ہے۔ اس کے لئے ہم بالخصوص میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔“

”ارے کیا آپس میں بیکار کی بحث کر رہے ہو۔ آگے کی سوچو کیا کرنا ہے۔“

موہن داس نے اپنے مخصوص انداز میں بولتے ہوئے کہا۔

”اب جو کرنا ہے تم دونوں نے اپنی عقل اور احتیاط سے کرنا ہے۔“ نصیر شاہ نے دونوں سے کہا۔ ”معاف کرنا رشید صاحب! میں اب کوئی نیا قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔“

”شاہ صاحب! اگر اس دنیا میں جینا ہے تو جواں مردوں کی طرح دلیری سے جیو۔“ موہن داس نے کہا۔ ”یہ کپوتوں، خرگوشوں کی طرح ڈرتے ڈرتے جینا بھی کوئی جینا ہے۔ یہ مفادات کا دور ہے، یہاں ہر کوئی اپنا مطلب نکال رہا ہے۔“

خرافات ہمارے گھر کا حصہ ہیں۔“ فریدہ کی ماں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میری کوئی سنتا ہی نہیں کیا کروں؟ چلو چھوڑو، یہ ان کا فعل ہے، ان لوگوں کو اپنا کام کرنے دو، آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ ہم لوگوں نے فریدہ کی شادی کے لئے کیا کیا تیاریاں کی ہوگی ہیں۔“

فریدہ کی ماں نے مجھے چھیر کی چیزیں اعلیٰ پکڑے، قیمتی برتن، زیورات وغیرہ دکھائے یہ وہ اعلیٰ چیزیں تھیں جن کا تصور میں تو کیا بڑے بڑے مالدار لوگ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں، ساجدہ اور بہن شاہدہ جان بوجھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ دراصل مجھے اور فریدہ کو ملنے کا موقع دے رہی تھیں۔ اب کمرے میں اور فریدہ رہ گئے۔

فریدہ اس دن پہلے سے زیادہ کالی سی لگ رہی تھی۔ اس کا پورا ہاتھ پیپ وار پیلے کالے دانوں سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔

”یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ اس نے کہا۔

”میری وجہ سے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”تمہاری بے وفائی سے میں دیوانی ہو گئی تھی۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے دیوانے پن کا جو گورے ڈاکٹر نے علاج کیا ہے یہ اس کی دوائیوں کا رد عمل ہے۔ میرے سر میں ابھی تک درد ہوتا ہے۔ سچی بتاؤ تم مجھ سے شادی کے بعد اتنی ہی سچی محبت کرو گے جیسا کہ تم اس کا دعویٰ کرتے ہو؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”تم جو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو تو میں کیوں نہ کروں گا؟“

ہم دونوں نے اس دن بہت محبت بھری باتیں کیں۔

کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اگر چسکی لینی ہے تو اندر جا کر مظہر کے ساتھ سنگت کر لو۔ میں تمہارے یاروں کے ساتھ اپنا طلق لڑوا کروں گا۔“

ہر دین نے مٹھائی کے ٹوکے میں سے کافی پتے والی برنی اٹھا کر مجھے کہا کہ بھائی جان یہ آپ اندر لے جائیں۔ میں مٹھائی لے کر سیدھا بہن شاہدہ کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں پہلے ہی سے فریدہ، ساجدہ اور اس کی ماں موجود تھیں۔

”ارے یہ کبخت سارے دارو پنی رہے ہیں، میرا تو انہیں دیکھ کر دل جلتا ہے۔“ فریدہ کی ماں نے یہ جملہ بد اسامہ بنا کر کہا۔

”ابا جی اور بھائیوں کو شرم نہیں آتی۔“ ساجدہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کسی کے سامنے یہ گندا کام کرنا چاہئے کہ نہیں۔“

”آپ لوگ یہ پتے والی مٹھائی تو کھائیں۔“ میں نے ماحول کو بد لنے کے لئے کہا۔

اتنے میں مظہر ہاتھ میں شراب کی بوتل پکڑے ہوئے اندر آیا اس نے پہلے تو مجھے بڑے غور سے دیکھا اور پھر اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”پیو گے؟“

”جی میں شراب نہیں پیتا۔“ میں نے کہا۔

”ارے یہ تو مردوں کا کام ہے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس کے پینے سے رکا ہوا دماغ تیزی سے چلتا ہے۔ نئی نئی سوچوں کے چشمے دماغ سے پھوٹتے ہیں۔“

فریدہ کی ماں نے اسے دھتکتے ہوئے کہا۔ ”جمل دفع ہو، اپنے شرابی بھائی کے ساتھ یہ گند اپنے منہ پر لگا۔“

وہ چلا گیا۔

”داماد جی! معافی چاہتی ہوں، بد قسمتی سے یہ

”چلو یہ باتیں کر کے مجھے اور اپنے آپ کو تکلیف نہ دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔
 ”آپ کو اندر ابا جی بلا رہے ہیں بھائی جان!“
 ساجدہ نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔
 میں جب دوبارہ ان لوگوں کے درمیان آیا تو تینوں نشہ میں دھست تھے۔

”داماد جی! میرے حساب میں تیرے یہ دونوں دوست تیرے غلط اور تجھ پر جان چھڑکنے والے ہیں۔“ نصیر شاہ نے مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تجھے یہ جیسا کہیں ٹوٹنے دیا ہی کرنا ہے اور ہاں دوسری بات یہ کہ تمہارے ابا مولانا اسٹیل صاحب کو شادی سے پہلے راضی کرنا ضروری ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ تیرا نکاح خود پڑھائیں۔ اگر تمہارے ابا اس شادی میں نہ بیٹھے تو میری برادری میں ناک کٹ جائے گی۔“

میں دل سے یہ نہیں چاہتا تھا کہ ابا کو شادی کے معاملات میں شامل کیا جائے کیونکہ وہ ضدی طبیعت کے حامل تھے۔ میں نے نصیر شاہ کو ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے میری بات کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ میں اور موہن داس صاحب تیرے ابا کو منانے تیرے گھر آئیں گے۔

فریدہ کی جانب سے دی گئی سونے، اشرفیوں والی تھیلی میرے کرتے کی جیب میں جب چھنکی تو نصیر شاہ نے پرجسس طور پر مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے اسے ٹالنے ہوئے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب اس نے دوبارہ ارادنا مخاطب کر کے پوچھا کہ عبدالرحمان یہ ٹوٹنے کیا اپنی جیب میں کوئی زیور کی پوٹلی رکھی ہے تو میں اس کے اس سوال پر پریشان ہو گیا۔

(اگلے ماہ اس سنسنی خیز کہانی کی آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

”تم نے یہ کیوں کہا کہ اپنے دولہا کا لباس خود خریدو گی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں تمہیں اپنی پسند کا لباس پہناؤں گی۔“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ایسا لباس جو تم پر بچے اور تم اس میں شہزادے لگو۔ تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں کو اور دل کو سکون ملے۔۔۔۔۔ میری ماں بھائیوں کی پسند وہی اُن پڑھ جالوں والی ہے۔ میں تمہیں سب سے الگ تھلگ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

پھر اس نے مجھے ایک پہلے رنگ کی ریٹھی تھیلی دیتے ہوئے کہا کہ اس میں تقریباً گیارہ تولہ سونے کے علاوہ دس اشرفیاں اور کچھ قیمتی ٹکینے ہیں۔ ایک جھوٹا سا ہیرا بھی ہے۔ اسے تم فروخت کر کے شادی کی تیاریاں کرو۔ میں پہلے ہی نکلے نکلے کوہنجا تھا، میں نے اس کے ہاتھوں سے فوراً وہ ریٹھی تھیلی پکڑ کر اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لی۔

”اسے احتیاط سے استعمال کرنا۔“ اس نے کہا۔
 ”ان زیورات میں ایک قیمتی ہیرا بھی ہے جو کہ لگ بھگ اڑھائی ہزار روپے کا بکے گا۔“
 ”یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”مجھے غصہ نہ دلاؤ عبدالرحمان!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ شادی کے بعد ہماری زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔ اب تو مجھے لاکھوں کی قیمتی جائیداد مل گئی ہے اور اب تم ایک رئیس بیوی کے شوہر کہلاؤ گے۔“

”ارے مجھے تو تم چاہئے ہو یہ جائداد، روپیہ میرے سامنے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔“ میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔

اس دن میں نے اسے صاف صاف کوئل سے محبت اور اس کے قتل کا بتا دیا۔

اگر اپنی نماز مال سعودی بھائی خوش ہوندے نے تے آپاں دا کی جاندا اے!

ضرب سکندری



سولجر نامہ

سعودی عرب میں تین سال

قسط: 17

halechsk@yahoo.com

☆ سکندر خان بلوچ

ذیل ہے۔ یہ قصہ ہمیں ایک پرانے دوست نے سنایا جو عرصہ دس سال سے وہاں مقیم تھے۔

دوست نے بتایا کہ شروع شروع میں ہمیں بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال ہم خوش قسمت تھے کہ ہمیں ایک ہمدرد پاکستانی مسٹر صدیقی مل گئے جنہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ صدیقی صاحب چونکہ کافی عرصہ سے ریاض میں رہ رہے تھے اس لئے زبان اور وہاں کے مسائل سے کافی واقف تھے۔ ہمیں شروع شروع میں روزمرہ کی اشیاء کی سخت ضرورت پیش آئی۔ لہذا ہم نے صدیقی صاحب سے گزارش کی

کچھ سکھ واقف کار

جس دور میں ہم وہاں گئے تھے پاکستانی خال خال تھے۔ پاکستانیوں کے علاوہ ہندوستانی بھی تھے اور کچھ اکا دکا سکھ بھی۔ ان لوگوں سے شناسائی ہوئی۔ گو گہرے تعلقات تو قائم نہ ہو سکے لیکن سرسری ملاقاتیں اور دعا سلام ہوتے رہے جو بعض اوقات بہت دلچسپ ہوتے۔ ہندوستانیوں میں سب سے دلچسپ لوگ سکھ تھے جو پورے ریاض میں ایک دو ہی نظر آئے۔ سکھوں کے متعلق جو پہلا واقعہ سننے کو ملا وہ حسب

ایسے مذاہب کے متعلق کچھ زیادہ پتہ نہ تھا۔ صدیقی صاحب صورت حال سمجھ گئے کہ سردار صاحب کو مسلمان سمجھ کر غلط فہمی میں لے جا رہے تھے لہذا وہ آگے بڑھے اور متوؤں کو عربی میں سمجھایا تو انہوں نے احوال پڑھتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔

سردار صاحب پہلے بھی خوش تھے اب مزید خوش ہوئے اور صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ہم نے پوچھا کہ سردار جی چلو متوؤں کو تو آپ کے محلے سے غلط فہمی ہو گئی تھی لیکن آپ خوش خوش نماز کے لئے کیسے جا رہے تھے؟ سردار صاحب نے اسی خوش دلی سے جواب دیا کہ ”اگر اپنی نماز نال سعودی بھائی خوش ہونے سے تے اپنا کی جاندا ہے۔“

کیا آپ کو نماز آتی ہے؟ ہم نے مزید پوچھا ”آہو جی اپنے پنڈو دے دینے ترکھانوں میں روج (روزانہ) نماز پڑھ دے ہوئے دیکھنا واں۔ بس وہ سجدے ای کرتے ہیں نا۔“ اب معلوم نہیں اسے سردار صاحب کی سادگی کہا جائے یا منافقت یا شاطر بازی لیکن سردار صاحب کی Sportsman Spirit اور غیر ملک میں پنجابی زبان کا استعمال دونوں قابل تعریف تھے۔

جس دور میں ہم لوگ سعودی عرب گئے تھے۔ تنخواہیں بہت قلیل تھیں۔ مکانوں کی بہت دقت تھی۔ لہذا ہم لوگ نئی نئی آبادیوں کی طرف رجوع کرتے۔ جہاں مکان ذرا سستے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک سال کے لئے تو مجھے اکیڈمی کے نزدیک مکان مل گیا لیکن دوسرے سال مجھے اکیڈمی سے دور ایک نئی آبادی میں منتقل ہونا پڑا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ میرے نزدیک ہی ایک سکھ اور ایک ہندو فیملی دونوں ساتھ ساتھ دو چھوٹے چھوٹے فلیٹس میں رہائش پزیر تھے۔ میں چونکہ ورڈی میں آفس جاتا تھا لہذا سردار

کچھ وقت نکال کر وہ ہمیں بازار لے جائیں جس کا انہوں نے چھٹی والے دن وعدہ کیا۔ وہاں چونکہ چھٹی جمعرات اور جمعہ والے دن ہوتی ہے لہذا جمعرات کی شام کو صدیقی صاحب نے ہمیں بازار لے جانے کا پروگرام بنایا تا کہ ضروریات زندگی خرید سکیں۔ وہ ہمیں جس علاقے میں لے گئے اسے ”بطلی“

کہتے ہیں۔ عصر کی نماز کا وقت ہوا ہر طرف سے اذان کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی تمام کاروبار بند ہو گیا اور لوگ مسجد کی طرف جانے لگے۔ یوں جوق در جوق لوگوں کو نماز کے لئے جاتا دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور آواز نے بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ بارلش حضرات ہاتھ میں ڈنڈا لئے ہوئے ہر طرف آواز لگا رہے تھے۔ ”یار فیتھ۔ صلاۃ۔ صلاۃ“ صدیقی صاحب نے بتایا کہ یہ ”متوے“ ہیں۔ عام الفاظ میں مذہبی پولیس جن کا کام لوگوں کو نماز کے لئے لے جانا ہوتا ہے۔ لہذا آئیں نزدیکی مسجد میں نماز پڑھ لیں ورنہ یہ متوے پکڑ لیں گے۔

ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ دو متوؤں نے ایک بارلش آدمی کو پکڑ لیا اور صلاۃ کہتے ہوئے مسجد کی طرف لے جانے لگے۔ ذرا غور سے دیکھا تو پکڑا جانے والا شخص سکھ معلوم ہوا۔ سوائے گپڑی کے ظاہری شکل و صورت سے تو وہ یکساں مسلمان نظر آتا تھا۔ ہم نے اپنا شک صدیقی صاحب پر ظاہر کیا۔ ذرا نزدیک گئے تو سردار صاحب بار بار پنجابی میں کہہ رہے تھے ”اوہ آپاں تے سکھ آں“ لیکن متوے بار بار کہہ رہے تھے ”صلاۃ۔ صلاۃ یار فیتھ“ حیران کن بات یہ تھی کہ سردار صاحب خوش خوش متوؤں کے ساتھ جا بھی رہے تھے کیونکہ اس وقت تک سکھ اور ہندوستانی وہاں پر عام نہ تھے۔ اس لئے متوؤں کو بھی

دجوات سمجھ میں آئیں۔ اول تو یہ کہ اس علاقے میں کوئی اور پنجابی بولنے والی انڈین فیملی نہ تھی۔ دوم یہ کہ سردار صاحب کے ساتھ رہائش پذیر انڈین ایک مدراسی تھا جس کی زبان اور عادات دونوں سردار جی سے مختلف تھیں۔ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں پنجابی بول سکتا تھا جو سردار صاحب کو میرے قریب لائی۔ سردار صاحب برملا کہتے تھے ”آپاں پنجابی نہ بولوں تا بیمار ہو جاؤں۔“ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ زبان کا رشتہ بھی کتنا گہرا ہوتا ہے۔

سردار صاحب یعنی سردار پرتم سنگھ ٹیلیفونی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ اپنے مدراسی پردی سے بڑے تنگ تھے۔ ایک دن مجھے رازدارانہ لہجے میں بتایا ”ایسہ ماں دیا راسا نوں تہانوں ملن تو منع کر داتے۔ بڑا ہی کمینہ ہے۔“ ایک دن سردار صاحب نے مجھے گھر کا بنا ہوا میوہوں والا گڑ بھجوا یا پھر ایک دفتر اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی جو میں نے بہانے سے ٹال دی۔ سردار صاحب بڑے زور سے کہنے لگے۔ ”ساتھ ان کی بیگم اور بیٹا بھی تھے۔“ بسنے لگے۔ اسی سکھ ضرور آپ پر اسے بیوقوف نہیں جتنے تاسا موسلے سانوں سمجھدے ہو۔“ کیوں سردار صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کہنے لگے انہیں تاسا فوجی ہوتاں تہ دے ساڑے نال نہیں ملنا چاہندے۔ اس وقت تو میں نے بات ٹال دی لیکن سردار صاحب کے خلوص اور گرجبوشی میں کوئی کمی نہ آئی۔ جہاں بھی ملتے بلند آواز سے ملتے گرجبوشی سے ملتے۔ ان کی فیملی اسی طرح خلوص تھی۔

ایک دن سردار صاحب بموہ فیملی بازار میں مل گئے۔ دعا سلام کے بعد وہ آگے چل پڑے اور ہم لوگ دوسری طرف چند لمحوں بعد سردار صاحب نے پیچھے سے آواز دی۔ ہم رک گئے نزدیک آئے کہنے لگے

صاحب کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ پہلے چند دن تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر دوسری طرف منہ کر لیتے۔ پھر ایک دن جب میں وہاں سے گزرا تو سردار صاحب نے آہستہ آہستہ سے ہاتھ اٹھا کر ہیلو کہا۔ جب دوسرے دن سردار صاحب نے یہی کچھ کیا تو میں نے ہیلو کا جواب نہ دینا بد اخلاقی سمجھ کر اسی طرح جواب دیا اور پھر یہ آہستہ آہستہ گرجبوشی میں تبدیل ہو گیا۔ پھر ایک دن جب میں دوپہر کو دفتر سے واپس آ رہا تھا تو سامنے سردار جی دوکان پر کھڑے کچھ خرید رہے تھے۔ مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں چونکہ وردی میں تھا اور اس طرح سردار جی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سمجھ نہ آئی کہ کیا کروں کیونکہ ہم لوگ ہر وقت ہر غیر ملکی سے سکورٹی و ججوات کی وجہ سے خائف رہتے ہیں۔ اس لئے ڈر تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ بہر حال ڈرتے ڈرتے رک گیا۔

سردار صاحب وردی کی وجہ سے میرے ریک سے واقف تو تھے ہی اب چھائی پر لگی ہوئی نام کی پلیٹ پڑھ کر نام سے بھی واقف ہو گئے۔ گاڑی رکھتے ہی سردار صاحب ایک کوک کی ٹھنڈی بوتل لے کر میری طرف بڑھے ”میجر صاحب وڈی گرمی ہے لو ٹھنڈا پانی پو“۔ ان ظالموں میں یہ خوبی ہے کہ جہاں کہیں بھی ہوں آپس میں ٹھیکہ پنجابی بولتے ہیں۔ باوجود انکار کے مجھے وہ بوتل چینی پڑی۔ رکی علیک سلیک کے بعد سردار جی کھل گئے اور اب جہاں کہیں بھی ملتے بڑے جوش و جذبے سے ملتے۔ میں دل میں ہر وقت خائف رہتا کہ یہ میل جول خدا نخواستہ کوئی غلط رنگ نہ لائے۔ یہ بھی خوف تھا کہ یہ کوئی ”را“ کا ایجنٹ ہی نہ ہو۔ بہر حال میں جتنا بھی دور ہونے کی کوشش کرتا وہ اور نزدیک آتا اور ہمیشہ خلوص سے ملتا۔ جب میں نے حالات کا تجزیہ کیا تو مجھے تین

ہاوقات بد تمیزی کی حد تک روکھا ہو جاتا لیکن سردار صاحب کی خوش دلی اور خلوص میں کبھی فرق نہ آیا۔ جب میں آ رہا تھا تو دو دن پہلے ایک ہوٹل میں مجھے بمعہ میرے دوستوں کے کھانے پر بلایا۔ کہنے لگا ”میتوں پتہ ہے تساں میرے گھر نہیں آؤ گے۔“ بہر حال میں نے بہت مشکل سے معذرت کی۔ مجھے سردار صاحب اب بھی کبھی کبھار یاد آتے ہیں۔ معلوم نہیں کس حال میں ہوں گے؟ ویسے تو وہاں ایک آدھ اور بھی سکھ ملا لیکن سردار پر تيم سنگھ جیسا کوئی نہ ملا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

ایک ضروری بات کرنی تھی۔ ”حکم کرو سردار صاحب“ میں نے کہا۔ کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ ادھ اصل بات تو میں بھول ہی گیا۔ اچھا میں کلونت کور سے پوچھ کر آتا ہوں۔ کلونت کور اس کی بیوی کا نام تھا۔ چند قدم گئے پھر مڑے۔ زور سے آواز لگائی ”آگئی“ اردو سمجھنے والے دائیں بائیں لوگ یہ سن کر رک گئے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا ”کون آگئی“ کہنے لگا ”گل یاد آگئی۔“ بہر حال سردار صاحب تیزی سے میرے پاس آئے کہنے لگے ”تساں پاکستان کدوں جا رہے ہو؟“ ”بس چند دن تک“ میں نے جواب دیا ”اچھا

اپن لئی کچھ سٹو لیندے آؤنا۔ کور دا بڑا دل کردا ہے۔“ شاید وہ امید سے تھی ”ٹھیک ہے پر تيم سنگھ جی ضرور کوشش کراں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

مدراسی ہندو سے نہ کبھی ہماری بن سکی نہ سردار پر تيم سنگھ کی۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ میرا رویہ بعض

1978ء میں سعودی عرب میں اپنے قیام کے انتقام پر میں لندن گیا۔ شام کو گھومنے نکلا۔ مجھے دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ لندن میں گھومنے کے لئے زیر زمین ریلوے کا پورے ہفتے کا ٹکٹ لے لوں یہ سستا پڑے گا اور ہر جگہ با آسانی بلا روک ٹوک گھوم

الریاضین

20۔ اے سمال انڈسٹریل اسٹیٹ، جی ٹی روڈ، گجرات

Ph: 053-3521253-3532224-3532225. Fax: 053-3535224

دیا۔ ہر طرف سے لوگ افسوس کے لئے آنے لگے۔ سردار صاحب کو شرم کے مارے چپ لگ گئی۔ شام کو سردار دودھاوے سنگھ نے ڈھول والا بلا کر گاؤں میں اعلان کر دیا کہ کل ہم ترین والوں سے بدلہ لیں گے۔ سب لوگوں نے اپنی اپنی برچھیاں اور کرپانیں تیز کر لیں کہ آج ترین والوں کی خیر نہیں۔ گاؤں میں پولیس چوکی کو بھی پتہ چل گیا وہ بھی ہوشیار ہو گئے کہ کچھ ہونے والا ہے۔

دوسرے دن نہادھو کر سردار دودھاوے سنگھ تیار ہو کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ ساتھ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ڈھول والے کو آگے لگا کر سٹیشن پر جانے لے کر کو حکم دیا کہ برنالہ گاؤں کے لئے پانچ اکٹھے ٹکٹ خرید لو۔ ٹکٹ خرید لئے گئے۔ سردار صاحب سٹیشن پر رکھے ہوئے بیچ پر بیٹھنے لگے تو سٹیشن ماسٹر دوڑ کر کرسی لے آیا۔ سردار صاحب مونچھوں کو تاؤ دے کر بیٹھ گئے۔ جلوس بھی ساتھ تھا۔ ڈھول والا ڈھول بجاتا رہا۔ پولیس تیاری میں رہی۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ لوگوں نے پوچھا سردار جی آپ نے تو بدلہ لینے کا اعلان کیا تھا۔ سردار صاحب گویا ہوئے۔

”بدلہ عقل نال لیا جاندا ہے۔ جذبات نال نہیں۔ بیوقوفو انا انگریزوں دی تک کٹ دتی ہے۔ پانچ ٹکٹاں لے کے سفر اک تے دی نہیں کیا۔ ہن انگریز شرم توں کس نوں منہ دکھاسن۔“ سب نے تعریف کی۔ بلے بھائی بلے سردار دودھاوے سنگھ جیسا عقل مند آدمی پورے علاقے میں نہیں۔ خون خرابہ بھی نہیں کیا اور انگریزوں کی ناک بھی کاٹ لی ہے۔ لہذا اس دن شام تک لوگ مبارکیں دینے آتے رہے۔ سردار جی کی علاقے میں عقلمندی کی دھاک بیٹھ گئی۔

سکوں گا۔ لہذا میں ریلوے سٹیشن پہنچا اور ٹکٹ کے لئے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ میرے آگے ایک کٹھکھڑا تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر مڑا تو میں نے دس ڈالر کا نوٹ آگے بڑھایا اور ایک ہفتے کا ٹکٹ مانگا۔ ہاتھ کھڑکی میں ڈال ہی رہا تھا کہ سردار صاحب نے تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ میں سمجھا کہ یہ مجھ سے دس ڈالر کا نوٹ چھیننا چاہتا ہے۔ میں نے زور سے منہی بند کر لی۔ سردار صاحب نے کہا۔

”معلوم ہندا ہے نویں ہو۔ او بھولے لو کو ہفتہ تے کل ختم ہو جانا ہے کیونکہ انا ہفتے دا دن ہے۔ تہاڈے ہفتے دی رقم ضائع ہو جاوے۔ جاوے سرف انا دی ٹکٹ لو۔“ میں ٹکٹ لے کر واپس مڑا۔ سردار صاحب ایک طرف کھڑے تھے کہنے لگے۔

”پاکستان توں آئے ہو؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا تو پھر پوچھا ”کیہ حال ہے اپنے پاکستان دا؟“ ٹھیک ہے میں نے جواب دیا۔ سردار صاحب نے جلدی سے اپنا کارڈ نکال کر میرے سوا لے کیا۔

”اگر کوئی دکھ سکھ ہووے تاہمیں اطلاع دے دینا۔ آپاں فوری پہنچ جانواں گے۔“ یہ کہہ کر تیزی سے چلے گئے۔ سردار صاحب کے اس خلوص بھرے واسطے کو میں آج تک نہیں بھول سکا بات معمولی تھی لیکن گہرا اثر چھوڑ گئی۔

اب آخر میں ایک اور واقعہ حاضر خدمت ہے جو پریم سنگھ نے سنایا تھا۔ کہنے لگا ”جب ہمارے علاقے میں نئی نئی ترین چلی تو میرے پردادا کو ترین پر سفر کا شوق چڑھ آیا۔ ریلوے سٹیشن پر گیا ٹکٹ لیا لیکن ترین چل پڑی اور سردار صاحب سوار نہ ہو سکے۔ سردار صاحب چونکہ واقعی گاؤں کے کبھی تھے لہذا یہ ان کی ہنک تھی۔ شام تک گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ سردار دودھاوے سنگھ کو انگریزوں نے ترین پر نہیں چڑھایا۔“

”موجودہ دور میں اپنی قدروں کی حفاظت کسی جہاد سے کم نہیں۔ انہی اقدار کی مضبوطی ہمیں مغرب میں رائج کج روی سے بچا سکتی ہے۔

اقدار اپنی جاوداں رکھنا



0345-6875404

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک

بننے تھے۔ عاشری ان پر غور کیا کرتی، ان کا تجزیہ کرتی، پھر پریشان ہو جاتی۔ اس کا دل معاشروں میں عدم مساوات پر رنجیدہ ہو جاتا۔ جانتی تھی کہ نواز دعوماً اونچی امیدیں ساتھ لے کر آتے تھے، جو پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ ایسے افراد بھی وطن چھوڑ دیتے جنہیں آبائی معاشروں میں اعلیٰ مرتبے حاصل ہوتے، وہ فلک سے زمین پر آن گرتے۔

ایسا بھی ہوا کہ بہترین طلباء و طالبات نئے وطن میں آئے تو رویوں میں توازن نہ رکھ سکے اور غلط روی کا شکار ہو گئے۔ وہ ایسے فطین نوجوانوں کو بھی جانتی تھی

عاشری ایک طالبہ تھی، ذہین اور خوب۔ کینیڈا کی مشہور یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اس کا تعلق کلچر کے شعبے سے تھا۔ اس شعبے میں دنیا سمائی ہوئی تھی۔ عاشری کی ریسرچ کا موضوع تاریکین وطن کے متعلق تھا۔ اسے جائزہ لینا تھا، ان مغربی اثرات کا، جو وطن چھوڑ کر آنے والے مشرقی خاندانوں پر پڑتے تھے، خصوصاً ان خاندانوں پر جن کے آبائی ممالک میں مذہبی اقدار و اخلاقیات کی جھلک نمایاں تھی۔ کینیڈا آنے والے تاریکین کے اور بھی کئی مسائل تھے۔ جو ان کے لئے شدید ذہنی انتشار کا باعث

جانتی تھی کہ معاشرہ اور درگاہیں تارک وطن بچوں کے اذہان میں تیسری دنیا کے بارے میں حقارت پیدا کرتی تھیں۔ اس بات پر اسے بھی دکھ ہوتا تھا۔ عاشی بچے کو اپنے مشاہدے میں رکھا کرتی۔

ایک شام وہ ٹوٹی کے پاس بیٹھ گئی اور اس سے ایشیائی معاشروں پر بات کرتی رہی۔ ٹوٹی حال ہی میں آبائی ملک جا کر لوٹا تھا، والدین کے ہمراہ۔ گفتگو بحث کی طرف بڑھی تو وہ اپنی فوٹو البم اٹھا لایا اور عاشی کو دکھانے لگا۔ اس ناطے وہ اپنے دلائل میں وزن پیدا کرنا چاہتا تھا۔ تصویریں اس نے آبائی ملک میں بنائی تھیں۔ چند تصویریں دیکھ کر عاشی کی آنکھیں کھل گئیں۔ بچے کی کئی باتیں بلاشبہ غور طلب تھیں اور اس کی موجودہ سوچ کی عکاسی کرتی تھیں، عاشی کو مشاہدہ بہت دلچسپ لگا۔ وہ تصویریں بغور دیکھنے لگی۔ پہلی تصویر ایک سائیکل سوار کی تھی، جس نے بازار سے مرغیاں خریدی تھیں اور سائیکل پر اس طور باندھ رکھی تھیں کہ وہ اپنی لٹک رہی تھیں۔ ان کی جان پر برنی ہوئی تھی۔ عاشی نے ورق الٹا تو دوسری تصویر میں ایک بچہ کسی موٹر ورسکاپ پر اپنی بساط سے بڑا کام کر رہا تھا۔ تیسری تصویر میں ایک چڑی سڑک کے کنارے مدہوش بڑا تھا، جس کے کھلے ہوئے منہ پر کھیاں جھنسن رہی تھیں۔ قریب ہی پولیس کے دو سپاہی کسی موٹر سائیکل سوار سے رشوت لے رہے تھے۔ اگلے صفحے پر چوتھی تصویر ایک کھلے ہوئے مین ہول کی تھی، جو فٹ پاتھ کے عین بیچ واقع تھا۔ اس سے ملحق سموسوں اور پکڑوں کی دکان تھی، جہاں ایک شخص کھینوں سے بے نیاز پکڑے کھا رہا تھا۔ پانچویں تصویر ایک بھکاری کی تھی، جو ٹوٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر بڑیا کھا تھا۔ بھکاری ہٹا کٹا تھا۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا اور گلے میں موٹے منکوں والی مالا تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہاتھ میں سلتا ہوا

جنہوں نے نئی جگہ آ کر بھی بہتر گریڈ لئے، مگر سفید فام افراد کے مقابل تعصب کا شکار ہو گئے۔ حقائق کا تجزیہ اسے بتاتا تھا۔ ایسے تمام ہی طبقات عموماً اپنی تناؤ کا شکار ہوئے اور شدید مشکلات میں گھر گئے۔

کئی خاندانوں میں شدید انتشار بھی برپا ہوا۔ ایسے خاندان جو نئے دیس میں مقام نہ پاسکے بعد ازاں فنڈ ایئر بن گئے اور مسلسل سبکی سے دوچار ہوتے رہے۔ ان کی کردار کشی پبلک ٹیلیوژن میں بھی دکھائی دیا کرتی۔ کینیڈا میں یہ تاثر عام تھا کہ ارباب بست و کشاد تارکین وطن کی موجودہ نسل کی بجائے ان کی اگلی نسلوں پر توجہ رکھتے تھے کیونکہ وہی نسلیں ان کی ضروریات کے مطابق دھل سکتی تھیں۔

سفید فام معاشرے میں عاشی کو بھی مشکلات پیش آئی تھیں۔ بات پرانی ہو چکی، اس کا خاندان بھی وطن ترک کر کے کینیڈا پہنچا تھا۔ اس سے وابستہ کئی افراد ابھی تک جدوجہد کے مراحل میں تھے۔ عاشی نئی نسل میں جوان ہوئی تھی۔ لمبا رڈ کی تھی، دل بھی ہمدرد رکھتی تھی۔ تجسس ذہن کی مالک تھی۔ اہم یہ کہ اسے مشرقی روایات سے بڑا پیار تھا۔ فیملی سسٹم کے حق میں دلائل دیا کرتی۔ اس دم تارکین میں بھی منفرد دکھا کرتی۔

نئے دیس میں اس نے کئی خاندانوں سے تعلقات بنا لئے تھے۔ یہ اس کی ضرورت بھی تھی۔ تعلیمی ضروریات کے تحت وہ دیگر ممالک میں بھی چلی جاتی اور دنیاوی خطوں میں تہذیب و تمدن دیکھا کرتی۔ پھر ان کے اہل وطن کا کینیڈا میں بدلتا ہوا بود و باش پر کھا کرتی۔

ٹوٹی والدین کے ساتھ اس کے بڑوس میں نیا نیا آیا تھا۔ پاکستانی تھا، ہائی سکول میں پڑھتا تھا، اکھڑ سا تھا، کسی حد تک بدتمیز بھی تھا۔ عاشی کا دوست بن گیا تھا۔ وہ اپنے آبائی ملک سے شدید نفرت کرتا تھا۔ عاشی

جہاں بچوں کو گھٹی بھی ناخالص ملتی ہے، میرے رویے کیونکر خالص ہو سکتے تھے؟ لوگ باتیں کرنا جانتے ہیں، اپنا برتاؤ نہیں دیکھتے۔“ اس نے بات تمام کی۔ ”تھو تھا چنا، باجے گھنا۔“ عاشری نے خیال کیا۔

شخصی کمزوریاں سسلی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں، ہر دم سازش سوچا کرتی۔ دنگا فساد اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ صورت حال ہمیشہ اس کے حق میں رہتی کیونکہ اس کا خاندان سیرکانوں کا کچا تھا، غصیلہ بھی تھا۔ یہی لوازمات تھے جن کے باعث عاشری کا پڑوس پریشہ کر کے طرح تپتا دکھائی دیتا تھا جس میں بار بار ابال اٹھا کرتے۔ پھر یہ ابال بزرگ خدمتگاروں پر وبال بن جاتے۔ بے چارے تمام پھنکار مبر سے سنا کرتے مگر خاموش رہتے۔ جب معاملہ حد سے بڑھ جاتا تو وہ مجبور، اداس اور مغموم دکھائی دینے لگتے۔ عاشری کو ان سے گہری ہمدردی ہونے لگتی تھی۔ وہ سسلی کے گھر جاتی تو ان کے پاس ٹھہر جاتی۔ ان سے خیر و عافیت پوچھا کرتی۔ انہیں وہ چچا اور چاچی کہا کرتی۔ کبھی دونوں لان کے کونے میں بیٹھے دھک سکھ کی باتیں کیا کرتے۔ یہ مناظر عاشری کو اچھے لگا کرتے۔ وہ زندگی کے موسموں پر سوچا کرتی، اچھے برے موسم زندگی سے عبارت ہیں۔

اس شب ٹورینٹو میں شدید برفباری ہوئی تھی۔ صبح دھرتی ہر طرف سفید دکھائی دیتی تھی۔ جگہ جگہ نرم برف کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ ہوا میں بھی تندی تھی جس کے باعث سردی بڑھ گئی تھی۔ عاشری جلد جاگ اٹھنے کی عادی تھی۔ کافی کا کپ لے کر باہر نکل آئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ اسے بہت سارا کام کرنا تھا۔ حسب عادت اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پڑوس میں بھی زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ بزرگ شخص ڈرائیوڈے پر جمع برف صاف کر رہا تھا۔ روح فرسا سردی میں بھی پسینے کے ساتھ ہانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرا اس سے مخاطب تھا۔

سگریٹ تھا۔ عاشری کو بھکاری کی شکل ناگوار گزری۔ چھٹی تصویر میں ایک چھوٹی سی موٹر سائیکل تھی جس پر پورا خاندان سوار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہینڈل کے ساتھ ساز و سامان بھی بندھا ہوا تھا اور یہ موٹر سائیکل سڑک کی الٹی سمت ایک فٹ پاتھ پر رواں دواں تھی۔ قریب کھڑا پولیس مین تمام معاملے سے بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ کسی نے تصویر پر جلی حروف میں سرکس لکھ رکھا تھا۔ آٹھویں تصویر میں چند افراد پولیس کی ناکارہ گاڑی کو دھکا لگا رہے تھے جس پر نو فیئر لکھا ہوا تھا۔ عاشری نے گھبرا کر تصویروں والی البم بند کر دی۔

”آپ کی امی کہاں ہے؟“ اس نے ٹوٹی سے سوال کیا۔ ”میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔“ ٹوٹی کی ماں بھی خرافات کا مجموعہ تھی، تصویروں والی البم کی طرح۔ دیکھنے میں ہی خوبصورت بلا لگتی تھی، مگر ڈریکولا کی طرح خطرناک تھی۔ دو روز پہلے کا ماجرا تھا۔

اس کا بھائی تارک وطن ہوا تو پردیس میں سہارا لینے اس کے پاس چلا آیا۔ وہ پورے کنبے کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ سسلی اسے تپاک سے ملی۔ خود مہمانوں کو از پورٹ سے لائی۔ شام پر تکلف ڈنر کھلایا۔ بعد میں بھائی کو کھانے کا بل پکڑا دیا۔ کہا۔ جیسا دیس دیس بھییں۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مطالبہ سن کر بھائی کی آنکھیں کل گئیں۔ اس رات بہن بھائی میں شدید لڑائی ہوئی۔ وہ رات بھائی نے کھلے آسمان تلے گزاری، سڑک کے کنارے، بیوی بچے اس کے ساتھ تھے۔

سسلی کے ذہن پر بھی واقعے کا ہلکا سا اثر موجود تھا۔ کم از کم عاشری نے یہی محسوس کیا۔ بات نکلی تو سسلی پھٹ پڑی۔ کہا۔ لوگ بولتے ہیں کہ میرا اظہار خلوص ناخالص تھا۔ میں نے اس پر بہت سوچا ہے اور ان کی رائے حق مان لی ہے۔ میرا تعلق اس ملک سے تھا،

ہے۔ برف کی ٹھنڈ کیسے برداشت کر رہے ہیں آپ؟“ اس نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ پریشانی کے عالم میں وہ اندر چلی گئی۔ لونی تو اس کے پاس چل کر بیکر جیکٹ تھی۔ علاوہ ازیں اس نے اونی مظفر اور فل ربرڈ شوڈ بھی اٹھا رکھے تھے جو اس نے اصرار کر کے بزرگ شخص کو پہنا دیئے۔

”ہم برف یوں پہنچوں سے صاف نہیں کرتے تھے۔ بد قسمتی سے ہماری مکینیکل ڈیوائس پچھلے موسم میں جل گئی تھی۔ اس سال نہیں لے سکے۔ میں پاپا سے کہوں گی کہ گھر لوٹنے ہی نئی خرید لائیں، مہنگی ضرور ہے مگر بھاری برف بھی منٹوں میں ہٹا دیتی ہے۔“ عاشی نے کہا۔ وہ زیر بار بھی دکھائی دی۔ ”آپ نے بڑی مدد کی، جو میرا بوجھ اپنے سر لے لیا۔“ وہ بار بار کہتی رہی۔ کام نمٹ چکا تو وہ بزرگ شخص کو اندر گھر میں لے آئی اور گرم کمرے میں بٹھا دیا، پھر صاف تولیہ لا کر دیا۔

”چچا! آپ سستا نہیں، میں آپ کے لئے کافی تیار کروں گی۔“ وہ بولی اور ساتھ ہی کافی میکس کا سوچ آ کر دیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولی اور چند ڈالر نکال کر بزرگ شخص کو پیش کئے۔

”میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔ آپ کی مدد میں نے محض اس لئے کی ہے کہ آپ میری بیٹی ہیں۔ مذاہب بھی ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی حکم خداوندی ہے اور نوع آدم کی آزمائش بھی۔“ بزرگ شخص نے کہا۔

”پیسے لے لینے میں شاید آپ شرمندگی محسوس کریں گے۔ میں بھی کتنی چھوڑ ہوں۔ آپ کی براہ راست توہین کر رہی ہوں۔ آپ کو چچا کہتی ہوں، پھر بھی اپنا نہیں سمجھتی۔ چلیں، آج میں اپنے لئے لاٹری ٹکٹ لینے جاؤں گی، ایک ٹکٹ آپ کے لئے بھی لے

”اچھا کیا، جو آپ نے سویرے کام شروع کر دیا۔ میں بھی آپ کی مدد کرتا مگر ضروری کام آن پڑا ہے۔ آپ کو تنہا ہی تمام برف صاف کرنا ہو گی۔ اندرونی حصوں کے علاوہ ملحقہ فٹ پاتھ بھی ہے جو انتھک محنت کا تقاضا کرے گا۔ شاید سرکاری مشینری آ جائے ورنہ ہیردنی صفائی بھی ہمارا فرض بن جائے گا۔ یہ بھی خدشہ ہے کہ جونہی آپ برف ہٹائیں، دوبارہ برفباری شروع ہو جائے۔“ سمیر نے کہا۔ پھر ایک پیکٹ بزرگ کے حوالے کیا۔ کہا کہ ”صفائی کے بعد جو تھوڑی بہت برف بچ جائے، اس پر یہ پاؤڈر بکھیر دیں تاکہ وہ نرم ہو کر پگھل جائے ورنہ گرم بخت شیشے کی صورت جم جائے گی۔“ سمیر نے بات مکمل کی، گاڑی میں بیٹھا اور منظر سے اوجھل ہو گیا۔

عاشی نے دیکھا کہ بزرگ شخص نے مسکراتے ہوئے مشقت کا چجر قبول کر لیا اور تھوڑی دیر ہی میں اپنا کام نمٹا دیا۔ خوش قسمتی سے سرکاری مشینری بھی آگئی اور گھروں کے باہر صفائی سہرائی بھر پور طریقے پر شروع ہو گئی۔

عاشی بھی اپنے گھر میں مصروف کار تھی۔ والدین گھر پر ہوتے تو مشقت سب ل کر کرتے مگر اب سارا کام فقط اسی کو کرنا تھا، تنہا۔ اس نے ڈرائیوڈ کے کاتھوڑا سا حصہ صاف کیا ہو گا کہ ایک مانوس آواز سنائی دی۔

”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“ کسی نے کہا۔ عاشی نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو سامنے اس کا بزرگ پردی کھڑا تھا، حسب معمول مسکرا رہا تھا۔ اس نے عاشی کے ہاتھوں سے پیچلے لے لیا اور برف اٹھا کر لان کے کونے میں ڈھیر کرنے لگا۔

”آپ یہ سب کیسے کریں گے؟“ مہربان آدمی کی حالت دیکھ کر عاشی جیسے چونک پڑی۔ ”کڑا کے کی سرمدی پڑ رہی ہے اور آپ نے عام سی جیکٹ پہن رکھی

سعی کر رہا تھا یا پھر ہنستے ہوئے رو پڑا تھا۔
 ”کیا ہوا؟“ عاشی کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔
 اسے اپنی ہی آواز کچھ بے قابو سی سنائی دی۔ بزرگ
 شخص خاموش رہا، کھوکھلی آنکھوں سے ہواؤں میں گھورتا
 رہا، پھر بولا۔

”انسانی ہمدردی کبھی پرانے درد جگا دیتی ہے،
 تب اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ جذبہ اشکوں کی راہ
 تلاش کر لیتے ہیں۔ معذرت چاہتا ہوں جو آپ کو
 پریشان کر دیا۔“ اس نے کہا۔ کمرے میں ایک بار پھر
 سکوت لوٹ آیا۔ لمحے اس سکوت میں الجھتے رہے، وہ
 دوبارہ گویا ہوا۔ ”درد، جو اپنی اکائی میں نمودا پاتا ہے، بتاتا
 ہے کہ دوسروں کا درد بھی معنی رکھتا ہے۔ ہر دل میں درد
 کے انبار ہوتے ہیں، مگر ہم ان کا ادراک نہیں کر پاتے۔
 اگر ہم دوسروں کا درد پہچان جائیں تو معاشروں میں
 باہمی عداوت ختم ہو جائیں۔ درد نہ تو کالا ہوتا ہے، نہ سفید
 فام اور نہ کسی اور رنگ میں۔ یہ بس تکلیف دہ جذبہ ہوتا
 ہے جو اکائی کو لہو لہو کئے رکھتا ہے۔ اپنوں سے ملے تو
 عذاب بن جاتا ہے، کبھی بساط سے بڑھ جاتا ہے۔“
 بزرگ شخص نے بات تمام کی۔

”سرا! کیا ایسا معاشرہ جنم لے سکتا ہے جس میں
 انسان لہو لہو نہ ہو۔ دلوں کا درد بانٹ لیا جائے؟“ سوال
 عاشی کے ذہن میں ابھر آیا۔

”ہمارا خالق یہی چاہتا تھا، اس نے انسان کو
 دوسرے کا درد بانٹنے کی صلاحیت عطا کی تھی، پھر ذہن
 دیا، تجسس سے نوازا تا کہ وہ تجزیہ کر لے، سوچے اور
 نوع انسانی کے لئے بہترین معاشرہ تخلیق کرے۔ اس
 سلسلے میں اس نے ہدایات و رشد کے چراغ روشن کئے
 اور کہا کہ میں اس سے پیار کروں گا جو میرے بندوں کو
 چاہے گا۔ مگر انسان نے آسمانی تعلیمات پر عمل نہیں کیا
 بلکہ انہیں پس پشت ڈال دیا اور اپنی تمام تر قوتیں حرص،

لوں کی، کھیل تماشہ ہی سہی۔ پھر دیکھیں گے ہم دونوں
 میں سے خوش نصیب کون ٹھہرتا ہے؟ آج آخری روز
 ہے، اس کے بعد ٹکٹ نہیں ملیں گے۔ براہ کرم مجھے اپنا
 پورا نام بتا دیں۔“ عاشی نے کہا۔

بزرگ شخص کھلکھلا کر ہنس پڑا، پھر یہ ہنسی کھلتی
 ہوئی مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ مکان، جس میں
 عاشی کو اپنائیت نظر آیا کرتی تھی، شفقت بھری اپنائیت۔
 اسے لگتا کہ یہ مسکراہٹ اس شخص کے چہرے کا مستقل
 حصہ تھی۔ دلفریب، سدا بہار مسکراہٹ جو نہ کبھی ماند
 پڑی ہوگی، نہ کبھی ماند پڑے گی۔ ایسی مسکراہٹیں بسا
 اوقات رنج و الم پر شہنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا کرتی
 تھیں۔ ایک خیال عاشی کے ذہن میں ابھرا اور بڑپنے
 لگا۔ اسے لگا کہ بزرگ شخص کی ابدی مسکراہٹ کے پیچھے
 غموں کی لمبی قطارتھی، جھوٹے بڑے غم، جو گنتی میں بے
 شمار تھے، مسکراہٹ کے گرد چہرے کی سلوٹوں میں چھپ
 گئے تھے، کبھی اپنی موجودگی کی چغلی کھانے لگتے، تب
 بزرگ شخص کو سکون کا لبادہ دہرا کر کے اوزھنا پڑتا۔

دو اجنبی دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے، ان
 کے بیچ سکوت جنم لے کر گہرا ہو چکا تھا، حتیٰ کہ کافی کا
 دور اختتام کو پہنچ گیا۔

”آپ کو زندگی میں سکون کس جذبے نے دیا؟“
 عاشی نے سوال نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔ بزرگ
 شخص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عاشی کو محسوس
 ہوا کہ اس شخص کی اکائی میں انجانا سا تلاطم برپا ہو چکا
 تھا اور وہ اپنے ہی جذباتوں کے مقابل کھڑا تھا۔ اس کی
 مکان الم کی نذر ہونے لگی، پھر بے جان سی ہو کر پیٹکی
 پڑ گئی۔ بوزھے چہرے پر سکون غنقا ہو چکا تھا اور گہری
 سلوٹوں میں درد ابھر آیا تھا۔ اشک اس کی آنکھوں میں
 تیرنے لگے، پھر آہستہ آہستہ لڑکھالوں پر ڈھلکے اور مکان
 کے بیچ کہیں معدوم ہو گئے۔ وہ روتے ہوئے ہنسنے کی

پورچ میں بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتی۔ ساتھ ہی پڑوس سے ابھرتی ہوئی سریلی آواز سے محظوظ ہوا کرتی۔ مگر یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔ ارد گرد رہنے والے لوگ اس شور پر معترض ہو گئے اور اسے اپنی نجی زندگی میں مداخلت قرار دینے لگے۔ گائیگی ان کا گھریلو سکون غارت کرتی تھی لہذا وہی ہوا جس کا ڈر تھا، بذریعہ پولیس یہ آواز چپ کرادی گئی۔

آواز بجھ گئی جو باقی رہ گیا وہ صرف گنگناہٹ تھی۔ اس میں بھی سیر کی پھٹکار مداخلت کرتی رہتی۔ انہی دنوں عاشی کے پڑوسی ایک بھاری آزمائش کا شکار ہو گئے۔ بڑی اماں، جو بزرگ شخص کے ہمراہ نظر آیا کرتی تھی، دل کی شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئی۔ اس دن موسم دھندلا سا تھا، جب عاشی بوینورٹی سے گھر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ پڑوس میں ایسبولینس کھڑی تھی اور بڑی اماں کو اس پر لاوا جا رہا تھا۔ عاشی کو دھچکا لگا۔ بزرگ شخص انتہائی پریشان تھا، بے چین اور تقریباً حواس باختہ۔

شہر کا دستور تھا کہ ایسبولینس بیمار کے پاس تین منٹ میں پہنچ جایا کرتی تھی اور علاج ایسبولینس کے اندر ہی شروع ہو جایا کرتا تھا۔ عاشی کو بہتری کی امید تھی۔ اس نے پڑوسیوں کی مدد کی اور شام ہسپتال بھی چلی گئی۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ مرلیفہ انتہائی نگہداشت میں تھیں۔

بزرگ شخص گھر واپسی پر تیار نہ تھا۔ وہ وارڈ کے عقب میں لان کے کنارے کھڑا تھا اور بدستور پریشان اور گم صمم دکھائی دیتا تھا۔ موسم میں خشکی تکلیف دہ تھی۔ عاشی ضد کر کے اسے کینٹین میں لے گئی۔ دونوں پر آمدے میں بیٹھ گئے۔ کینٹین لان کے وسط میں واقع تھی۔ ہوا تیز تھی۔ عاشی بزرگ شخص کی جسمانی کیفیت جان سکتی تھی، اس نے چائے کے ساتھ لوازمات کا

طبع اور لالچ میں صرف کر دیں، جس نے انسانوں میں فتنہ پروان چڑھایا، جو فساد بنا اور گھروں سے لے کر معاشرہ اور اقوام تک پھیل گیا۔ آج ہر معاشرہ نفسا نفسی کا شکار ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ محبتیں مٹ چکیں اور آج کا انسان نفرتیں بانٹ رہا ہے۔ بزرگ شخص نے اپنا نقطہ نظر اختتام تک پہنچایا۔

”درد دل کا چراغ تو روشن ہے مگر اس کی مہم کو دہیز غلظت نے گھیر رکھا ہے“۔ عاشی نے کہا۔ بزرگ شخص چلا گیا مگر عاشی کو کسی قدر آزر دہ کر گیا۔ وہ اس کا دکھ جانا چاہتی تھی جس نے اس کی جادواں مسکان کو کچل ڈالا تھا۔ واقعے میں پیوستہ پھیکے لمبے خود اس کے اپنے دل میں کھب گئے تھے۔ وہ ادراک رکھتی تھی کہ غموں کے ادوار دلوں کو معتبر کر دیتے ہیں مگر معتبر دلوں سے لہو ٹپکنے لگے تو روگ سمندر کی طرح گہرے ہوا کرتے ہیں۔ کیا وہ اس بزرگ دل کے رنج و الم کا مداوا کر سکتی تھی؟ وہ سوچنے لگتی۔ پھر بے چین ہو کر بجھ جاتی۔ چراغ نلی بار اپنی رفتار چلتا رہا۔ عاشی نے بار بار بزرگ شخص سے دل کا راز پوچھنے کا ارادہ کیا مگر جرات نہ کر سکی۔

اس روز کے جذباتی دور نے البتہ بزرگ شخص کے رویوں میں تغیر برپا کر دیے تھے۔ وہ اپنی اکائی میں گم رہنے لگا تھا۔ کبھی اپنے آپ ہی باتیں کرنے لگتا، کلام کے ساتھ ہاتھوں سے مبہم اشارے بھی کیا کرتا۔ پھر اس نے اپنے جذباتوں کا اظہار سرور لے میں شروع کر دیا۔ علی الصباح جو کچھ بھی کرتا ساتھ اس کے گانے کی صدا بھی ہوا میں بکھرا کرتی۔ گاڑیاں چمکاتا یا صفائی ستھرائی کے لئے مشینیں چلاتا، اس کی آواز کا جہاں میں شامل رہا کرتی۔ عموماً وہ عارفانہ کلام گایا کرتا۔ اس کی آواز بھی خوبصورت تھی۔ پڑوس آوازیں عاشی کو بھلی لگتی تھیں۔ صبح سویرے وہ کافی کا کپ بناتی اور اپنے

مداخلت کئے سختی رہی۔

”میرا نام عماد الدین ہے بیٹا! پروفیسر عماد الدین“۔ بزرگ شخص نے ابتدا کی پھر افسردہ آواز میں دھیرے دھیرے بولتا رہا۔ کبھی آنسو اس کی آنکھوں سے بہا نکلنے لگتے تو وہ بزرگ ٹھہر جاتا۔ اس نے کہا۔ ”مریضہ میری بیوی، عائشہ، عمر بھر بڑی صابر اور شاکر رہی، اس نے بڑی دلجمعی سے زندگی میں میرا ساتھ دیا۔ میری حیات کو گلزار بنائے رکھا۔ بہترین گھرانہ تخلیق کیا۔ ہمارے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ہم نے ان کی تربیت بڑے اخلاص سے کی۔ وقت تیزی سے بدل جاتا ہے اور اپنے ہمراہ نئی جہتیں متعارف کراتا ہے۔ اس سفر میں ہر خاندان کی زندگی میں ایک بڑا موڑ آیا کرتا ہے۔ روز کے بعد خاندان کی ہیئت نئے روپ میں ڈھل جاتی ہے۔ بچے باشعور ہو جاتے ہیں اور والدین کی حیثیت بدلنے لگتی ہے۔ خاندان کا نقطہ نظر یکساں نہیں رہتا، یہ مختلف شخصیات کی شیرازہ بندی بننے لگتا ہے۔ اس میں نفاق اور انتشار کے پہلو بھی جنم لینے لگتے ہیں۔ قابل رشک خاندان بھی اس تبدیلی پر مصائب کا شکار ہو سکتے ہیں۔ بد قسمتی سے اولاد خاندان کی لٹیا ڈوبنے پر آئے تو والدین مستقبل کے بارے میں شش و پنج کا شکار ہو جاتے ہیں اور حالات کے رحم و کرم پر چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی خاندان کے سفر میں انتشار بد نصیبی کی انتہا ہوا کرتا ہے۔ موجودہ ادوار کے تقاضوں میں یہ عنصر بہت بڑھ گیا ہے۔

بھی خاندان کا نسل کے بندن باندھنے میں فریبوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور یوں جھگڑے، فسادات جنم لیتے ہیں جو آبائی ساکھ اور باہمی اتحاد برباد کر دیتے ہیں۔ میرے خاندان کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔

بچی بہت فرمانبردار رہی، تعلیم میں بھی قابل رشک تھی۔ ڈاکٹر بن گئی مگر بیٹے کو ہم ٹھیک طور پر نہ

آرڈر دے دیا۔

”وہ میری زوجہ ہے۔“ بزرگ شخص نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”گھر جا کر مجھے یچین نہیں آئے گا۔“ وہ بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے، پھر وہ بے تحاشہ رونے لگا جیسے مدتوں سے نہیں رو دیا تھا۔ عائشہ نے بمشکل اسے دلا سہ دیا۔ وہ اسے کینٹین کے اندر لے جانا چاہتی تھی مگر بزرگ شخص اس پر آمادہ نہیں تھا۔

”دیواروں کے بیچ میرا دم گھٹ جائے گا۔“ وہ کہنے لگا۔ عائشہ کو اس پر ترس آنے لگا۔ ”آپ کے بچے تو ہوں گے؟“ وہ اس کا دھیان بناتے ہوئے بولی۔ بزرگ شخص ہوا میں گھورنے لگا۔ عائشہ کو اس کی آنکھیں خالی خالی دکھائی دیں، سنبھل کر بولا۔ ”بیٹا! میں اپنے ہی بیٹے کے گھر ملازم ہوں، بغیر معاوضہ، میری زوجہ اس گھرانے کی خادمہ ہے۔“ اس نے کہا۔

عائشہ پر سچائی منکشف ہوئی تو اس کا دل دہل گیا۔ ”میرا لخت جگر کھنڈر دل ہو چکا ہے۔ اس کی ماں بستر مرگ پر پڑی ہے مگر وہ اپنے احباب کے ساتھ موج اڑا رہا ہے۔“ بزرگ شخص بولا۔ ”میرے اپنے ملک میں یہ دستور نہیں تھا۔“ وہ دکھے ہوئے دل کے ساتھ بولا۔ ”شرقی صفات کا حامل خاندان جب مغربی اقدار میں اچلتا ہے تو اس کے افراد عموماً دونوں معاشروں کی لوبیاں کھو بیٹھتے ہیں۔“ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ لک لک بار بار اس کے گالوں پر پھسلنے لگتے، وہ انہیں لڑنے دیتا۔ عائشہ کا دل بھی رنجیدہ ہو گیا تھا لیکن اس نے حوصلہ برقرار رکھا۔ اب وہ بزرگ شخص کو کچھ کھانا اپنی تھی۔

آغاز شب پر موسم کی تندی مخصوص ماحول میں اُبھ اور بھی گوار محسوس ہوتی تھی۔ عائشہ کو آتش دان بیب رکھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ اس شب بزرگ شخص نے عائشہ کو اپنی کہانی سنائی۔ وہ اس کی پتا، بغیر کوئی

کر لی۔ بیٹا ہاتھ سے گیا۔ بیٹی کا مستقبل بھی ہم والدین کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ ہم نے بڑے چاؤ سے اس کی شادی کی مگر وقت نے لڑکے کا چناؤ ہر پہلو غلط ثابت کر دیا۔ شادی کے بعد بیٹی ہر لمحہ عذاب میں مبتلا دکھتی رہی مگر ہم کچھ نہ کر سکے۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑا صدمہ تھا، سوچتا ہوں، بیٹی کو ہماری سادگی نے تباہ کر دیا تھا۔ لڑکے نے سیر سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے یہاں بلوائے اور پھر زندگی میں سیٹل بھی کرے جو ممکن نہ ہو سکا۔ بعد ازاں ان کے بیچ حالات بہت بگڑ گئے اور نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ بیٹی تین ماہ کا بچہ، علی لے کر واپس مینے پہنچ گئی، ہمیشہ کے لئے۔“

بزرگ شخص نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

وہ جذبات کے سمندر میں بہہ رہا تھا جس کی لہریں تند و تیز تھیں اور گہرائی بھی تصور سے بعید۔ عاشر کو اس سفینے کی طرح دکھائی دیا جو وقت کے ساتھ کئی طوفانی گردابوں سے گزرا تھا اور اب ٹکست وریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ کبھی لہروں کے رحم و کرم پر دکھائی دیتا مگر تلاطم کے پار اترنا چاہتا تھا۔

رات کا سفر جاری تھا۔ ہسپتال میں زندگی خال خال نظر آتی تھی۔ سکوت میں کبھی ایسویٹس کی آوازیں گونجنے لگتیں، شاف میں بیجان سا برپا ہو جاتا۔ عاشر خاموشی سے تمام واقعات سنتی رہی تھی، اب پریشان دکھائی دیتی تھی۔ موسم میں دھند اور سردی بڑھ چکی تھی۔ ”آپ کے حالات مجھے اچھے نہیں لگتے۔ آپ

دونوں میاں بیوی عمر کے ان حصوں میں ہیں جہاں آپ کو نہ صرف آرام کی ضرورت ہے بلکہ دلجوئی کی بھی۔ میرے لحاظ سے آپ کو وہ ماحول ملنا چاہئے جس کا تقاضا والدین مشرقی معاشرے میں کرتے ہیں۔“ عاشر نے کہا۔

”آپ درست کہتی ہیں بیٹی! ہماری زندگیوں

تجربہ کاروں کے اور وہ باغی ہو گیا۔ عادتاً بھی وہ بغاوت پر چڑھتا تھا جس نے زندگی میں مجھے مسلسل پریشان کئے رکھا۔ میٹرک کے امتحان میں ناکام ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ہیروئن کا عادی ہو چکا تھا۔ کوئی بد قدماش گروہ تھا جس کا شکار بہت سے بچے ہوئے تھے۔ میری زندگی کا وہ بدترین دن تھا جب مجھے سکول سے پرنسپل کا فون موصول ہوا، جو اس وقت انتہائی پریشان تھا۔ کہنے لگا کہ آپ کا بیٹا سکول گراؤنڈ میں مدھوش پڑا ہے، اس کی حالت اچھی نہیں۔ میں فوراً ہی بیٹے کے پاس سکول پہنچ گیا۔ اسے دیکھا تو پیروں تلے سے زمین کھک گئی۔ سیر واقعی نشے میں دھت تھا۔ اس نے دوا کی زیادہ مقدار لے لی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی نبض ڈوب رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یاد پڑتا ہے تو آج بھی کلبجہ منہ کو آتا ہے۔ اس وقت میرا بدن لرز رہا تھا۔ بچے کی طرف دیکتا تو دل بیٹھ جاتا جبکہ بے عزتی الگ ہوتی تھی۔ میرا دماغ تقریباً آؤف ہو گیا تھا۔ میں بیٹے کو ایسویٹس پر ڈال کر ہسپتال لے گیا پھر ہسپتالوں کے چکر لگا رہا۔ چھ ماہ کا عرصہ اس کے علان میں لگا۔ اس بیچ انکشاف ہوا کہ اسے جرائم کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اس کی عادت کے نتائج میں بھی بھگتا رہا۔ میں نے اسے سنبھالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ گھر میں رہ کر میرے سینے پر ہونگ دلتا رہا۔ مجھے یاد نہیں، کسی شب وہ دو بجے سے پہلے گھر آیا ہو۔ اسے کس حال میں بی بی اے مل کر پایا، یہ صرف میں جانتا ہوں۔

ہمارے ہاں بچہ جو والدین کے لئے وبال بن جائے، باہر بھجوا دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہاں آ کر نہ جانے وہ کیونکر سنبھلا، میں نہیں جانتا۔ سنبھلا تو اس نے نئی مصیبت ڈال دی اور من مانی کرتے ہوئے یہاں کسی تارکہ وطن خاندان میں شادی

”یہاں پھنسے رہنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ہمارے ہاتھ اتنے پیسے کبھی نہیں آ سکتے تھے کہ ہم وطن واپس جا سکیں۔ کئی بار یہ بھی سوچا تھا کہ کسی طرح بیٹی سے مدد مانگ لیں مگر بعد میں ارادہ ترک کر دیا۔ ہماری وجہ سے وہ شدید پریشان ہو جاتی۔“ اس نے آہ بھری اور فرش کی طرف دیکھنے لگا۔

عاشی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

”خدا خیر کرے، یہ گاڑی سیر کر کے؟“ بزرگ شخص بیٹے کی اچانک آمد پر چونک پڑا۔

”ہمیں اندر بلایا جا رہا ہے۔“ سیر نے آتے ہی کہا۔ وہ اکھڑا اکھڑا سا دکھائی دیتا تھا۔

”مجھے سب کچھ اچھا نہیں دکھتا۔“ بزرگ شخص نے عاشی سے کہا، پھر بیٹے کے ساتھ ہسپتال کی عمارت میں چلا گیا۔ عاشی تھوڑی دیر ان کے پیچھے چلتی رہی، پھر جان گئی کہ بڑی اماں انتقال کر چکی تھی۔

کوئی بھی گھر انہو، موت کے بعد بھج جاتا ہے۔ سانحے کا اثر گھر کے تمام افراد پر گہرا پڑتا ہے۔ جو جا چکا ہو، اس کی باتیں یاد آتی ہیں، اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کے رویوں پر تجزیے ہوتے ہیں، اس کے ساتھ گزری بد مزگیوں کو غلط فہمیوں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس کی اچھائیاں اچھالی جاتی ہیں اور اس کے جنتی ہونے کے جواز تلاش کئے جاتے ہیں۔

یہی کچھ سیر کے گھر ہوا ہو گا مگر ایک پہلو عاشی کو پریشان کر رہا تھا۔ بزرگ شخص جیتے جی مر چکا تھا۔ گھر کے معمول میں تو وہ لوٹ آیا تھا مگر اس کے چہرے پر سو گواریت چھپ چکی تھی۔ خاموشی سے سر جھکا کر اپنا کام کیا کرتا۔ کوئی بلاتا تو چپ چاپ اس کی طرف چلا جاتا۔ جو اسے کہا جاتا، وہ کر دیتا۔ لان میں اب وہ تنہا بٹھا کرتا اور سوچوں میں گم رہتا۔ کبھی اشک اس کی آنکھوں میں چمکنے لگتے، وہ جذباتوں سے لڑتا رہتا، تھوڑا

میں بے چارگی کا عنصر اسی وجہ سے آیا ہے کہ ہم نے اپنا معاشرہ چھوڑ دیا۔ یہاں آنے سے پہلے میں اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ پردیس میں ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا؟ سیر پہلی بار وطن لوٹا تو بالغ نظر دکھائی دیتا تھا۔“ بزرگ شخص نے جواب دیا۔

”یہاں حالات اگر آپ کے لئے موافق نہیں تھے تو آپ واپس وطن جا سکتے تھے۔“ عاشی نے کہا۔

”بہت مشکل تھا۔ ہم بیٹے کی ضرورت بن چکے تھے۔“ بزرگ شخص نے جواب دیا۔ پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں ادراک نہ کر سکا کہ ہم کیونکر والدین سے خادم کے روپ میں ڈھلے، پھر غلام بنتے گئے، کیونکہ خادم تو خدمات کے عوض معاوضہ طلب کرتا ہے، جبکہ ہماری تمام خدمات بلا معاوضہ تھیں۔ پھر خدام اس قدر پھنکار بھی نہیں سہتے، ہم تو غلامی سے بھی بدتر حالات میں رہے۔“

”آپ اب بھی واپس دیس جا سکتے ہیں؟“ عاشی نے سوال کا روپ بدل دیا۔

”شاید نہیں۔“ بزرگ شخص نے جواب دہرایا پھر کہا۔ ”ہم نہیں جا سکتے۔ ہم وزٹ ویزا پر یہاں آئے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی، ختم ہو چکا۔ بیٹے نے ہماری بابت یہاں مستقل رہائش کی درخواست کی تھی، جو منظور نہ ہو سکی۔ ہم نے اس کا گھر چھوڑا تو قانون کے زرنے میں آ جائیں گے۔ نہ صرف خود گرفتار ہوں گے بلکہ بیٹا بھی قانونی شکنجے میں آ جائے گا۔ میں یہاں قانون شکنی کے حق میں نہیں تھا لیکن ہم میاں بیوی بیٹے کے ہاتھوں مجبور رہے۔ اب سیر کی ماں ہسپتال میں پڑی ہے، فکر یہ ہے کہ اس کی یہاں موجودگی غیر قانونی ہے۔“ بزرگ شخص نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر دوبارہ بول پڑا اس کی آواز میں بلا کی بے چارگی تھی۔

سا لکھنا کھانا، باقی ایک طرف رکھ دیتا۔

”سیر! زندگی بوجھ بن گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ بیٹے کے پاس وطن چلا جاؤں۔ اس کو بھی سہارا مل جائے گا اور علی کو بھی۔ میری بھی شاید بہتر نہج جائے۔ مجھے واپس جانے دو“۔ ایک صبح اس نے اپنے بیٹے سے استدعا کی، تقریباً رو پڑا۔ سیر تھوڑی دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر خاموشی سے گاڑی پر بیٹھ کر چلا گیا۔ بزرگ شخص لاچار وہیں کھڑا رہ گیا، اس کی کار کو جاتا دیکھتا رہا۔

اس روز شام کے بعد عاشی اس کے پاس چلی گئی۔

”آپ وطن واپس چلے جائیں۔ اس نے کہا۔

”ہاں، جی تو بہت چاہتا ہے مگر مجبوریاں آڑے آ جاتی ہیں۔“ بزرگ شخص نے جواب دیا۔

”آپ کو خود ہی ہمت کرنا پڑے گی۔“ عاشی نے اسے حوصلہ دیا۔ لفظ لکھوں میں الجھ سے گئے۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی، بزرگ شخص عاشی کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی راہ اس کے سامنے کھلنے لگی تھی، طویل ویران سی راہ جس کے کناروں پر روشنیاں جلتے لگی تھیں۔ اس کی انتہا پر منور سا گھر اسے دکھائی دینے لگا۔

”میں حق تو نہیں رکھتی کہ آپ کے گھر یلو معاملات میں ٹانگ اڑاؤں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو محض اس لئے کروں گی کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور میں آپ کے مسائل سمجھتی ہوں۔ آپ چاہیں تو قانون کی مدد بھی لے سکتے ہیں، میں بھی آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔“ عاشی نے کہا۔

”قانونی مدد حاصل کرنے سے سیر پھنس جائے گا، جو میں نہیں چاہتا۔“

”آپ اچھی طرح سوچ لیں، میں آپ کو وطن

بھگانے کی منصوبہ بندی کروں گی۔ اس طرح کہ کسی کو نقصان بھی نہ پہنچے۔“ عاشی نے کہا۔ بزرگ شخص نے بے یقینی میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ حد درجہ پُر اعتماد دکھائی دیتی تھی۔ بوزھے بدن میں لرزش دوڑ گئی۔

آسمان پر سیاہ بادل اُٹھ آئے تھے۔ اس روز نے موسم کی پہلی برفباری کا امکان تھا۔ ہوا چلی تو سردی جسموں میں گھسنے لگی۔ کھڑکی بدستور کھلی تھی۔

”پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا؟“ بزرگ نے عاشی سے پوچھا، جیسے وہ حقیقی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر خدشوں کی گہری سلوٹیں ابھر آئیں۔ فوراً ہی اس نے ارادے کی ناکامی قبول کر لی مگر عاشی کے ارادے مختلف تھے۔ بولی۔

”آپ کو یاد ہوگا۔ پچھلے سال انہی دنوں کی بات ہے، آپ نے میرے گھر آ کر راستے صاف کئے تھے، جو برفباری سے اٹ گئے تھے۔ اس کے بدلے میں میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کے لئے دیا ہی لازمی ٹکٹ خریدوں گی، جیسا کہ اپنے لئے، مگر میں وہ ٹکٹ نہیں خرید سکی تھی، کیونکہ ان کی فروخت بند ہو گئی تھی۔“ عاشی نے کہا۔

بزرگ شخص خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ اس بار اس کی آواز میں جوش تھا اور مسرت بھی۔

”پچھلے دنوں یہ ٹکٹ دوبارہ فروخت کے لئے پیش کئے گئے تھے، مجھے اپنا عہد یاد تھا، میں نے خرید لئے۔ سر! آپ بہت خوش نصیب ہیں۔ ایک ٹکٹ پر جھوٹا انعام بھی نکل آیا تھا، میں نے وہ انعام حفاظت سے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ پیسہ اتنا ہے کہ آپ کی مراد پوری کر سکتا ہے پھر بھی رقم بچ جائے گی۔ چونکہ آپ کی زوجہ کا انتقال انہی دنوں ہوا تھا، اس لئے میں آپ کو یہ خبر نہ سنا سکی تھی۔“ یکدم بزرگ شخص کے چہرے پر امید

کے چراغ روشن ہو گئے۔
 ”کیا واقعی؟“ اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر اس کی
 آواز گلے میں رندہ سی گئی۔ ”میرے اللہ، بڑا کارساز
 ہے۔“ لبوں کی خاموشی اور جسم کے تامترا اشارے اس
 کے اظہار تشکر کی غمازی کرتے تھے، پھر دوا شک اس
 کے اس اظہار میں شمولیت پا گئے۔

عماد الدین سوچوں میں غلطان ہوئی جہاز سے
 اترتا تو بڑی طرح لڑکھڑا گیا۔ ایک الہکار نے بڑھ کر
 اسے تھام لیا۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ عماد الدین نے جواب دیا۔ پھر
 الہکار کو پہچانتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے مجھے گرنے سے
 بچا لیا، آپ کا شکر ہے۔“ میں ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا۔
 سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی بھی کسی فلاح کی طرح ہے،
 جہاں لوگ ملتے ہیں، ہم سفر بنتے ہیں، پھر پھڑکتے جاتے
 ہیں، ہمسفری کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ زندگی ہر شخص
 کو اس کی منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ اس نے کہا۔

”کیسی رہی آپ کی فلاح۔“ الہکار نے دوسرا
 سوال کر دیا۔ اسے عماد الدین کی ذہنی حالت کا ادراک
 نہیں تھا۔

”طویل تھی، سچ میں ایسا وقت بھی آیا جب میں
 ٹھکنے لگا تھا۔“ عماد الدین نے جواب دیا۔

”طیلس، اب آپ تازہ دم ہو جائیں۔ میں نے
 آپ کی بیٹی کو دیکھا تھا۔ باہر وہ آپ کی خنجر ہے۔“
 الہکار نے کہا اور سلام کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”ہاں، مجھے اب اسی کے لئے جینا ہے۔ اسے
 ایک قصہ بھی سنانا ہے، ایک پھڑکی ہوئی ہستی کا جو ہم
 دونوں کو بڑی عزیز تھی۔“ عماد الدین نے خیال کیا۔
 اشک اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اس کا ذہن
 جذبوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔



اگلی شام چائے بزرگ شخص نے عاشری کے ساتھ
 اس کے گھر کے لان میں پی۔ بیشتر وقت دونوں
 خاموش رہے۔ لفظ شاید ان کے جذبوں تلے دب گئے
 تھے۔ عاشری نے ایک خوبصورت کپ بزرگ شخص کو
 حقے میں دی اور کہا کہ ”یہ ٹوپی آپ کو میری یاد دلاتی
 رہے گی۔“

”موجودہ دور میں اپنی قدروں کی حفاظت کسی
 جہاد سے کم نہیں۔ انہی اقدار کی مضبوطی ہمیں مغرب
 میں رائج کج روی سے بچا سکتی ہے۔ ہمارے بہت
 سارے اچھے اوصاف مغربی معاشروں نے اپنا لئے ہیں
 مگر ہم ان کی خامیاں اپنانے کی طرف مائل ہیں۔“
 بزرگ شخص نے کہا۔

اسی روز بزرگ شخص نے کسی طرح اپنا پاسپورٹ
 حاصل کیا اور عاشری کو دے دیا۔

ایک ہفتہ بعد سمیر گہری شام سڑیٹ میں گھر گھر
 محسوس رہا تھا، عاشری کے پاس بھی چلا آیا۔ کہنے لگا۔
 ”میں اپنے ملک سے گھر لو ملازم ہمراہ لایا تھا، کچھ
 حواس باختہ تھا، صبح سے غائب ہے، نہیں مل رہا۔ آپ
 کے پاس کوئی معلومات ہوں تو میری رہنمائی کر دیں۔“
 ”سمیر صاحب! وہ قابل احترام شخص، جس نے
 آپ کو قابل فخر بنایا، صبح کی فلاح سے وطن واپس جا
 چکا ہے، اپنی بیٹی کے پاس، اپنے گھر۔ میرے خاندان
 نے اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ اسے تلاش مت کریں۔“
 بات سن کر سمیر بڑی طرح چونکا، اس نے جواما کچھ کہنا

تم اپنے شوہر سے طلاق لے لو اور میں اپنی بیوی کو طلاق
دے دیتا ہوں اس کے بعد ہمارا راستہ صاف ہے۔

بات ہے رسوائی کی

جنون عشق



0300-9667909

☆ دیکھیں شہزاد

جاوید چوہدری بڑی بیٹی سدرہ کی شادی پہلے ہی کر چکا تھا، اس لئے نویلہ کی ناگہانی موت کے بعد گھر بے ترتیب ہو گیا۔ سب سے بڑا مسئلہ قندیل کو سنبھالنے اور اس کی دیکھ بھال کا تھا۔ اس کا حل بھی جاوید چوہدری نے نکال لیا۔ زاہد چوہدری نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ لیا تھا، اس نے زاہد چوہدری کی شادی اپنی برادری کی لڑکی سارہ سے کر دی۔ علاقے میں سارہ کی پہچان مقبول لوگ فنکارہ کے طور پر تھی۔ پنجاب میں مقبول لوگ فنکاروں میں وہ کامیاب رقاصہ مانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ رقصوں میں وہ ماہر تھی۔ نیز وہ ایک گھر لیلو لڑکی بھی تھی۔

سارہ نے جاوید چوہدری کے گھر کے ساتھ ننھی قندیل کو بھی سنبھال لیا۔ دنیا نے دیکھا۔ اوپر والے نے نویلہ کو قندیل سے چھینا تو اسے سارہ کو دے دیا۔ سارہ ہی اس کی بھالی ماں بن گئی۔

قندیل کا باپ جاوید چوہدری ایک کال بلیا پنجابی لوگ فنکار تھا۔ سر پہ گلوکار اور ماہر رقاص ہونے کے بل پر ان کی رہی روٹی چلتی تھی۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ پاک عرب ناؤن میں رہتا تھا۔ اس کے کنبے میں بیوی نویلہ کے علاوہ اکلوتا بیٹا زاہد چوہدری اور تین بیٹیاں تھیں۔ ان میں سب سے چھوٹی قندیل تھی۔ اس کی پیدائش 6 مارچ 1999ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قصبہ گجرہ میں ہوئی تھی۔

جاوید چوہدری نے بیٹے زاہد چوہدری کو بھی گلوکاری اور رقص میں ماہر کر دیا تھا۔ پروگرام کو پیش کرنے وہ جہاں بھی جاتا زاہد چوہدری کو ساتھ لے جاتا تھا۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی کہ نویلہ اچانک کسی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ بیماری بھی ایسی کہ ایک بار کھٹ سے لگی تو پھر اس کا جنازہ ہی اٹھا۔ ان دنوں قندیل

سنیچوں پر پیشکش کے لئے اسے ملک بھر میں مدعو کیا جانے لگا۔ اس کے کچھ ویڈیو ایلم بھی بنے۔ ملک سے نکل کر قندیل کی شہرت غیر ممالک میں پہنچی تو پنجاب لوک رقص کی نمائش کے لئے اسے وہاں مدعو کیا جانے لگا۔ انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جرمنی، دوسری وغیرہ تقریباً بیس ملکوں میں قندیل نے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے پاکستان کا نام بلند کر دیا۔

ہمارے وطن کی فضا میں ہماری مٹی کی مہک و ہمارے پرندوں کی چپک، ہمارے ذروں کی دھک، ہمارے نغموں کی لہک، ہمارے دھوئیں کی کسک، ہمارے قہقہوں کی کھٹک اور ہمارے اپنے باغوں میں کھٹنے والے غنچوں کی چٹکی شامل ہونی چاہئے ہمیں اب مزید در یوزہ گری نہیں کرنی چاہئے۔

قندیل داس کے کنبے کے پاس نام و عزت، شہرت یا دولت سب کچھ تھا۔ بے حد مزے سے ان کی زندگی گزر رہی تھی کہ ایک دن اچانک ہی احد چوہدری کی کالی نظریں قندیل پر پڑ گئیں۔ احد چوہدری گوجرہ کا باشندہ تھا، اس کا باپ واحد چوہدری بھی لوک فنکار تھا۔ احد کا ایک بڑا بھائی شمر چوہدری بھی تھا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی سٹیج پر لوک فن پیش کیا کرتا تھا۔ چونکہ واحد چوہدری اور شمر چوہدری ان پڑھ تھے۔ لوک فن کی مارکیٹنگ کا بھی انہیں علم نہیں تھا اس لئے ان کی آمدنی بھی ڈھمل تھی۔ باپ و بھائی احد کو بھی سٹیج پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ مگر احد کو موجد مستی سے ہی فرصت نہیں تھی۔

محبت زمینوں اور زمانوں اور جہانوں اور آسمانوں کی سب سے بڑی سچائی ہے اور ماں اس آفاقی صداقت کی بلیغ شہادت ہے۔

2014ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے گوجرہ کے ایک ہوٹل میں قندیل کا ایک پروگرام تھا۔ اتفاق سے اسے

گزرے ہوئے وقت کے صحرا پر جب ایک آنسو گرا تو پہلی بھر میں روشنی سی ہوئی، یہ چمک خجوں کی وہ گھڑی ہے جو ساری عمر پر بھاری ہے۔

گرہستی میں گھل مل جانے کے باوجود سارہ لوک فن کی دنیا سے الگ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر اور سر بھی لوک فنکار تھے، اب کامیاب کال بلیا رقصہ، بہو بن کر گھر میں آگئی تو گھر میں فنکاروں کی عکازم بن گئی۔ سیاح آتے رہتے ہیں۔ سیزن میں تو سیاحوں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ ان ہی کی تفریح کے لئے پنجابی لوک کلاکاروں سے معاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس سے معاہدہ کا خوش انجام پہلو یہ رہا کہ اس عکازم کے پاس کام کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پیسہ تو ملتا ہی تھا، ویس بہ ویس میں ان کے نام کا ڈنکا ابھی بجتا تھا۔ غیر ملکی سیاح ان کی ویڈیو فلم بنا لے جاتے اور غیر ملک میں ان کی نمائش کرتے۔ ویڈیو فلم کے عوض گھریلو عکازم کو الگ سے پیسہ ملتا تھا۔

قندیل کو فن وراثت میں ملا تھا اور اللہ کی بھی اس پر مہربانی تھی۔ اس لئے ایک سال میں ہی بہترین کال بلیا ڈانس کرنے لگی اور محض چار سال کی عمر میں قندیل نے سٹیج پر اپنا پہلا مظاہرہ کیا تو تماشائیوں نے اس پر نوٹوں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد قندیل اور دل لگا کر سیکھنے لگی۔ سارہ اسے سکھاتی ہی نہیں بلکہ سر اور شوہر کے ساتھ اسے سٹیج پر پیش بھی کرتی تھی۔ گھریلو فنکار اب تین کی بجائے چار ہو گئے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ قندیل بڑی ہوئی تو اس کا فن بھی نکھرنا چلا گیا۔ قندیل نے صرف کال بلیا رقص تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا تھا بلکہ ٹھمری، باولی، ڈرولیس وغیرہ لوک رقصوں میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی جس کا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں قندیل کے رقص کی دھوم مچ گئی۔ اعلیٰ معیاری

بے عدل تمدن کے تعفن میں بے لوگوں کو کیا علم کہ آبرو کی خوشبو سے محروم ہر سانس ایک پھانس بن جایا کرتی ہے۔

سے ہو گئی۔

شادی کے بعد شوکت علی بھی سر کی ٹیم سے جڑ گیا۔ کنبے کے اب پانچ فنکار ہو گئے۔ قدیل کے بھائی زاہد چوہدری نے قسم قسم کے لوک فنکاروں میں ماہر کچھ دیگر فنکاروں کو بھی اپنے ساتھ ملا کر ایک الگ گروپ بنا لیا۔ ملک کو غیر ملک، پرفارمنس کے لئے پوری ٹیم ساتھ جاتی تھی۔

دوسری طرف حالات نے کچھ ایسے موڑ لئے کہ احد چوہدری بھی شادی کے بندھن میں بندھ گیا لیکن اس کے حواس پہ قدیل ہی چھائی رہی اور وہ اس کے لئے تڑپتا رہا۔ پھر اس کے دماغ میں فورسایا تو وہ قدیل سے اظہار محبت کرنے کے مواقع تلاش کرنے لگا اور اس کے ساتھ باپ اور بھائی کے پروگرام میں بھی دلچسپی لینے لگا اور دھیرے دھیرے وہ بھی پروگرام کا ایک حصہ بن گیا۔

ایک دن کی بات ہے کہ قدیل کہیں سے گھر کی طرف آ رہی تھی تو اتفاق سے راستے میں احد سے اس کا سامنا ہو گیا۔ قدیل کو اکیلا دیکھ کر احد کی محبت جوش مارنے لگی۔ قدیل بھی اسے دیکھ کر رک گئی۔

”کیسے ہو احد چوہدری؟“

”جی دوستیاں سمندری چٹانوں کی طرح ہوتی ہیں جن سے ٹکرا کر سازش لہریں اپنا سر پھوڑ بیٹھتی ہیں لیکن چٹانیں سر بلند رہتی ہیں۔“

”ویسا ہی ہوں جیسا مجھے ہونا چاہئے۔“ احد چوہدری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد احد نے پھر اس کی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیے۔

بھی کسی کام سے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شیخ پر قدیل کو بجلی کی طرح کڑکتے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ یہ طے نہیں کر پایا کہ قدیل زیادہ حسین ہے یا اس کا رقص۔ چونکہ وہ بھی کال بلیا تھا اس لئے تعلق نکال کر قدیل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے فن کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے بولا۔

”رقص کے ساتھ آپ خود بھی بہت خوبصورت ہیں۔“

ملک دیر دن ملک میں قدیل کو ایسے جیلے سننے کو ملتے تھے اس لئے اس نے بھی احد سے مسکرا کر رہنا شکر یہ کیا۔

قدیل سے پہلی ملاقات ہی احد کے دل پر اثر کر گئی۔ وہ اس کے حصول کے خواب دیکھنے لگا اور پھر اس نے یہ معمول بنالیا کہ جہاں کہیں قدیل کا پروگرام ہوتا وہاں پہنچ جاتا۔ ہر بار اس کی کوشش قدیل کو رجھانے کی ہوتی تھی۔ وہ اس سے یکطرفہ پیار کرنے لگا تھا اور قدیل سے شادی کرنے کا بھی خواہشمند تھا لیکن دونوں کے درمیان طبقاتی فرق کی ایسی کھائی تھی جسے پھلانگنے یا پانے کی ہمت وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ قدیل کے مقابلے میں اس کی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ اسی وجہ سے اس کے دل میں احساس کتری کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ احد قدیل سے براہ راست اظہار محبت نہیں کر سکا اور اس کی یہ چاہت یکطرفہ ہی رہی۔

احد اس کے کسی پروگرام میں اسے ملتا تو قدیل صاف دل سے ہنس کر بول لیتی تھی۔ اب ایک طرف احد اپنے منصوبے بنا رہا تھا، دوسری طرف قدیل کا باپ جاوید چوہدری قدیل کے ہاتھ پیلے کرنے کے منصوبے پر عمل کرنے کو تیار تھا۔ اس نے قدیل کے لئے مقامی لوگ فنکار شوکت علی کا انتخاب کر لیا تھا اور 20 اکتوبر 2014ء کو دھوم دھام سے قدیل کی شادی شوکت علی

انسان کتنا عجیب ہے

جب کرتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ بہت دور ہے اور جب پریشانوں مصیبتوں سے گھبرا کر دعا مانگتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اللہ بہت قریب ہے۔ (علیہ ربہ توسل)

کہا۔ ”میرا پیار قبول کر لو اور چلو میرے ساتھ در نہ انجام بہت بُرا ہوگا۔“ قتل کے سر پر موت ناچ رہی تھی۔ اس لئے وہ آٹو سے اتر گئی۔

”انجام کیا بُرا ہوگا؟“ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر تن کے بولی۔ ”جان سے مار دو گے مجھے، بڑا آیا مارنے والا۔ میں تیری خالی خولی دھکیوں سے ڈرنے والی نہیں۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتی، تھوکتی ہوں تیرے منہ پر۔ اب راستے سے ہٹ جا۔“

یہ کہہ کر قتل نے آٹو کی طرف مڑنا چاہا، تبھی احد نے اس پر چاقو سے وار کر دیا۔ کچھ سے چاقو پیٹ میں گھسا قتل چپچی، احد نے چاقو کھینچ لیا۔ زخم سے خون بہنے لگا۔ جان بچانے کے لئے قتل بھاگی تو احد نے دوڑ کر پکڑ لیا اور چاقو کے پے در پے واروں سے اسے گود کر رکھ دیا۔ اس کے بعد احد نے فرار ہونے کے لئے ایک نوجوان سے بایک چھینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھ سے چاقو گر گیا۔ اسی موقع پر جمع بھیڑ نے اسے پکڑ لیا بھی وہاں پولیس پہنچ گئی۔

تھکین طور سے زخمی قتل کو سول ہسپتال لے جایا گیا جہاں علاج کے دوران اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ معاملہ متعلقہ تھانہ میں مقدمہ قتل کے تحت درج کیا گیا۔ 31 جنوری کو احد کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں سے اسے جیل بھیج دیا گیا۔

تادم تحریر احد جیل میں تھا۔



ظاہرہ کو طلاق دے دوں گا۔ اس کے بعد ہمارا راتہ رات صاف ہے۔“

قتل کے تیس دن بعد ایک دم سے بدل گئے۔ ”میں تمہیں فن کا قدردان اور شریف آدمی سمجھتی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”اس لئے جس کر دو باتیں کر لیتی تھی۔ آج پتہ چلا کہ آپ یا تو سکی ہیں یا گری ہوئی سوچ کے انسان۔ آئندہ مجھ سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ یہ کہہ کر قتل کیمین کا پردہ ہٹا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

لیکن اس دن کے بعد احد ہاتھ دھو کے قتل کے پیچھے پڑ گیا۔ جہاں کہیں قتل کا پروگرام ہوتا احد وہاں پہنچ جاتا۔ اکیلے میں ملنے کا موقع بھی تلاش کر لیتا۔ اس کے بعد پھر اپنی تڑپ بیان کرنے لگتا۔ قتل پہلے تو احد کو جھکتی رہی پھر پیار سے اس کو سمجھانا شروع کیا لیکن قتل کی ہر کوشش بے کار جاتی کیونکہ احد تو جیسے پکتا گھڑا بن چکا تھا۔ سوتے جاگتے قتل، اچھے بیٹھے قتل، خوابوں میں قتل، خیالوں میں قتل۔

پھر اس نے جانے کیسے قتل کا ذاتی نمبر حاصل کر لیا اور اسے بار بار فون کر کے اپنی محبت کی دہائی دینے لگا۔ پہلے وہ خودکشی کرنے کی دھمکی دیا کرتا تھا۔ بعد میں وہ قتل کی جان لینے کی دھمکی دینے لگا۔

30 جنوری 2015ء کی شام پانچ بجے ڈسک کے تاج محل ہوٹل میں قتل کا پروگرام تھا۔ قتل کے حسن میں پاگل ہو رہے احد نے اپنی کمر میں چاقو لگایا اور نوارہ چوک پر پہنچ کر قتل کا انتظار کرنے لگا۔ ساڑھے چار بجے کے آس پاس قتل اپنے گروپ کی دو فنکار لڑکیوں کے ساتھ آٹو میں آئی دکھائی دی تو احد سڑک پہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ آگے جانے کا راستہ بند ہونے پر آٹو ڈرائیور سلیم کو بریک لگائی پڑی۔

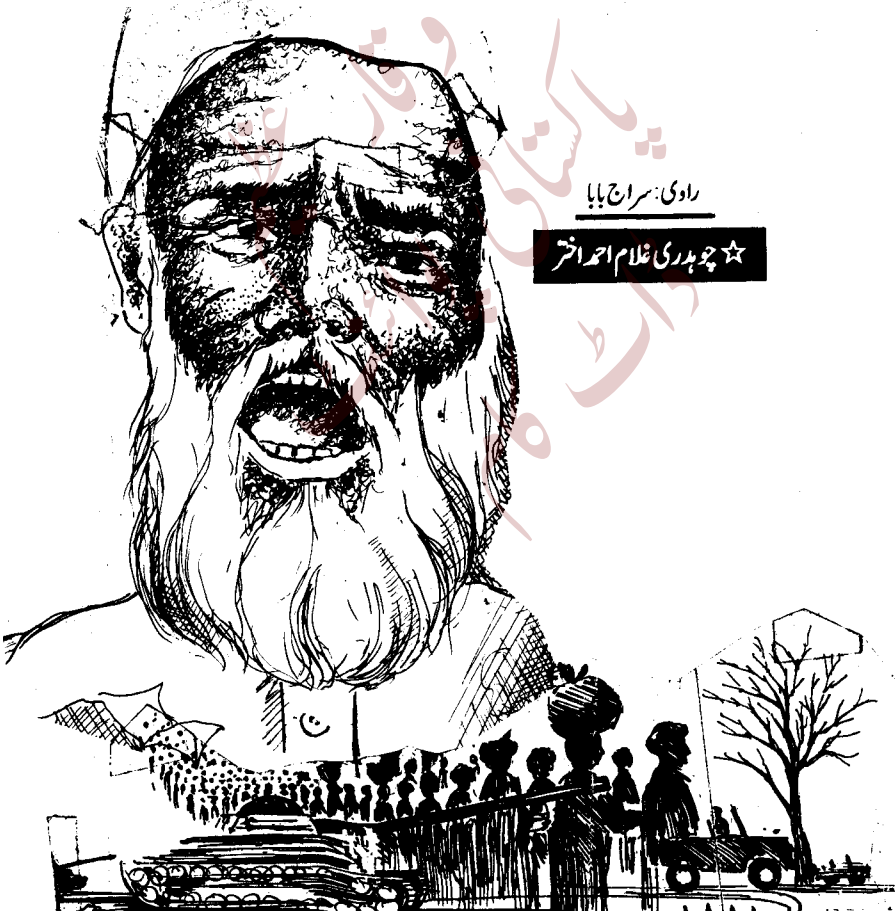
احد نے کمر میں اڑسا ہوا چاقو نکال کر قتل سے

وہ پاکستان کہاں ہے؟

آج ستر سال بعد میرے سامنے وہی جاں گداز یادیں، وہی خون آلود چہرے تڑپ رہے ہیں۔ نظریہ پاکستان فضا میں تحلیل ہو چکا ہے۔ زخموں سے پھر خون رسنے لگا ہے

راوی: سراج بابا

☆ چوہدری غلام احمد اختر



زیادہ تھیں۔ تالاب گاؤں کے مشرق میں واقع ہے اور پورے گاؤں کی گندگی اور نالیوں کا پانی اس میں گرتا ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں سے انٹرویو کئے۔ باہر سے آنے والوں سے اور گاؤں کے لوگوں سے بھی معلومات حاصل کیں۔ میں تالاب کے مشرقی حصے میں کھڑا ہو کر نہانے والوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

عورتیں نیم عریاں حالت میں نہا رہی تھیں۔ ایک طرف مرد بھی نہا رہے تھے۔ ہزاروں لوگ تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر تالاب میں نیم عریاں مرد اور عورتوں کو نہاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بے اختیار دریائے گنگا یاد آ گیا جہاں ہندو عورتیں اور مرد پوری بے حیائی سے اشان کرتے ہیں اور اپنے پاپ دھوتے ہیں۔ میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس نے اپنے

ناتواں کندھوں پر ایک بارہ پندرہ سال کے بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ تقریباً پانچ سال سے میں اپنے اپناج بچے کو یہاں لے کر آ رہا ہوں لیکن ابھی تک میرا بچہ ویسے کا دیا ہی ہے۔ پھر ایک ایسی عورت کو دیکھا جو اپنے ساتھ ایک خارش زدہ لڑکی کو لئے تالاب کے کنارے بیٹھی اسے نہلانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس عورت نے بتایا کہ عرصہ دو سال سے میری بیٹی خارش میں مبتلا ہے۔ پچھلے سال بھی اپنی بیٹی کو لے کر یہاں آئی تھی مگر کوئی آرام نہیں آیا۔ اس سال پھر لے کر آ گئی ہوں۔ میں نے اس عورت سے کہا۔ آئندہ دس سال تک بھی آتی رہو گی تب بھی تمہاری بیٹی کو آرام نہیں آئے گا۔ میں نے اس کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔

میں دراصل اس تالاب کی تاریخ جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لئے بہت لوگوں سے میں نے انٹرویو کئے مگر کوئی بھی نہ بتا سکا کہ یہ تالاب کب اور کیسے بنا اور کیونکر یہ اپا جوں اور خارش زدہ لوگوں کے لئے مشہور ہے۔

گاؤں بھوپال والہ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک رچھاڑا نام کا گاؤں ہے۔ جہاں صدیوں سے بیساکھ کی پہلی تاریخ کو میلہ لگتا ہے۔ بچپن سے سنتے آ رہے ہیں کہ رچھاڑا میں ایک بہت پرانا گندہ تالاب ہے جس میں پورے گاؤں کی نالیوں کا پانی گرتا ہے۔ لوگ اس میں نہاتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ خاص کر لوہے، لنگڑے، اپانج، خارش زدہ لوگ نہاتے ہیں اور بالکل تندرست ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ایک آدی نے مجھے بتایا کہ میرے ایک رشتہ دار کی ٹانگیں سوکھ کر لکڑی کی طرح ہو گئی تھیں، بڑے قابل ڈاکٹروں سے علاج کرایا، لاکھوں روپے خرچ کئے مگر آرام نہ آیا۔ وہ رچھاڑا گاؤں کے گندے تالاب میں نہانے سے بالکل تندرست ہو گیا۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس سال بیساکھ کی پہلی تاریخ کو ضرور رچھاڑا جاؤں گا اور مشاہدہ کروں گا کہ اس تالاب میں کیا خاصیت ہے کہ دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں نہانے آتے ہیں۔ میں نے اپنے پرانے دوست طاہر محمود عرف بلا پہلوان سے مشورہ کیا اور بیساکھ کی پہلی تاریخ رچھاڑا جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ دو دن کے بعد بیساکھ کی پہلی تاریخ تھی۔ بلے پہلوان نے گھوڑیوں پر بیٹھ کر جانے کا مشورہ دیا مگر میں نے معذرت کر لی۔ آج کے شینی دور میں کار، موٹر سائیکل، رکشہ، وٹیکن، بس ہر گاؤں اور دیہات میں جاتی ہیں مگر بلا آج بھی گھوڑی پر بیٹھ کر سفر کو ترجیح دیتا ہے۔ میں اتنا لمبا سفر گھوڑی پر بیٹھ کر نہیں کر سکتا۔ لہذا موٹر سائیکل کا انتخاب کیا اور بیساکھ کی پہلی تاریخ کو ہم رچھاڑا پہنچ گئے۔

رچھاڑا کے گندے تالاب کے متعلق میں نے جو کچھ سن رکھا تھا، اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گھوم پھر کر میلہ دیکھا۔ اس میلے میں مردم اور عورتیں

”ضرور لکھوں گا۔“ میں نے فوراً ہی بھر لی۔
”آپ اپنی کہانی سنائیں۔“

بوڑھا اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں چائے کی ایک پیالی تھی۔ مجھے پیالی پکڑا کر وہ چار پائی پر بیٹھ گیا اور ایک گھٹیا سا سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا۔ پھر جیسے خلاؤں میں گھورنے لگا۔ چند لمحے گزرے تو میں نے اسے یاد دلایا کہ آپ کچھ کہنے والے تھے۔ ”ہاں“ کہہ کر بوڑھے نے آنکھیں بند کیں جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ میں سمجھا شاید بوڑھا تالاب کے متعلق کچھ بتانے لگا ہے۔ بوڑھے نے جب اپنا منہ میری طرف کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”یہ 1947ء کی بات ہے۔“ بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ ”اس زمانے میں میں اس تالاب کے کنارے پر آ کر رہا تھا۔ میں اسی وقت بھر پور جوان تھا اور میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں گورداسپور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ ان دنوں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔“

”ایک روز جب میں اپنی بھینسوں کو چارہ ڈال رہا تھا، تب میں نے گاؤں کے باہر شور سنا۔ میں اپنی حویلی سے باہر نکلا تو مجھے پتہ چلا کہ بلونت سنگھ کے اکالی سکھوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔ میں گھر کی طرف بھاگا۔ میں ابھی گھر نہیں پہنچا تھا کہ میں نے مردوں کو گاؤں کے باہر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میرا باپ اور چاچے تائے بھی بھاگے جا رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں لوہے کا سر یا تھا اور کسی کے ہاتھ میں لکڑی کا لٹھ تھا۔ میرے باپ کے ہاتھ میں کپڑے دھونے والا ڈنڈا تھا۔ راستے میں میرا باپ مجھے ملا اور سختی سے تاکید کی کہ میں گھر سے باہر نہ نکلوں اور گھر کے اندر رہوں۔“

وہاں موجود ایک آدمی نے مجھے ایک بوڑھے بزرگ کے بارے میں بتایا کہ اس سے شاید مجھے کچھ معلومات مل سکیں۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ آدمی تالاب کے مشرقی کنارے سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹی سی کنیٹیا میں رہتا ہے۔

جب میں وہاں پہنچا تو کنیٹیا کے اندر بالکل سناٹا تھا۔ میں نے دروازے کی زنجیر بجائی تو اندر سے ”جی میں ابھی آیا“ کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک بزرگ نکلے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ بعد سلام دعا کے میں نے اندر بیٹھنے کی درخواست کی، بزرگ مجھے لے کر اندر کمرے میں چلے گئے۔ میں نے بیٹھنے ہی اپنا منہ عاید کیا۔

”میں ’حکایت‘ کے لئے لکھتا ہوں اور اس تالاب کی ہسٹری جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تالاب کب معرخی وجود میں آیا اور کیا تالاب کے اس گندے کپڑے سے واقعی لوگوں کو شفا ہوتی ہے؟“

میں نے بابا جی کو تفصیل سے ”حکایت“ کے متعلق بتایا۔ وہ بڑے غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔ یہ تو پتہ چلا آپ اس گندے تالاب کے متعلق جاننا چاہتے ہیں مگر یہ نہیں بتایا آپ آئے کہاں سے ہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں بیس میل دور ایک گاؤں بھوپال والہ سے آیا ہوں۔

”تم کیا لکھتے ہو؟“ اس بزرگ نے اشتیاق سے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ جب بیتی، ہڈ بیتی، چار دیواری کی دنیا کے اندر کی دھکی چھپی کہانیاں یا پھر کسی کے ساتھ پیش آنے والا ایسا واقعہ جو ناقابل فراموش ہو۔

”کیا تم میری کہانی لکھو گے؟“ اس بزرگ نے صرست سے پوچھا۔

یہ سب سکھوں کی کرپانوں اور رانٹلوں کا مقابلہ کرنے جا رہے تھے۔ میں گھر میں داخل ہوا اور ایک پرانی چارپائی سے لٹھ نکال کر باہر جانے لگا تو میری بیوی نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ”تم باہر نہ جاؤ۔“ بیوی نے التجا کی۔ ”باہر جان کا خطرہ ہے۔“

میں نے اپنی نئی نوپلی ڈھن کی اس التجا پر کوئی توجہ نہ دی۔ میں اس زمانے کی نئی پودکا حصہ تھا۔ لہذا میں بھی ان کے پیچھے بھاگا۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی نسلی خلا نہیں تھا۔ جہاں ان کے قدم اٹھتے وہیں میرے قدم پڑتے۔ نسلی خلا وہاں نمودار ہوتا ہے جہاں قدم سے قدم نہ ملا ہو۔

1947ء کے اس دن میرے سامنے زندگی کا مقصد موجود تھا۔ پرانی نسل کے سامنے بھی اور نئی نسل کے سامنے بھی۔ یہ مقصد پاکستان تھا۔ ایک ایسی جنت جہاں ہندو مسلمان کو زمین پر بٹھا کر پانی نہیں پلائے گا۔ جہاں ہولی کے تہوار پر نسیم عریاں ہو کر فرش گیت گاتا رقص کرتا ہندو مسلمانوں کے گلی کوچوں سے نہیں گزرے گا۔ ہمارے جلوسوں پر گندگی نہیں پھینکے گا۔ جہاں ہماری مسجدوں کی اذانیں ہندو اور سکھوں کی برائتوں کے بیڑے باجے کے شور میں گم نہیں ہوں گی۔ جہاں کوئی شدھی اور ستافن کی تحریک نہیں چلائی جاسکے گی۔ جہاں ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کو ماننے والے اپنے دینی تقاضوں کے مطابق آزادی و عزت اور امن و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔

یہ میرا مقصد حیات تھا اور یہی میری منزل تھی۔ میرا باپ بلیر سنگھ کی دیوار پھیلائی کر اکیلی سکھوں کے اوپر جا کر ا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے سکھوں پر ٹوٹ پڑا۔ سکھ تعداد میں زیادہ تھے، انہوں نے مل کر میرے باپ کو گھیر لیا۔ میرا باپ بہادری سے لڑتا ہوا

شہید ہو گیا۔ میرے چچا کا لڑتے ہوئے ایک بازو کٹ گیا۔ چچائے ہمت نہیں ہاری، تین سکھوں کو ہلاک کر کے شہید ہوا۔ میرے باپ کے دو چھوٹے بھائی لکڑی کی لٹھ سے بلیر سنگھ کی کرپان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ جب بلیر سنگھ نے دیکھا کہ یہ دونوں جوان مجھے ڈھیر کر دیں گے تو اس نے اپنے بڑے بیٹے کرم سنگھ کو آواز دی۔ کرما جو دیوار کی اوٹ میں بندوق تانے بیٹھا تھا، اس نے اپنے باپ کو مشکل میں دیکھا تو بندوق سے میرے دونوں چچوں کو شہید کر دیا۔ میں دوسری دیوار کی اوٹ سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ بلیر سنگھ اور کرم سنگھ فاتحانہ انداز میں میرے چچوں کی لاشوں کے اوپر کھڑے ہو کر تہقہ لگا رہے تھے۔ میرے پاس ایک مرے ہوئے سکھ کی کرپان تھی۔ یہ چھوٹی تلوار جیسی ہوتی ہے۔ میں نے دیوار کے اوپر سے جست لگائی اور بلیر سنگھ اور کرم سنگھ کے پیچھے گرا۔ دونوں باپ بیٹے نے گھوم کر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے، میں نے کرم سنگھ کے پیٹ میں کرپان گھونپ دی۔ کرم سنگھ کے پیٹ سے میں نے کرپان نکالی اور بجلی کی سی تیزی سے حیران کھڑے بلیر سنگھ کے پیٹ میں اتار دی۔

وہاں سے میں بھاگتا ہوا اپنی حویلی پہنچا تو ماں کو یہ خبر سنائی کہ ہمارے خاندان کے سب مرد شہید ہو چکے ہیں۔ ماں نے یہ خبر سن کر کلیجہ تھام لیا اور چکرار زمین پر گر پڑی۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اس کی روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

میں خون سے رنگے ہاتھوں اور خون آلود کپڑوں میں گھر میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نہ ماں زندہ رہی نہ کوئی بھائی بہن۔ میری بیوی بھی غائب تھی۔ میرا سب کچھ خون کی لال آندھی میں گم اور شعلوں میں جل کر راکھ ہو گیا۔ سب کی لاشیں میرے سامنے پڑی تھیں مگر میری بیوی کی لاش کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر

گھر سے رونے اور بین کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اپنی بیوی کو آوازیں دے رہا تھا۔ ”اگر تم بیچ گئی ہو تو آ جاؤ۔“ میں صحن میں کھڑا آوازیں دیتا رہا اور پھر میری آوازیں سسکیوں میں بدل گئیں۔ میں اپنی ماں اور بہن کی لاش پر جھکا ہوا تھا کہ سامنے سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر سے میری بیوی نور فاطمہ نکلی اور میرے ساتھ چٹ گئی۔ مشرقی پنجاب کے ہر شہر ہر گاؤں اور ہر گلی محلے میں فسادات کی آگ پھیل چکی تھی۔

شام ہونے کو تھی جب ہندوؤں اور سکھوں کے ایک اور جھٹے نے گاؤں کو گھرے میں لے لیا۔ جب سکھوں نے ”ست سری اکال، جو بولے سونہال“ اور ہندوؤں نے ”ہر ہر مہادیو“ کے نعرے لگائے تو گاؤں کے گھروں کے اندر دبکے ہوئے بچے چھپے عورتیں، بچے اور بوڑھے مرد اس طرح سہم گئے جیسے ہرن وحشی بھیڑیوں کی آوازیں کر سہم جاتے ہیں۔

میں نے سورج غروب ہوتے ہی نور فاطمہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی ماں بہن اور بھائی کی لاشوں پر آخری نظر ڈالی اور گھر سے باہر نکل آیا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں چھپتا چھپتا نگلی سے گزر کر گاؤں کی نکل پر پہنچا۔ سکھوں کا ہجوم جو خاصی بڑی تعداد میں تھا، شاید ہمارے گاؤں سے باہر نکلنے کا ہی منتظر تھا یا شاید ابھی قدرت کو ہماری زندگی منظور تھی۔ ادھر ہم چھپ کر گاؤں سے نکلے ادھر بلواریوں نے گاؤں میں گھس کر گھروں کو آگ لگا دی۔ گاؤں کے اندر سے بچوں اور عورتوں کی بلند چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف دیکھا مجھے بلند شعلوں میں عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بلواری انہیں زندہ جلا رہے تھے۔

میں کھیتوں کے درمیان چلتا رہا، نور فاطمہ میرے ساتھ تھی، آدمی سے زیادہ رات گزر گئی۔ اندھیری رات

میں میں نے محسوس کیا جیسے آگے سے پچھلے آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، میں رک گیا۔ میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو مجھے نور فاطمہ دکھائی نہ دی۔ میں پھر پیچھے کو بھاگا۔ میں اپنی بیوی نور فاطمہ کو اونچی آواز سے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تقریباً پچاس گز پیچھے گیا ہوں گا کہ نور فاطمہ منڈیر کے ساتھ پڑی بے ہوش ملی۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر سر کو دبایا، پھر ہاتھ اور پاؤں دبائے۔

”میں اب اور نہیں چل سکتی سراج!“ اس نے نجیف آوازیں کہا۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“ اتنا کہہ کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے نور فاطمہ کو پکڑ کر اٹھایا مگر نور فاطمہ پھر بیٹھ گئی۔ میں نے نور فاطمہ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور اپنے سفر کا رخ بدل دیا۔ مشکل سے پانچ سو گز دور گیا ہوں گا کہ مجھے آگے سے گھوڑوں کے نہہنناے کی آوازیں آئیں، میں رک گیا۔ نور فاطمہ کو نیچے اتارا اور درختوں کے ایک جھنڈ میں گھس گیا۔ جب گھوڑے آگے نکل گئے تو پھر سے میں نے نور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ رات کا آخری پہر ہو گا جب میں اپنے ننھیال گاؤں میں پہنچا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے محسوس کیا کہ پورے گاؤں کو کھنڈر بنا دیا گیا ہے۔ وہاں سے ہلکا ہلکا دھواں اب بھی اٹھ رہا تھا۔ اس میں انسانی گوشت کے جلنے کی بدبو دور سے ہی محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر بھی میں اپنے ننھیال کے گھر میں داخل ہو گیا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی میری نظر اپنے ماموں کی لاش پر پڑی جو جل کر کوئلہ بن چکی تھی۔ تھوڑی دور ممانی کی لاش پڑی تھی، ان کا پیٹ چاک تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرے میں ہر چیز خاکستر ہو چکی تھی۔ نور فاطمہ یہ سب دیکھ کر کانپ رہی تھی۔ میں نے نور فاطمہ کا ہاتھ پکڑا اور

چکے ہیں۔“

”ہم یہاں رک بھی تو نہیں سکتے فاطمہ!“ میں نے اس سے کہا۔ ”میں تمہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ہوں۔“

”کب تک اٹھاؤ گے سراج!“ فاطمہ نے کہا۔ ”پاکستان تو ابھی بہت دور ہے۔“

”ایسا نہ کہو فاطمہ!“ میں نے کہا۔ ”پاکستان ہم سے دور نہیں ہے فاطمہ! پاکستان تو اب ہمارے قریب ہے۔ ہمارے دلوں میں ہے آؤ میرے کندھے پر بیٹھو۔“

میں نے نور فاطمہ کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور چل دیا۔ بمشکل آدھا کوس چلا ہوں گا کہ مجھے اندھے میں انسانی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے نور فاطمہ کو نیچے اتارا اور راستے سے ہٹ کر یک بڑے درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ آوازیں اب قریب آ رہی تھیں۔ آہوں اور سسکیوں میں ایک عورت کہہ رہی تھی۔ ”میرا خاوند اور میرا بیٹا تو مار دیا ہے، مجھے بھی مار دے۔ میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گی۔“ جس درخت کی اوٹ میں میں اور نور فاطمہ کھڑے تھے۔ بالکل ہمارے سامنے پہنچ کر وہ عورت زمین پر بیٹھ گئی۔ ایک سکھ اس عورت کا ہاتھ پکڑے گھسیٹ رہا تھا اور وہ عورت خدا اور رسول کا واسطہ دے رہی تھی۔

”اپنے خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہو تمہیں مجھ سے چھڑا لیں۔“ اس سکھ نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔

میں نے خون آلود کرپان نکال کر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی اور دبے قدموں چلتا ہوا درخت کی اوٹ سے نکلا اور اندھیرے میں دونوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ میں نے بڑے آرام سے اس سکھ کے کاندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھا۔ وہ مجھے محسوس کر کے پیچھے پلٹا ہی تھا

باہر نکل آیا۔

اب میری اور نور فاطمہ کی منزل پاکستان تھی۔ صبح کا اجالا ہونے والا تھا۔ نور فاطمہ چل چل کر تھک چکی تھی اور بھوک سے غڑھال تھی۔ میں نے نور فاطمہ کو ایک جگہ بیٹھنے کو کہا کہ میں گاؤں کے اندر داخل ہو کر کھانے کو کچھ ڈھونڈ کر لاتا ہوں مگر نور فاطمہ میرے ساتھ جانے کے لئے بعد تھی۔ میں نور فاطمہ کو لے کر پھر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ ایک گھر میں گھسا تو دیکھا کہ محن میں چند لاشیں پڑی ہیں۔ میں باہر نکل آیا۔ ایک اور گھر میں داخل ہوا۔ دیکھا تو کمرؤں کے سب دروازے کھلے تھے اور کمرؤں کے اندر سے دھواں نکل رہا تھا۔ رسوئی میں داخل ہوا تو سوکھی ہوئی چند روٹیاں مل گئیں۔ وہ روٹیاں میں نے کپڑے میں باندھ لیں۔ میں اب گاؤں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ پوچھت رہی تھی اور میں نور فاطمہ کا ہاتھ تھامے تیز تیز چل رہا تھا۔ اندازہ نہیں میں اس گاؤں سے کتنی دور نکل آیا ہوں گا، مجھے ایک تالے کے ساتھ سرکنڈوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میں نور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر ان میں داخل ہو گیا۔ نور فاطمہ کو اندر بٹھا کر میں پھر باہر نکل آیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ جگہ ہمارے لئے کتنی فائدہ مند ہے۔ جب مجھے پوری تسلی ہو گئی ہم یہاں محفوظ ہیں تو ہم دونوں نے سوکھی ہوئی روٹی پانی میں سیکی کر کے کھائی، پانی پیا پھر سرکنڈوں میں ہی جگہ بنا کر لیٹ گئے۔

لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو دوبارہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ستاروں کی روشنی سے میں نے وقت کا اندازہ لگایا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ میں نے نور فاطمہ کو جگایا۔ نور فاطمہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے چلنے کو کہا مگر وہ چلنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔

”میں اب اور نہیں چل سکتی سراج!“ اس نے بڑے کرب سے کہا۔ ”میرے پیردوں میں چھالے پڑ

سے مسلمان لگتا تھا، میں نے السلام علیکم کہا جواب میں اس نے دُعا لیا۔ مجھے یقین ہو گیا یہ مسلمان ہے۔ میں نے اپنی پریشانی صاف صاف بتا دی۔ بزرگ میرے ساتھ کھیت تک گیا۔ نور فاطمہ کو ساتھ لیا اور گاؤں میں آ گئے۔

نور فاطمہ کو چار پائی پر لٹا کر آرام کرنے کو کہا اور وہ بزرگ کمرے سے باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس کمرے میں آئے تو ان کے ہاتھ میں دو دوائی کی پڑیا تھی۔ نور فاطمہ کو گرم دودھ کے ساتھ دوائی دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت کھانا لے کر آ گئی۔ میں نے کھانا کھایا اور فاطمہ کے منہ میں چند لقمے ڈالے۔ کھانے کے بعد میں چار پائی پر لیٹ گیا اور فاطمہ کی دلجوئی کرتا نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

جب نیند سے بیدار ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا نور فاطمہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اسے بھی اٹھایا۔ ہم دونوں کی طبیعت پہلے سے قدرے بہتر ہو چکی تھی۔ فاطمہ پھر سو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں بھی سو گیا۔ جب اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو ہم کافی حد تک تسخیل چکے تھے۔ اپنے کپڑے دھوئے نور فاطمہ کے بھی کپڑے دھوئے اور غسل کئے۔ نور فاطمہ کے پاؤں میں جو چھالے تھے وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے تھے اور چھالوں کی وجہ سے ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔

جس گھر میں ہم چھپے بیٹھے تھے ان کا گاؤں والوں کے ساتھ اثر و رسوخ اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ ان بزرگ کا نام محمد شفیع تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا اور محمد شفیع گاؤں کا نمبر دار تھا۔ لوگ محمد شفیع کی عزت کرتے تھے لیکن حالات اس نچ پر پہنچ چکے تھے کہ کسی پر اعتبار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان دنوں ہر طرح ایک نئی امید کی کرن لے کر آتی مگر شام مایوسی کے سائے پھیلا کر رخصت ہو جاتی۔ تقسیم ہند کا اعلان کیا ہوا آگ اور خون کا طوفان

کہ میں نے پوری طاقت سے کرپان اس سکھ کے پیٹ میں اتار دی۔ اس کے منہ سے میرے لئے ایک غلیظ گالی نکلی۔ میں نے پیٹ سے کرپان کھینچ کر اس کے دل کے مقام پر سینے میں اتار دی۔ وہ دھڑام سے زمین پر گرا اور پھر اس کی آواز نہیں آئی۔ وہ عورت جس کا اس نے ہاتھ پکڑ رکھا تھا، اس کے گرتے ہی جدھر سے آئی تھی، ادھر کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر وہ کی نہیں، اندھیرے میں گم ہو گئی۔

نور فاطمہ جس نے بھی مرئی ذبح ہوتے نہیں دیکھی تھی، اب اپنی آنکھوں سے انسانی قتل ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سب دیکھ کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے نور فاطمہ کا ہاتھ پکڑا اور چل دیا۔ فاطمہ کے پاؤں میں چھالے تھے، اس نے چلنے سے معذوری ظاہر کی اور میں دوبارہ اسے اپنی پیٹھ پر لا کر چل دیا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ نور فاطمہ میرے کاندھوں پر تھی اور میں چلا جا رہا تھا۔ دہلی پتلی نور فاطمہ کا وزن میرے لئے نہ ہونے کے برابر تھا۔

چلتے چلتے نور فاطمہ کو پیاس محسوس ہوئی مگر پانی کہاں تھا۔ تھوڑا آگے گئے تو ایک گڑھے میں بارش کا پانی نظر آیا۔ اس پانی سے بدبو اٹھ رہی تھی، مجبوراً میں نے نور فاطمہ کو چند ٹھونٹ پانی پلایا اور خود بھی پیا اور پھر وہی دوڑ دھوپ اور افراتفری۔ مشرق کا اجالا نمودار ہو رہا تھا اور ہم رات بھر تقریباً تین میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ نہ منزل کی خبر نہ مقام کا پتہ۔ پھر ایک اور مصیبت پیدا ہو گئی۔ نور فاطمہ کو بخار نے آ لیا۔ یہ غالباً ملیریا تھا۔ چلتے چلتے سورج سر پر آ گیا۔ میں فاطمہ کو لے کر کما د کے کھیت میں مھس گیا۔ بخار سے نور فاطمہ کا جسم کانپ رہا تھا اور میں فاطمہ کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کو کما د کے کھیت میں چھوڑا اور قریبی گاؤں کی طرف چل دیا۔ اتفاق سے مجھے ایک بزرگ مل گیا، جو چلے

اور پھر ہم نے محمد شفیع سے جانے کی رضامندی ظاہر کر دی۔ رات کو خاموشی سے اس گاؤں سے نکل آئے۔ نور فاطمہ کا ہاتھ تھامے میں اندھیری رات میں انجاناً منزل کی طرف چل پڑا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا جب ہم ایک نہر کا پل عبور کر رہے تھے۔ جب پل پار کیا تو اچانک دو آدمی ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کرپان جو پہلے ہی میرے ہاتھ میں تھی، میں نے ہنگامی حالت کے لئے تیار رکھی تھی۔

”کون ہو؟“ انہوں نے سوال کیا۔

میں بالکل نہیں ڈرنا ہی دل میں خوف آیا، میں نے کہا۔ میں مسلمان ہوں۔ دونوں آدمی چلتے ہوئے ہمارے قریب آ گئے۔ دونوں کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ دونوں ہی سکھ تھے۔

”پاکستان جا رہے ہو؟“ دونوں نے بے یک زبان سوال کیا۔

”ہاں، پاکستان جا رہا ہوں۔“ میں نے بے خوفی سے کہا۔

”وہ سامنے ہمارا ڈیرہ ہے۔“ ایک نے کہا۔ ”رات ہمارے ساتھ بسر کرو، صبح ہوتے ہی چلے جانا۔“ یہ ایک ناممکن بات تھی۔ سکھوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی۔ میرا ذہن خطرے کا الارم بجانے لگا۔

”بڑی مہربانی سردار جی!“ میں نے یہ کہہ کر ان سے کترا کر نکلنے لگا تو دونوں میرے راستے میں آ گئے۔

نور فاطمہ میری پیٹھ پیچھے چپک کر کھڑی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور میرا ذہن تیار تھا۔

”عورت ہمارے حوالے کر دو۔“ ایک سکھ نے کہا۔ ”ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔“

نور فاطمہ جو میرے پیچھے سہی کھڑی تھی، میرے ساتھ اور چپک گئی۔ میں نے نور فاطمہ کو اپنے سے تھوڑا سا علیحدہ کیا۔ کرپان جو میں نے اپنے ہاتھ کی منٹھی میں

اٹھ آیا۔ مشرقی پنجاب مکمل طور پر فسادات کی پیٹ میں آ گیا۔ فساد کی آگ اس گاؤں میں بھی پھیل چکی تھی۔ اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں اور سکھوں سے کہیں زیادہ تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ گاؤں ابھی تک تعصب کے شعلوں سے محفوظ تھا۔

مجھے اس گاؤں میں چوتھا دن تھا۔ شام کے وقت محمد شفیع میرے کمرے میں آیا اور خبر دی کہ ہندو اور سکھ آج رات ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ اگر آپ گاؤں سے جانا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو گاؤں سے باہر تک چھوڑ آتے ہیں اور اگر یہیں رہنا چاہتے ہیں تو ہم پوری حفاظت کریں گے۔

”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے محمد شفیع سے کہا۔ ”میں اور نور فاطمہ یہیں رہیں گے۔ نور فاطمہ ٹھیک ہو جائے گی تو ہم چلے جائیں گے۔“ رات اپنی زلفیں پھیلانے کی تیاری کر رہی تھی۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کی گلیاں اور راستے بند کر دیے گئے۔ مسلمانوں نے چھتوں پر مورچے بنا لئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کا جھٹاوا گروست سری اکال کا نعرہ لگاتا گاؤں میں داخل ہوا۔ بڑا ہی سخت مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے جرات سے مقابلہ کیا پھر بھی سکھوں نے کئی مکانوں کو آگ لگا دی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔ گاؤں میں چیخ و پکار تھی۔ ایک قیامت کا منظر تھا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ سکھ اپنی کارروائی کے بعد پسپا ہو کر واپس چلے گئے۔ گاؤں سے شعلے ابھی تک اٹھ رہے تھے اور لوگ آگ پر قابو پانے کی کوششیں کر رہے تھے۔

”کیا ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے؟“ میں نے نور فاطمہ سے پوچھا۔ ”یہیں بیٹھے رہیں؟“

نور فاطمہ جو پہلے ہی ڈری اور سہی ہوئی تھی، نے فوراً کہا۔ ہاں ہمیں اس گاؤں سے جلد نکل جانا چاہئے

R.T.M 121987

MASTER

کلاسٹر

موٹر زیمپس

ٹیسٹ پیل پپ

ٹیسٹ پیل پپ

ٹیسٹ پیل پپ

ٹیسٹ پیل پپ

کلاٹیکس آباد

جی۔ ٹی روڈ گوجرانوالہ

055-3252468

055-3483695

پکڑ کر بازو کے ساتھ لگا رکھی تھی، پلک جھپکتے میں ایک سکھ کے پیٹ میں اتار دی۔ دوسرا سکھ ابھی سمجھ ہی نہ پایا تھا کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کرپان کیجی اور دوسرے کے پیٹ میں اتار دی۔ پہلے والا کرپان لے کر میری طرف بڑھا۔ کرپان ابھی ہوا ہی میں تھی کہ میں نے دوسری بار کرپان اس کے پیٹ میں اتار دی اور اس کی کرپان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ میں نے وہی کرپان دوسرے سکھ کی پسلی میں داخل کر دی۔

اندھیری رات میں یہ سب چند لمحوں میں ہو گیا۔ میں بھاگا نہیں۔ میں نور فاطمہ کو لے کر کھڑا رہا۔ جب دونوں ٹھنڈے ہو گئے تو میں نے دونوں کی لاشیں تھسٹ کر پڑی سے نیچے پھینک دیں اور ان کی کرپانیں نہر میں پھینک دیں۔ میرے کپڑے خون آلود تھے۔ میں نے پل کے ساتھ سیزرھی پر بیٹھ کر خون آلود کپڑے اور ہاتھ دھوئے اور جلدی سے نور فاطمہ کو لے کر چل پڑ۔

میں کوئی پیشہ ور قاتل نہیں تھا۔ میں تو اپنی اور اپنی بیوی کی جان بچانے کے لئے خون کر رہا تھا۔ اگر میں انہیں قتل کرتا تو وہ مجھے قتل کر دیتے اور میری بیوی لے جاتے۔ میں محمد شفیع کے بتائے ہوئے راستے پر اندھیری رات میں سفر کر رہا تھا۔ غالباً رات کا آخری پہر تھا۔ نور فاطمہ نے چلنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ نور فاطمہ کے پاؤں پھر سے سوج چکے تھے۔ میں نے نور فاطمہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ جب پو پھٹ رہی تھی تو ہم ایک برساتی نالے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ میں نور فاطمہ کو لے کر سرکنڈوں میں گھس گیا اور اسے لٹا دیا اور خود بھی لیٹ گیا۔ رات پہلے پہر والا واقعہ میرے ذہن میں قلم کی طرح چل رہا تھا۔

بھوک اور پیاس کی شدت نے ہم دونوں کو

قافلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو سوائے بیلوں کے قافلہ کٹ چکا تھا۔ کسی میں بھی زندگی کا کوئی آثار نہیں تھا۔

مجھے خوراک کی تلاش تھی۔ ایک نیل گاڑی سے مجھے اہلی ہوئی گندم کے دانے اور کچھ سوکھی ہوئی روٹیاں مل گئیں اور ایک برتن پانی پینے کے لئے۔ میں واپس پلٹا اور اصل راستہ چھوڑ کر سرکنڈوں میں گھس گیا۔ میں جلد سے جلد نور فاطمہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ نور فاطمہ بھوک سے بلک رہی تھی۔ میں سرکنڈوں سے نکل کر نالے کے کنارے سے چلتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں میں نور فاطمہ کو چھوڑ کر گیا تھا مگر نور فاطمہ وہاں نہیں تھی۔ میں بھاگ کر نالے کے کنارے پر اوپر آیا۔ آوازیں دیں مگر نور فاطمہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سرکنڈوں میں گھس گیا کہ شاید سرکنڈوں میں سو رہی ہو۔ پھر میں نے اونچی آواز سے پکارنا شروع کیا۔ نور فاطمہ، نور فاطمہ کہاں ہو۔ دیکھو میں تمہارے لئے کھانا لے کر آیا ہوں۔ میں کبھی سرکنڈوں میں گھستا ور کبھی نالے میں اترتا۔ مگر نور فاطمہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ مجھے نور فاطمہ کو تلاش کرتے رات ہو گئی مگر نور فاطمہ کا کہیں سراغ نہ ملا۔ میں واپس اسی جگہ پہنچ گیا جہاں میں نور فاطمہ کو چھوڑ کر اس کے لئے خوراک لینے گیا تھا، میں رات وہیں پڑا رہا۔

ایک نور فاطمہ تھی جس کا مجھے سہارا تھا، وہ بھی سکھ اٹھالے گئے۔ میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ میں نے اندازے سے پاکستان کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا۔ شام ہونے کو میں نے دو سکھوں کو دیکھا جو مویشیوں کے لئے ایک کھیت سے چارہ کاٹ رہے تھے۔ میں چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں ہی چارہ چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے قریب پہنچ کر اگلے گاؤں کا راستہ پوچھا۔ بوڑھا سکھ ابھی راستہ

نڈھال کر دیا تھا۔ نور فاطمہ اتنی ڈری اور سہمی ہوئی تھی کہ مجھے خوراک کے لئے کہیں جانے بھی نہیں دیتی تھی۔ میں خود تو بھوکا اور پیاسا رہ سکتا تھا مگر نور فاطمہ کی بھوک اور پیاس مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ جس علاقے میں ہم تھے یہ خاص سکھوں کا علاقہ تھا۔ قدم قدم پر موت نظر آ رہی تھی۔ میں نور فاطمہ کو تسلی دے کر نالے پر باہر نکلا اور سرکنڈوں اور نالے کے کنارے کے ساتھ چلتا ہوا کچی سڑک پر پہنچا۔ دیکھا تو دور سے نیل گاڑیوں کا ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں چمک آ گئی۔ مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ مجھے خوراک اور سفر کا مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے قافلے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی دو یا اڑھائی ایکڑ ہی گیا ہوں گا کہ مجھے قافلے کے پیچھے سے دھول اڑتی نظر آئی۔ میں وچیں رک گیا اور پھر گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے سکھوں نے قافلے کو گھیرے میں لے لیا۔ میں فوراً کماڈ کے چھوٹے سے کھیت میں گھس کر کماڈ کی ایک نکر پر کھڑا ہو گیا۔ قافلہ پانچ یا سات نیل گاڑیوں پر مشتمل تھا۔ قافلہ رک گیا اور قافلے کے کچھ آدمی نیل گاڑیوں سے اتر کر قافلے کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ سکھوں نے کرپانوں سے آدمیوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ مسلمان جو نہتے تھے، لائیموں سے مقابلہ کر رہے تھے مگر کب تک، چند ہی لمحوں میں نہتے مسلمان قافلے کو سکھوں نے ختم کر دیا۔ بچوں کو کرپانوں کی نوکوں میں پرو دیا۔ جوان لڑکیوں کو بالوں سے پکڑ کر کھینٹے ہوئے گھوڑوں پر بٹھایا اور گھوڑوں کا رخ نالے کی طرف کیا اور پھر میرے دیکھتے ہی سب گھوڑے سرکنڈوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ میں سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بوڑھی عورتوں اور بچوں اور جوانوں کو کٹتے دیکھا۔ جوان لڑکیوں کی چیخ و پکاری۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ سکھ جوان لڑکیوں کو اٹھا کر بھاگ چکے تھے۔ دھول بیٹھ چکی تھی اور میں مردہ

کہا۔ ”مجھے سلا لے گیا ہر تارے!“

اتنی دیر میں میں نے دوسرے کچھ کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ اس کی آواز سن کر عورتوں نے چیخ و پکار شروع کر دی اور گاؤں کی طرف بھاگیں۔ میں پیچھے بھاگ کر عورتوں میں گھس گیا اور ایک عورت کی پہلی میں کرپان ماری۔ وہ گر پڑی تو میں نے ایک اور کو پکڑ لیا اور اس کا گلا کاٹ دیا۔ دوسری عورتوں نے گاؤں پہنچ کر شور مچا دیا۔ اندھیرا مجھے فائدہ دے رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگا اور گاؤں کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ میں رات کے سنانے میں ان کی آوازیں سن رہا تھا۔ وہ مجھے اس طرف تلاش کر رہے تھے اور میں دوسری طرف سے گاؤں کی حدود سے نکل چکا تھا۔ میں نے ستاروں کی مدد سے اپنا سفر جاری رکھا اور دن کے جالے تک میں چلتا رہا۔

میں رات کے اندھیرے میں بہت دور نکل چکا تھا۔ دن کا اجالا ہوا تو میں کماد کے ایک کھیت میں گھس کر سو گیا۔ نور فاطمہ مجھے پل پل یاد آ رہی تھی۔ میں نے خواب میں دیکھا نور فاطمہ مجھے پکار رہی ہے۔ مجھے بجالو سرتاج! مجھے ان درندوں سے بچا لو اور میری آنکھ کھل گئی۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ بھوک ستا رہی تھی۔ میں نے اسی کھیت سے گھنے چو سے اور پھر کھیت سے نکل کر باہر کا جائزہ لیا اور ایک سمت چل پڑا۔ آگے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ندی عبور کر کے اپنا سفر جاری رکھا۔ دور سے مجھے ایک قافلہ نظر آیا۔ میں اس سمت چل پڑا اور قافلے کے ساتھ مل گیا۔ قافلہ ساری رات چلتا رہا اور ہزاروں لوگ قافلے کے ساتھ ملتے گئے۔ ایک دن قیام کے بعد پھر پیدل پاکستان کی سمت روانہ ہوئے اور جی ٹی روڈ پر پہنچ گئے۔ مگر یہ سڑک غیر محفوظ تھی، پاکستان ہمیں سب سے عزیز تھا لہذا چلتے گئے۔ کئی قافلے ملنے سے ہمارا یہ قافلہ ایک بہت بڑا قافلہ بن گیا جو تیل گاڑیوں، گھوڑوں، گدھا گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں پر مشتمل تھا۔ اس

بتانے ہی لگا تھا، میں نے بجلی کی سی تیزی سے کرپان بوڑھے کے پیٹ میں اتار دی۔ قریب کھڑا اس کا بیٹا سمجھ ہی نہ پایا تھا یہ کیا ہو گیا۔ میں نے بیٹے کے پیٹ میں بھی کرپان اتار دی۔

میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ کاش! کچھ میری موجودگی میں نور فاطمہ کو اٹھانے آتے تو میرے دل میں حسرت نہ رہتی کہ نور فاطمہ کو بچا نہیں سکا۔ بار بار میرے دل میں خیال آ رہا تھا۔ نہ جانے میری نور فاطمہ کس حال میں ہوگی۔ میں اندھیرے میں ہی چلا جا رہا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے آواز دے کر روکا۔

”کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟“ ایک نے پوچھا۔

میں بالکل نہیں ڈرا۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈر اور خوف میرے دل سے نکل چکا تھا اور میں نور فاطمہ کے بغیر زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بغیر کسی خوف کے کہا کہ مسلمان ہوں اور پاکستان جا رہا ہوں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اونچی آواز سے ہنسنے لگے۔

”تم غلط راستے سے پاکستان کی سرحد کی طرف جا رہے ہو۔“ ایک کچھ نے کہا۔

”تو مجھے صحیح راستہ بتا دو۔“ میں نے کہا۔ ”جس پر میں چلتا ہوا پاکستان پہنچ جاؤں۔“ اندھیرا مکمل طور پر پھیل چکا تھا۔ دونوں کے گلے میں کرپانیں لٹک رہی تھیں۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا میرا ذہن بالکل تیار تھا۔ گاؤں کے اکا دکا لوگ ہمارے قریب سے گزر رہے تھے۔ کچھ عورتیں رنج حاجت کے لئے گاؤں کے ساتھ قریبی کھیت میں کھڑی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی کرپانیں نیام سے نکالتے، میں نے کرپان ایک کچھ کے پیٹ میں اتار دی۔ اس نے ماں کی گالی دے کر

آنکھیں بند کر کے لیٹا نور فاطمہ میرے سامنے آن کھڑی ہو جاتی اور جب نیند میں چلا جاتا تو خواب میں کہتی مجھے بچا لوسرتاج! سکھ مجھے لے جا رہے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور میرا وجود پسینے سے تر ہو جاتا۔

پھر مجھے پتہ چلا ہندوستان سے اغوا کی ہوئی عورتیں حکومت واپس لا رہی ہے۔ میں کوئی پچاس مرتبہ لاہور گیا مگر میری نور فاطمہ نہیں آئی۔ وقت گزرتا گیا مگر نور فاطمہ کی یاد آج بھی میرے دل میں ہے۔ اسی لئے میں نے شادی نہیں کی۔ میں نے عہد کر لیا کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں نور فاطمہ اب کسی سکھ کی بیوی ہو گی۔ شاید اس کا نام پریتم کور ہو گا یا پھر پرکاش کور، گلشن کور ہو گا، اس کے بچے بھی ہوں گے۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے ضرور یاد کرنی ہو گی اور میری طرح روتی ہو گی۔

اور پھر بوڑھے نے اپنا منہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ میں نے اسے چپ نہیں کرایا، رونے دیا۔ جب اس کے دل کا غبار دھل گیا تو اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ آنسوؤں سے داڑھی تر ہو چکی تھی۔ پھر مخاطب ہوا۔

آج ستر سال بعد میرے سامنے وہی جاں گداز یادیں، وہی خون آلود چہرے تڑپ رہے ہیں۔ نظریہ پاکستان فضا میں تحلیل ہو چکا ہے۔ زمنوں سے پھر خون رسنے لگا ہے اور شہیدوں کا لہو پکار رہا ہے کہ وہ امیدیں جن میں اسلامی انقلاب کا رنگ جھلکتا تھا، وہ قربانیاں جو تحریک پاکستان کی جدوجہد کی روشنی تھیں، کہاں ہیں؟ ان کے ثمرات کہاں ہیں؟

اس نظریاتی حسن کو کس نے چرا لیا؟ یہ حرص و ہوس کی آندھیاں کیوں چلنے لگیں؟ ایثار و محبت، خلوص پیار اور جذبہ حب الوطنی کہاں غائب ہو گئے؟ اگست آتا ہے تو یہ ٹٹماتے چراغ بھڑک اٹھتے ہیں۔ جیسے آخری بجلی

میں بوڑھے جوان بچے سب پاکستان کی سرزمین مقدس پر پہنچنے کے لئے بے تاب تھے۔

لوگ اپنی بھوک پیاس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے رواں دواں تھے۔ ہم سب لوگ بارش کا پانی پیتے تھے کیونکہ مشہور ہو گیا تھا۔ ہندوؤں نے جی ٹی روڈ کے نزدیکی کنوؤں میں زہر ڈال دیا ہے۔ جی ٹی روڈ پر ہمارے قافلے پر حملے ہوتے رہے جن میں ہزاروں لوگ شہید ہوئے۔ پہلے سے گزرے ہوئے قافلے کے لوگوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی ہمارے قافلے کی حفاظت کے لئے پہنچ گئی یوں اللہ کے فضل و کرم سے سکھوں کے حملے بند ہو گئے اور قافلہ بحفاظت امرتسر پہنچ گیا۔

امرتسر سے سکھ پناہ گزینوں کو لینے کے لئے کچھ بسیں پاکستان جا رہی تھیں۔ سپاہیوں نے ان بسوں میں قافلے کے کئی خاندان سوار کرائے تاکہ تھکے ماندے لوگ پاکستان پہنچ سکیں لیکن ان میں سے چند ہی بسیں پاکستان پہنچ سکیں۔ جن میں میں بھی سوار تھا۔ باقی بسوں کو جو ہمارے آگے تھیں۔ امرتسر ہی میں گزرتے وقت بم مار کر تباہ کر دیا تھا۔ چونکہ میری زندگی باقی تھی لہذا جب آخری بسیں شہر سے گزر رہی تھیں تو بلوچ رجمنٹ کے چند سپاہی پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا۔ ہم سے آگے جانے والی بسوں کا تباہ شدہ ملہ اور سینکڑوں لاشوں اور زخمیوں کو تڑپتے ہوئے دیکھا تھا لہذا ہمیں واہمہ چیک پوسٹ پر پہنچا کر ہی واپس گئے۔

میں جب لاہور پہنچا تو والٹن میں بیٹھے کی دبا پھیل چکی تھی۔ میرا سارا خاندان ہندوؤں اور سکھوں نے ختم کر دیا تھا۔ نور فاطمہ کا ساتھ تھا وہ بھی کافروں نے جھین لیا۔ میرا کون تھا یہاں؟ لاہور سے ہی مجھے ایک بزرگ ملے اور میں ان کے ساتھ یہاں رچھاڑا میں آ گیا۔ نور فاطمہ کی یاد مجھے بہت ستاتی۔ میں رات کو جب بھی

حقوق پامال کرتے رہے۔ ہم نے اس کا شکر ادا نہیں کیا۔

بلکہ اللہ کی مرضی کے خلاف اپنے اختیار کا استعمال کیا۔ آج کی نسل جوئی وی، انٹرنیٹ اور کیبل کے نشے میں مبتلا ہے۔ نظریہ پاکستان جاننے کے لئے تیار نہیں۔ قیام پاکستان کا مقصد سننے کے لئے تیار نہیں اور شاید ہمارے سیاست دان بھی بتانے کے لئے تیار نہیں کہ کل کو ہمارے اقتدار کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ قوم سوئی رہے اور ہمارا اقتدار قائم رہے۔

شاید اسی لئے آج کی نسل کہہ رہی ہے یہ کیرمٹ جانی چاہئے، ہم سرحدوں کے قائل نہیں۔ ہماری زبان ایک ہے، ہماری ثقافت ایک ہے، اب ہمیں پھر سے ایک ہو جانا چاہئے۔ امن کی آشتی پار کی بھاشا کے راگ الاپے جا رہے ہیں۔

میرے دل میں اس ملک کی محبت موجود ہے کیونکہ اس کی بنیادوں میں میرے ماں باپ کا، میرے بہن بھائیوں کا لبو شامل ہے۔ میری نور فاطمہ کی قربانی شامل ہے۔ پاکستان ہماری پناہ گاہ ہے۔ اس کی قدر کرو اور نئی نسل کو بتاؤ پاکستان ہم نے کیوں اور کیسے حاصل کیا۔

میں جو ر چھاڑے کے اس گندے تالاب کی تحقیق کے لئے گیا تھا، ایک نیاغم ایک بوجھ دل پر لئے اٹھا۔

اپنے دوست بلے پہلوان سے کہا۔ چلو، اب مجھے یہاں اور کچھ نہیں جانا۔ میں اٹھا اور اس گندے تالاب کو بڑی ہی حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا جس میں برہنہ حالت میں مرد اور عورتیں نہا رہی تھیں۔ یہ قوم کبھی جہالت کے اس گڑھے سے نکل سکے گی؟

شاید کبھی نہیں۔ میرے دل سے ایک آواز اٹھی۔



لے رہے ہوں۔ دو نسلیں اپنا عہد رنگین کر گئیں اور اس خاک و خون سے لبریز عہد کی دو نشانیاں باقی رہیں جو پریشان اور اپنی تینواؤں کی سر زمین کی تلاش میں ہیں۔ مگر چاروں طرف کہیں بھی نور دکھائی نہیں دیتا۔ طالع آزمائوں نے سارا نقشہ بدل دیا ہے۔ نہ جانے کب ابر کرم برے گا، سبزہ اگے گا، شادابی ہوگی۔

آج بھی جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں تو کئی معصوم سی آوازیں ابھرتی ہیں اور کئی خوشنما چہرے مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہیں جن سے خون رس رہا ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نرم و نازک سرخ سرخ ہونٹوں پر کچھ سوال مچلتے ہیں جن میں گزشتہ 58 سالہ پاکستانی تاریخ کے نشیب و فراز کا حوالہ ہے۔ مگر ان میں 1947ء کے اندوہناک اور کرب انگیز واقعات اور ظلم و ستم سے لبریز حالات کے شام و سحر کی شفق زیادہ نمایاں ہیں۔ ان صداقت و محبت کے پیکروں کی ضیاء بار آور آکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ میرے سامنے اس دور کا ایک ابر آلود اور دھواں دھواں منظر پھیل جاتا ہے جس میں ایک بالچل اور دوڑ دوڑ دھوپ ہے، خوف و ہراس ہے۔

یہ چہرے مجھ سے پوچھتے ہیں۔ ”وہ پاکستان کہاں ہے جس کے لئے ہم نے جان، مال اور عزت قربان کی؟“

نئی نسل کو بتایا ہی نہیں کہ یہ پاکستان ہم نے کتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ ہم نے خود غرضیوں کے محل تعمیر کر لئے اور جھوٹ ہمارا قومی مزاج بن گیا۔ ہم یہاں کی آسائشوں میں ایسے مگن ہوئے کہ اپنا ماضی ہی بھلا بیٹھے۔ یہاں تک کہ نصاب سے تاریخ ہجرت کا موضوع ہی خارج کر دیا۔ اللہ نے ہمیں اختیار اور اقتدار کی نعمت سے نوازا اور ہم اقتدار کے نشے میں اپنے گھر کی سڑک سیدھی رکھنے کے لئے بے دریغ دوسروں کے

الحمد للہ
سبحانہ و تعالیٰ

آئین و قانون تیسری اور پرکٹیکل

آئین بالادست طبقے کو ناجائز اختیارات دیتا ہے جس کی بنا پر وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آئین بناتے وقت بالادست طبقے نے اپنے لئے مراعات زیادہ رکھوالیں۔

☆ کے اچ مجاہد

منطقی:- کیا ہمارا آئین مقدس دستاویز ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی؟

فلسفی:- اصلاً تو مقدس دستاویزات قرآن و حدیث ہیں کچھ لوگ جو آئین کو مقدس دستاویز کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے اور بالادستی قرآن و سنت کو دی گئی ہے۔ یعنی کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے اس میں قرارداد مقاصد ضمیمے کے طور پر اہل ہے اور قادیانیوں کو کافر بھی اسی آئین کے تحت قرار دیا گیا ہے اور ناموس رسالت کا قانون بھی اسی آئین میں ہے لیکن جہاں تک اس پر بات کرنے کا تعلق ہے تو وہ یقیناً ہو سکتی ہے کیونکہ یہ لاکھ متفقہ سہی لیکن ہے تو انسانی کاوش ہی جب احادیث کے مجموعوں تک پر تنقید ہو سکتی ہے بلکہ آج کل تو دہریے، لبرل اور سیکولر لوگ قرآن اور نبی پاک پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تو آئین پر تنقید کیوں نہیں

ہو سکتی لیکن اس کا مقصد آئین توڑ کر ملک میں افراتفری پھیلانا، قادیانیوں کو مسلمان کرنا اور توہین رسالت کے قانون کو ختم کرنا نہ ہو بلکہ صحت مند تنقید ہوتا کہ اس کے نقائص کو دور کیا جاسکے کیونکہ بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ رہی ہے۔

منطقی:- ہمارے آئین و قانون کی بڑی بڑی خامیاں کیا ہیں؟

فلسفی:- سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ یہ اصلاً انگریزوں سے لیا گیا ہے خصوصاً سزاؤں کا زیادہ تر سسٹم اور ملازمتوں کا نظام مکمل طور پر انگریزوں کے نوآبادیاتی دور کا ہے اس کی ایک وجہ تو انگریزوں سے مرعوبیت ہے کیونکہ وہ حاکم تھے اور کامیاب بھی تھے۔ دوسرے جو افسران وہ چھوڑ کے گئے وہ بھی اسی سسٹم کو رائج رکھنا چاہتے تھے کیونکہ اسی میں ان کی بالادستی تھی۔ اگر آئین اسلامی ہوتا تو ان کی اجارہ داری ختم ہو جاتی کیونکہ اسلام غیر فطری مساوات کا بھی قائل نہیں

ہیں جس کو سیٹیٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل کے احتجاج کے باوجود نہیں بھی بدلا جاتا۔ مثلاً عورتوں کو مغرب طرح حقوق دے کر مردوں کی بالادستی کو ختم کیا جا رہے ہیں جس سے معاشرتی اور خانگی نظام درہم برہم ہو رہے ہیں۔

منطقی:- لیکن بنیادی طور پر یہ آئین کا تو نہیں ہمارا تصور ہے۔

فلسفی:- تمہاری بات ایک حد تک درست ہے۔ مکمل طور پر نہیں کیونکہ آئین بالادست طبقے کو ناجائز اختیارات دیتا ہے جس کی بنا پر وہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آئین بناتے وقت بالادست طبقے نے اپنے لئے مراعات زیادہ رکھوالیں یہ حکمرانوں اور بیوروکریسی کی ملی بھگت تھی جس کا فائدہ سب سے زیادہ انہی کو تھا، عوام تو دیے ہی بے خبر تھے جبکہ اسمبلی میں جو تھوڑے سے علما تھے وہ آئین کے تحت ملک کے ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ بننے پر خوش ہو گئے اور دوسری باتوں پر مزاحمت نہیں کی ورنہ حقیقت یہ ہو کہ یہ تو علماء کو دینی طور پر خوش کر کے تائید حاصل کرنے کے لئے ڈرامہ ہی تھا ورنہ جیسے ملک اسلام کے نام پر بنا تھا یہاں اسلامی نظام کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ ڈالنے یا بہانے بازی کا کوئی جواز ہی کب تھا اور نہ ہی اردو زبان کے مکمل طور پر نفاذ میں تاخیر کا کوئی تکیہ تھا لیکن جن مداریوں نے اولین قیادت کے ہتھے ہی نظام کو ہائی جیک کیا انہوں نے ایسے ایسے کرشب دکھائے کہ یہ ناممکن ہو گیا اور ان کا قبضہ وسیع ہوتا گیا۔

آج دیکھیں تو اسمبلی میں سینیٹیں بھی ان کے پاس ہیں، بڑے بڑے آفسر بھی ان کی اولادیں اور رشتے دار ہیں یعنی مقتدر اور انتظامیہ تک میں ان کے لوگ بیٹھے ہیں لہذا جو بھی آیا اس نے ملک کو دونوں ہاتھوں سے لونا فرق صرف اتنا ہے کہ کسی نے کم لونا تو کسی نے

بلکہ صلاحیت اور محنت کی بنیاد پر دوسرے سے زیادہ ترقی اور حصول سے نہیں روکتا لیکن انسانوں میں بہت زیادہ تفریق کا قائل نہیں جیسا کہ ہمارا ملازمتوں کا سسٹم ہے جس میں ہمارے معاشرے کی طرح ہی چار طبقے پائے جاتے ہیں یعنی اعلیٰ، متوسط، زیریں متوسط اور پچلا، جہاں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کی تنخواہوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ حکمرانوں دل کی تنخواہیں لاکھوں میں ہیں اور عوام کی ہزاروں میں جبکہ خلافت راشدہ میں مزدور اور حکام کی تنخواہ ایک تھی۔ پھر حکمرانوں کو ہر چیز سستی اور اکثر چیزیں مفت ملتی ہیں، ٹیکس بھی نہیں دیتے جبکہ عوام کو چیزیں مہنگی ملتی ہیں، ٹیکس بھی ان سے وصول کیا جاتا ہے۔ پھر آئین میں حکمرانوں کو استثنائ حاصل ہے جو خلفائے راشدین میں سے کسی کو حاصل نہ تھا۔

قانون ہے لیکن لاگو صرف غریبوں پر ہوتا ہے حکمران اور اشرافیہ اس سے بالا ہے۔ آئین میں شامل قرارداد مقاصد کے تحت ہمارے ملک میں اسلامی نظام نافذ ہونا تھا جو ہمیں کسی اور سے نہیں لینا تھا بلکہ قرآن و سنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے لیکن بدقسمتی سے اس پر عمل ہم نہیں غیر مسلم کر کے عروج حاصل کر رہے ہیں۔ آئین میں قومی زبان اردو کو قرار دیا گیا ہے لیکن ملک بنے ستر سال ہو گئے۔ ہماری دفتری زبان انگریزی ہی ہے اور آئندہ بھی اردو کے اس کی جگہ لینے کے قریب قریب کوئی چانس نہیں۔

آئین میں 62، 63 شق کے تحت اسمبلی ممبری کے امیدواران کے لئے کڑی شرائط مروج ہیں جن پر عمل ہو تو کوئی کرپٹ، بدکردار لٹیرا یا ظالم اسمبلی میں نہ پہنچ سکے لیکن ہمیشہ وہی پہنچتے ہیں اور قانون سازی بھی کرتے ہیں حالانکہ اکثریت اس قابل نہیں ہوئی اسی لئے قرآن و سنت کے خلاف بھی قانون سازی کر بیٹھے

رحمت للعالمین ﷺ

باباجی نے پوچھا۔ ”متر جی! جانتے ہو رحمت للعالمین کا معنی کیا ہے؟“
 ”آپ ہی بتائیں باباجی!“ میں نے کہا۔
 ”اگر امتی گناہ بھی کریں مگر کوئی بندہ نہ ہے، کوئی خزانہ نہ ہے، زمین نہ پھٹے، آسمان سے پتھر نہ برسیں، خون نہ اترے، آسمانی عذاب نہ آئے، کسی کے گناہ اس کے دروازے پر نہ لکھے جائیں..... متر جی! یہ ہے رحمت للعالمین کا معنی۔“

جواد حیدر۔ تلہ گنگ

زیادہ۔ سرکاری خزانے کو ذاتی مقاصد کے لئے بے دریغ استعمال کیا۔ ملک کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی بجائے ایسے منجئے منصوبے شروع کئے جو ایک غریب ملک کے لئے عیاشی سے کم نہیں یعنی ترقی یافتہ ممالک کی طرح ایک محدود آبادی کی سہولت کے لئے عوامی ٹیکسوں سے اربوں روپے کے پراجیکٹ چل رہے ہیں۔ دوسری طرف ملک کے ہسپتالوں کا حال یہ ہے کہ ایک ایک بیڈ پر تین تین مریض پڑے ہیں اور بعض مریضوں کی باری تین تین یا چھ چھ ماہ بعد آتی ہے اور کتنے ہی لوگ باری آنے سے قبل ہی موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں اور تعلیم کو خدمت بنانے کی بجائے کاروباری طریقے سے چلایا جا رہا ہے۔ جس سے لوگ پرائیویٹ کالینکوں اور سکولوں میں لٹنے پر مجبور ہیں۔

جن ملکوں کی نقالی کی جا رہی ہے وہاں تعلیم اور صحت مفت ہے، ٹیکس مناسب لیا جاتا ہے اور درست خرچ کیا جاتا ہے۔ حکمرانوں کی تنخواہ عوام سے زیادہ نہیں کیونکہ وہ آئین پر عمل کرتے ہیں جو فلاحی ہے۔



غزل

عاصم وہرہ

غم اس کا پیراہن ہے سالوں سے
 کتنا زخمی وطن ہے سالوں سے

کوئی لیڈر تو پارہا ملتا
 دل میں اپنے چھین ہے سالوں سے

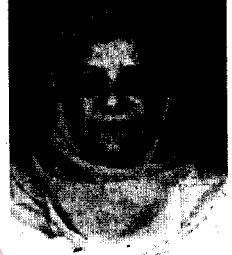
لوٹ لینا دکھا کے سبز باغ
 ان کا شیوہ، چلن ہے سالوں سے

خوف دہشت غبار درد و الم
 ریزہ ریزہ امن ہے سالوں سے

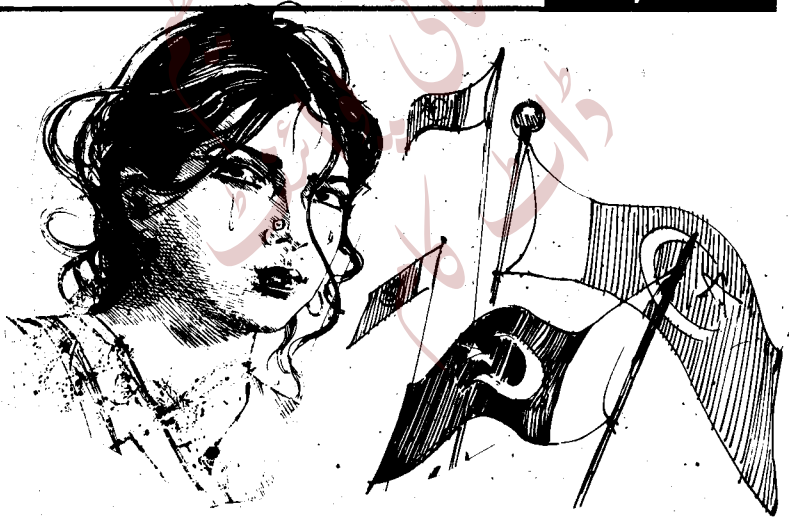
کیوں بہاریں اداس ہیں عاصم
 دل بریدہ خن ہے سالوں سے

آزادی کا وہ چراغ جو ہوشیار پور کی حویلی میں اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھا، پاکستان کے اس چھوٹے سے شہر جہلم ریلوے سٹیشن کی بوسیدہ جمونپڑی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا

آزادی کے چراغ



☆ سیدہ شاہدہ شاہ



چھوٹی دوشیزاؤں کی پاکستان آ کر ان کے ساتھ کیا بنی اور نہ ہی کوئی مؤرخ ان تار تار کنواریوں کی داستان لکھ کر آج کی نسل اور آنے والی پود کو یہ بتا سکے گا کہ اس ہزار ہلائی پرچم تلے آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے پاکستان! جشن آزادی کے طرب انگیز جشن مناتے ہوئے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کو تو یاد کر لیتے ہو۔ ذرا ان مظلوم اور کنواری دوشیزاؤں کو بھی یاد کر لینا جو پاکستان آ کر پاکستان کے رہنے والوں کے ہاتھوں ہی نہ صرف اپنی عصمتوں کے گوہر آبدار، اپنی عزتوں کے ان چھوئے خزانے اٹا بیٹھیں بلکہ ان کو گناہوں کی اس دلدل میں دھکیل دیا گیا جہاں وہ ہر روز جیتی ہیں اور ہر روز مرتی ہیں۔

ہماری یہ کانفرنس چونکہ ملکی سطح کی تھی جس میں مختلف خواتین وزراء، ایم این ایز، ایم پی ایز کے علاوہ سندھ اسمبلی کی ڈپٹی سپیکر شیلارضا صاحبہ بھی شامل تھیں۔ اس لئے میرا اس کانفرنس سے ٹکنا مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال جہلم کے ایم ایس صاحب کو میرے ریفرنس سے ملیں اور مریض کی کہانی نہ صرف سن لیں بلکہ ضروری پوائنٹس بھی نوٹ کر لیں، میں فارغ ہو کر اس کی کہانی لکھ لوں گی۔

ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جب میں کہیں مصروف ہوتی ہوں تو میرے شوہر متاثرہ یا مطلوبہ جگہ پر جا کر کہانی کے پوائنٹس نوٹ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کہانی بھی لکھ لاتے ہیں اور میں اس کو کہانی کی شکل میں لکھ لیتی ہوں۔ ”خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے“ کے مصداق میرے شوہر بھی میرے ساتھ ساتھ رہ کر ”نیم رائٹر“ بن گئے ہیں۔

میرے شوہر اسی روز جا کر ایم ایس صاحب کی وساطت سے اس مریض سے ملے۔ اس کی کہانی سنی اور ضروری پوائنٹس نوٹ کئے اور جب میں پانچ روزہ میٹشل

اس کہانی کے راوی طارق محمود کا پچھلے دنوں ہی انتقال ہوا ہے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں ہی یہ کہانی لکھی جائے مگر میں اپنی سرکاری و غیر سرکاری مصروفیات کی بنا پر یہ کہانی بروقت نہ لکھ پائی۔ ان دنوں بھی میں میٹشل کانفرنس آف ویمن لیڈر کے سلسلے میں اسلام آباد تھی جب میرے شوہر نے بتایا کہ سول ہسپتال کے ایم ایس صاحب کانفرنس آیا ہے کہ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں کوئی جاں بلب مریض اپنی زندگی کی داستان لکھوانا چاہتا ہے۔ چونکہ اس مریض کی زندگی کا چراغ کسی بھی لمحے گل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کی یہ خواہش ہے کہ یہ کہانی اس کی زندگی میں ہی لکھی جائے اور کسی اعلیٰ معیاری رسالے میں شائع ہو جائے تاکہ ہماری موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ ادراک ہو جائے کہ پاکستان کی تخلیق میں ان گنت جواں مردوں، بوڑھوں بچوں کا ہی صرف ہونے نہیں بلکہ تخلیق پاکستان کے اعلان اور پھر پاکستان کی جانب ہجرت کرنے والی لا تعداد عورتوں، دوشیزاؤں اور کنواریوں نے بھی اپنی عصمتوں، اپنی عزتوں کا کلبو بہایا ہے۔

ان میں سے کئی ایسی گناہ کنواریاں بھی تھیں جو غیر مسلم درندوں سے تو اپنے گوہر آبدار بچا لائیں مگر پاکستان میں بسنے والے اپنے ہی کلمہ کو مسلمانوں نے ان سے ان کی عزتوں، ان کی عصمتوں کے گراں بار موتی چھین کر ان کو ذلت و رسوائیوں کے ان اندھیاروں میں پھینک دیا جہاں وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ اپنی منزلوں کے نشانات ڈھونڈتی رہتی ہیں اور یہ تلاش ایک روز انہیں موت کی لامحدود دستوں میں یوں چھپا دے گی جہاں ان کے جسدِ خاکی کے ساتھ ساتھ ان کی کہانیاں بھی ان کے ساتھ ہی لمحہ کی تاریک گہرائیوں میں دفن ہو جائیں گی اور کوئی بھی نہ جان پائے گا کہ پاکستان کی ان ان

تند دیا کے ریلے کی طرح گھر سے باہر نکلنے کا راستہ بنا لیتا۔ تنگ آ کر انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ ویسے بھی ابھی تک انہیں امیری منی سرگرمیوں جیسی کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ملی تھی۔ اس لئے وہ میرے اس پہلو سے بالکل مطمئن تھے۔

ایک روز میں ریلوے سٹیشن جہلم پر ایک ٹی سٹال کے سامنے لگے ریلوے بیچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا، اچانک ایک تزاخ کی آواز گونجی میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک جواں سالہ بھکارن ایک خوش لباس لڑکے کو شعلہ بار نظروں سے گھور رہی تھی اور وہ لڑکا گال پر ہاتھ رکھے قہر بار نظروں سے اس بھکارن کو گھور رہا تھا۔ اسے غالباً بھکارن سے اس تھپڑ کی امید نہ تھی۔ اس لئے اس کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ قدرے حیرانی بھی تھی۔ یہ کیفیت چند لمحے رہی اور پھر اس لڑکے نے اس تھپڑ کا بدلہ لینے کے لئے دانت کچپکا کر آگے بڑھنا ہی چاہا تھا کہ میں نے تیزی سے چائے کی پیالی زمین پر رکھی اور آگے بڑھ کر اس لڑکے کو پڑا لیا۔ اچھا خاصا مجمع جمع ہو گیا تھا۔ کسی کے استفسار پر اس بھکارن نے بڑی نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے بتایا کہ اس کے بھیک مانگنے پر اس لڑکے نے انتہائی فحش انداز میں اپنا گندہ اور شیطانی مطالبہ دہرایا تھا۔

ایسے تماشے ہر روز ہر گلی، ہر کوچے میں روزانہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد تمام تماشا شائق بھی اس ڈرامے کا مصداق بن گئے۔ اس کے بعد اپنی اپنی مختلف قسم کی آراء دیتے ہوئے چل دیئے۔ بھکارن بھی غصے سے تن تنہا اپنی راہ لگ گئی۔ میں نے واپس آ کر چائے ختم کی اور ٹی سٹال والے کو جب میں بل دے رہا تھا تو وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔

”بابو جی! بڑی اکھڑ اور اتھری ہے یہ بھکارن۔ حالانکہ ان کا پیشہ یہی ہے۔ یہ لوگ بھیک کی آڑ میں سارا

کانفرنس سے واپس آئی تو تمام تر جزئیات کے ساتھ مجھے وہ کہانی سنا دی جسے میں اسی مریض (جواب فوت ہو چکا ہے) کی زبانی آپ کو سنارہی ہوں۔

میرا نام طارق محمود ہے اور جہلم شہر کے متول گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریلوے سٹیشن جہلم کے قریب ان گنت جھگیاں آباد تھیں جن میں بھکاری عورتیں اور مرد، جہلم شہر کے شاندار چوک، پرانا جی ٹی ایس چوک اور دیگر بارونق جگہوں پر رنگین عینکوں کے سٹال اور شوکیس لگانے والی عورتیں اور دیگر قماش کی جرائم پیشہ عورتیں اور مرد رہتے تھے۔ ان تمام عورتوں کے مرد تو سارا سارا دن جھگیوں میں بیٹھے مختلف نشوں میں دھت جوا وغیرہ کھیتے اور گالیاں بکتے رہتے مگر ان کی عورتیں، لڑکیاں اور چھوٹے چھوٹے ننک دھڑنگ بچے جہلم شہر کے ہر گلی، ہر کوچے میں بھیک مانگتے پھرتے، چوری چکاری کرتے اور جواں لڑکیاں اور عورتیں بظاہر تو عینکوں کے سٹال لگاتیں، بھیک مانگتیں مگر در پردہ چوری چکاری اور عصمت فروشی کے دھندے میں ملوث ہوتیں۔

میں اپنی لاابالی طبیعت اور فطرتی تنہائی کی وجہ سے اکثر جہلم شہر کی دیران جگہوں ریلوے سٹیشن، جوہلی گھاٹ، مسجد افغاناں، پیر سلیمان پارس اور دریاے جہلم کی طرف نکل جاتا اور کسی بھگی ہوئی روح کی طرح تنہا بھٹکتا رہتا۔ جب تھک جاتا تو دریاے جہلم کے کنارے بنی ہوئی مسجد افغاناں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دریاے جہلم کے شہدے ٹھار پانی میں پاؤں لٹکائے پہروں بیٹھا رہتا۔ گھر والے میرے اس انجانے اضطراب اور نامعلوم بے قراری سے اذہد پریشان تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھ پر پابندیاں عائد کر کے اس انجانے اضطراب و بے قراریوں کا مداوا کرنے کی کوشش کی مگر میں ہزار پابندیوں کے باوجود ایک تیز

جیسے کسی قسم کا خطرہ پا کر وہ بھرپور دفاع کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

ہمارے درمیان چند لمحے خاموشی طاری رہی۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“ تھوڑی دیر بعد میں نے اس سے پوچھا اس کے چہرے پر کچھ تلخی پر چھائیاں لہرائیں۔ پھر بولی۔

”ماں نے تو میرا نام نہ جانے کیا رکھا ہو گا مگر سارے مجھے رانو کہہ کر بلاتے ہیں۔ ویسے بھی ہم جیسے لوگ جنہیں ہر کوئی لوٹ کا مال سمجھتا ہے، ان کے کوئی نام نہیں ہوتے۔ جس نے چاہا، جیسا چاہا اپنی مرضی سے نام رکھ لیا۔ نام تو ایوانوں اور شہستانوں میں رہنے والوں کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نام اور نسب ان کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔ ہم جھگیوں والیاں بے نشان، بے نسب ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے آپ بھی اپنی مرضی کا نام رکھ لیجئے۔“

اس جوان سالہ بھکارن کے لہجے میں بے تحاشا تلخی تھی۔ باتوں میں زہریلی کڑواہٹ تھی۔ وہ کسی پہلو سے بھی اجڈ، گنوار اور آن پڑھ نہیں لگتی تھی۔ اس کی باتوں میں عمیق ترین سمندروں کی گہرائی تھی۔ سچائی کی حد تک کھرا پن تھا۔

”میں تمہیں رانو ہی کہوں گا۔“ میں نے اس سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ اس تمہاری باتیں، تمہارا لہجہ، تمہارا رکھ رکھاؤ کسی پہلو سے یہ ثابت نہیں کرتا کہ تمہاری رگوں میں کسی اجڈ بھکاری کا خون دوڑ رہا ہے اور نہ ہی تم کسی صورت میں اس ماں کی آغوش کی پروردہ لگتی ہو جس کی گود میں تمہارے جیسے قبیل کی پیشہ ور بھکاریں آنکھ کھولتی اور پرورش پاتی ہیں۔“

”کون کہتا ہے کہ میری ماں پیشہ ور بھکارن ہے اور میری رگوں میں کسی نشئی بھکاری کا خون دوڑ رہا ہے۔ کیا آپ یا آپ کا یہ معاشرہ کبھی تسلیم کرے گا کہ میں

دن اپنے شکاری تلاش میں پھرتے رہتے ہیں مگر یہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ بھیک مانگتی ضرور ہے مگر آج تک اس نے کسی کو بھی اپنے بدن کو چھونے نہیں دیا۔“

میرے دل میں نہ جانے کیوں اس کے لئے بے پناہ عزت بڑھ گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس سے ملوں، اس سے پوچھوں تو سہی کہ اگر وہ اپنے اس ماحول سے خوش نہیں ہے تو اس ماحول کو چھوڑ کر کوئی باعزت پیشہ کیوں نہیں اپناتی۔ مثلاً کسی گھرانے میں کام کاج، کوئی دکانداری (عینکوں کا شوکیس جیسے اس جیسی عورتیں لگاتی تھیں) یا کوئی اور باعزت کام وغیرہ۔ میں نے جب یہی بات لی سال والے سے کی تو بولا۔

”بابو جی! ہو سکتا ہے اسے یہ مشورہ کسی نے دیا ہی نہ ہو۔ بہر حال اگر آپ مناسب سمجھیں تو کیا میں اس کو آپ سے ملوادوں تاکہ آپ اس سے بات کر لیں؟“

قدرے تذبذب کے بعد میں نے اسے دوسرے دن دس بجے کا ٹائم دے دیا اور وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر وہ شیشن پر میری منتظر تھی۔ غالباً چائے والے نے اس سے بات کر لی تھی۔

اس لئے وہ وہاں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کے چہرے پر بظاہر سکون تھا مگر آنکھوں میں کسی وحشت زدہ ہرئی کی طرح خوف تھا۔ جیسے اسے انسانوں کے اس جنگل میں مردوں جیسے درندوں سے کوئی خوف، کوئی خطرہ ہو۔ میں نے چائے والے سے اپنے اور اس کے لئے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے قریبی بیچ کی طرف اشارہ کیا تاکہ سکون اور تفصیل سے بات کی جاسکے۔ اس کی آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی جیسے اس کو مجھ سے کوئی خطرہ ہو۔ پھر قدرے تذبذب کے بعد وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آ کر مجھ سے قدرے فاصلہ رکھ کر بیچ پر بیٹھ گئی مگر اس قدر چوکے انداز میں کہ

پاکستان سے اپنی بیزاری اور لائقیت کا اظہار کر کے اپنا سب کچھ بچا سکتے تھے۔ مگر پاکستان سے محبت تو ان کی رگ رگ میں رچی بسی ہوئی تھی۔ سرزمین پاکستان کو اپنے دین ایمان کی طرح عزیز سمجھ کر انہوں نے اپنا سب کچھ یوں ہی چھوڑا اور ایک روز ایک قافلے کے ساتھ جو پاکستان کی طرف آ رہا تھا۔ اس میں شامل ہو گئے۔ اپنی کروڑوں کی جائداد، اپنی حویلیاں، اپنی زمینیں، اپنے گھربار، اپنے مال مویشی، اپنا سب کچھ اس دھرتی کی خاطر چھوڑا اور جو کچھ نقدی یا زیور تھا، ساتھ لیا اور چل پڑے۔

میں زیادہ تفصیل میں جا کر آپ کو بور نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اتنا ضرور بتا دیتی ہوں کہ جب میری ماں اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کی طرف محو سفر ہوئی تو خاندان کے تقریباً ایک سو مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے مگر لاہور والٹن کیمپ تک جو اس وقت پناہ گزینوں کی جائے پناہ تھا۔ صرف میری ماں ہی اکیلی زندہ اور خوفزدہ سی پہنچی پائی۔ میری ماں کے تمام عزیز واقارب ہجرت کرنے والے قافلے پر مختلف اوقات میں مختلف ہونے والے حملوں میں شہید ہو گئے اور میری ماں جس کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال تھی، وہ لٹے پٹے قافلے کے ساتھ زندہ سلامت پہنچی گئی۔

اب یہاں سے میری لاوارث ماں کی بربادی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس سے بہتر تھا کہ میری ماں کافروں کے دہس سے اس وطن کی محبت کا جرم کرتے ہوئے وہاں سے ہجرت ہی نہ کرتی۔ کئی سال تک میری ماں کیمپ میں اور بعد میں کیمپ کے مختلف عہدیداروں کے گھروں میں رہی۔ ایک لاوارث اور کئی ہونٹ پتنگ جیسی عورت یا لڑکی کا جو حال ہوا کرتا ہے وہی حال میری ماں کا بھی ہوا۔ ناز و نعم اور لاکھوں میں کھینے والی ماں جس کے گھر میں نوکروں چاکروں کی ایک فوج ظفر و جھنڈ تھی،

اس عظیم ماں کی بیٹی ہوں جس نے اپنے درجنوں خون کے رشتے آپ کے اس پاکستان پر قربان کر دیئے؟ کیا کوئی مانے گا کہ اس پاک دھرتی کی طرف ہجرت کرتے ہوئے میری ماں، میرے آباؤ اجداد نے اس وقت کی لاکھوں کروڑوں کی جائداد تیاگ دی؟ کیا کوئی تسلیم کرے گا کہ میری ماں لہو کا دریا عبور کر کے اس وطن عزیز میں پناہ لینے آ گئی اور آپ سمیت تو شاید کسی کو یہ بھی پتہ نہیں ہو گا کہ میری رگوں میں آپ جیسے اس شریف باپ کا سرخ سرخ لہو زندگی بن کر دوڑ رہا ہے جس نے میری پناہ گزین ماں کو مستقبل کے سنہرے خواب دکھا کر ایک پاکیزہ زندگی کے سبز باغ دکھا کر میری ماں سے اس کی عصمت کا وہ گوہر ابدار لوٹ لیا جو ایک عورت کا گراں بار سرمایہ ہوا کرتی ہے اور جس کی خاطر عورتیں ہنسی خوشی اپنی جان ہار جایا کرتی ہیں اور جسے میری ماں دیار غیر کے غیر مسلموں سے اپنے ماں باپ اپنے آباؤ اجداد کی قربانیوں کے عوض بچا کر لائی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں بھل بھل آنسو بہ رہے تھے اور میں جیسے پتھر کا بن چکا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ ایک نوجوان بھکانا کو میرے پاس بیٹھے دیکھ کر اور سب سے بڑھ کر اسے روتے دیکھ کر ارد گرد گزرتے ہوئے لوگ بڑی حیرت اور بڑی عجب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”میری ماں ضلع ہوشیارپور (بھارت) کی رہنے والی تھیں۔“ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ”پاکستان کے قیام کے جرم میں جب وہاں کے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی گئی تو میری ماں کے آباؤ اجداد نے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح وہاں سے ہجرت کرنے کی ٹھانی۔ حالانکہ وہاں ان کی اس زمانے میں کروڑوں کی جائداد تھی۔ حویلیاں اور مکان تھے، زمینیں، مال مویشی غرضیکہ سب کچھ تھا۔ وہ چاہتے تو دیگر مسلمانوں کی طرح ”کچھ لو، کچھ دو“ کی پالیسی اپنا کر اور

کو کمزور بنا ڈالا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عورت کی طرح میری ماں کا بھی یہ پینا ہو کہ اس کا اپنا گھر ہو، اس گھر میں اس کا شوہر ہو، بچے ہوں اور وہ اس گھر کی مطلق العنان ملکہ ہو۔ جہاں اس کا اپنا راج ہو، اپنے شوہر کے دل کے سنگھان پر صرف اور صرف وہی براجمان ہو۔ شاید یہی وہ فطرتی، وہ خواب تھے جنہوں نے ماں کو اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہو۔

لاہور پہنچ کر کمال پاشا نے میری ماں کو ایک کرائے کے مکان میں رکھا۔ دو تین روز اس نے میری ماں کو خوب سبز باغ دکھائے۔ مستقبل کے سہانے خواب میری ماں کی پگلوں پر سجائے اور ایک روز اپنی اصلیت پر اتر آیا مگر میری ماں نے بڑی منتوں سے ڈرتے ڈرتے، روتے روتے اسے روکنے کی کوشش کی، وہ نہ مانا تو میری ماں نے بڑی سختی سے اور بڑے مستحکم لہجے میں اسے کہا کہ شادی سے پہلے وہ مرنے لگی۔ وہ مرنے لگی اور کچھ دنوں نہیں آنے دے گی۔ وقتی طور پر وہ ٹل گیا اور کچھ دنوں کے بعد اس نے میری ماں کو نشہ پلا کر زبردستی بے آبرو کر ڈالا۔ باوجود نشے کے میری ماں نے بھرپور مزاحمت کی مگر وہ ہار گئی۔ وہ روتی رہی، چلائی رہی، واسطے دیتی رہی مگر وہ شیطان بہرہ ہو چکا تھا۔

یوں وہ عزت جسے دیا بغیر سے، غیر مسلموں کی دھرتی سے کافروں کے ملک سے بچا کر لائی تھی، عصمت کے اس گوہر آبدار کو اس پاک سرزمین کے ایک نام نہاد مسلمان نے لوٹ لیا اور وہ روتی روتی نہ جانے کب نیند اور مدہوشی کے عالم میں سو گئی۔ اس کے بعد میری ماں ہر روز شادی کے اس وعدے پر کہ ”ہم عنقریب شادی کر لیں گے“ دن رات لٹنے لگی مگر وہ دن کبھی نہ آیا اور تقریباً ایک سال بعد جب میں اپنی ماں کی کوکھ میں آئی اور میری ماں نے میرے ناجائز باپ کو متشکر انداز میں بتاتے ہوئے شادی پر زور دیا تو اس شیطان نے بڑے

اب وہ خود ایک ملازم تھی۔ میری ماں کے گھر میں ملازم پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے، اچھی خاصی اور معقول تنخواہیں ملا کرتی تھیں مگر میری ماں دن بھر کلوہو کے تیل کی طرح کام کاج کرتی، بچا کچھا کھانا اس کا نصیب ہوتا اور علی الصبح سے رات گئے تک تمام کام کاج میری ماں بغیر کسی معاوضے، بغیر کسی تنخواہ کے کرتی رہی۔ محض اس لئے کہ اس گھر میں اس کی عزت محفوظ تھی۔

پھر اس گھر میں آئے ہوئے کسی بگڑے ہوئے امیر زادے مہمان کی نظر میری ماں کی جوانی پر پڑ گئی۔ میری ماں جیسی لاوارث اور سب سے بڑھ کر یوں سستی قسم کی گھریلو ملازمت کوئی ہوئی پنک کی طرح وہ لوٹ کا مال ہوا کرتی ہیں جنہیں آقا، غلام، چھوٹا، بڑا غرضیکہ ہر ایریا غیرالوٹ لینا چاہتا ہے۔ میری ماں کے پاس سوائے عزت کے اور بچا ہی کیا تھا۔ چنانچہ اس گھر آئے امیر زادے مہمان نے جب موقع دیکھ کر میری ماں کو درغلانہ چاہا تو میری ماں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ ان شہیدوں کے خاندان کی واحد وارث ہے جس نے اس پاک سرزمین کے لئے اپنی جانیں، اپنے گھریلو، اپنا جاہ و شہمت اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ جان تو دے سکتی ہے مگر بیسوائی کی زندگی کبھی بھی نہیں گزارے گی۔

سیدھی انگلیوں سے کبھی نہ نکلتے دیکھ کر اس امیر زادے جس کا نام ماں نے کمال پاشا بتایا تھا، اس نے انتہائی گھٹیا چال چلی اور میری ماں کو جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ محنت اور مشقت کی چکی میں پسے والی میری ماں اس جال کو نہ سمجھ پائی اور ایک رات جبکہ ساری کائنات خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی، میری ماں آنکھوں میں سنہرے خوابوں کی دنیا سجائے کمال پاشا کے سنگ لاہور کی طرف جوسفر تھی۔ شاید سالہا سال کی محنت و مشقت، بھری پُری دنیا میں تنہا رہ جانے کے خوف اور تیزی سے دھلتی ہوئی عمر کے خوف نے ماں

سینے کے قطرے موتوں کی طرح چک رہے تھے اور انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان کے چہرے پر بکھرے ہوئے اطمینان سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے زندگی بھر مصائب کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کوئی آبلہ پا مسافر تھک ہار کر کسی گھنیرے سایہ دار درخت تلے آرام کرنے لیٹ گیا ہو۔

مائیں کتنی عظیم ہوتی ہیں، یہ میں نے سنا ہوا ضرور تھا مگر میری ماں کتنی عظیم، کتنی بہادر تھی کہ ساری زندگی درد و الم کے تپتے ہوئے صحرا میں مصائب سے چوکھی لڑائی لڑتی رہی مگر مجھے ہر غم، ہر دکھ، ہر پریشانی سے بچائے رکھا۔ اپنی عصمت کے گوہر نایاب کو اپنی مرضی سے نہ کسی پیار کے دھوکے سے لٹائی بھی مگر مجھے زمانے کی ہر میلی نگاہ، ہر گرسنہ آنکھ، ہر سفلی جذبوں سے بچائے رکھا۔ میری ماں اس لئے بھی عظیم تھی کہ وہ آزادی کے قافلے کی وہ مسافر تھی جس نے اس دھرتی کے لئے اپنے لہو کے رشتے، اپنی جائداد، اپنے گھر بار لٹا دیئے تھے۔ میں نے بڑی عقیدت سے ماں کے تحیف و نزار پاؤں کو بوسہ دیا اور اپنے میلے دوپٹے سے ان کے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگی۔

ماں نے آنکھیں کھولیں، نقاہت بھرے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی رات، ہاں اسی رات سیاہ کالی رات کے سینے میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ گویا کسی کا فرض خاکستر کر دینے کے درپے ہیں۔ بادلوں کی گرج دھرتی کا سینہ دہلائے دے رہی تھی۔ آسمان سے چھا جوں پانی ٹوٹ کر برس رہا تھا، ہماری بوسیدہ سی جھوپڑی جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی، لائین کی مدھم اور لرزتی ہوئی روشنی جھوپڑی کے ماحول کو آسیب زدہ بنائے دے رہی تھی کہ اچانک ماں نے نقاہت بھری آواز میں پکارا۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ سرگوشی سی سنائی دیتی تھی مگر میں نے فوراً ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول

اطمینان سے ابارش کا مشورہ دے ڈالا۔ میری ماں رورو کر شادی کے لئے اصرار کرتی رہی مگر وہ برابر مالتا رہا۔ رسوائیوں کے غفریت سے گھبرا کر جب میری ماں ابارش کے سلسلے میں لیڈی ڈاکٹر سے ملی تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ وقت اتنا زیادہ بیت گیا ہے کہ اب ابارش ممکن ہی نہیں رہا کیونکہ جان کا خطرہ ہے۔ واپس آ کر میری ماں نے جب کمال پاشا کو بتایا تو وہ بغیر کچھ کہے خاموشی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی بھی لوٹ کر میری ماں کے پاس ہی آیا۔

میری ماں نے ذلت و رسوائیوں سے بھرپور زندگی کا کیسے مقابلہ کیا، مجھے کیسے جنم دیا، لوگوں سے اس گناہ کو کس طرح چھپایا، لاہور کے اس کرائے کے گھر کو چھوڑنے کے بعد کہاں کہاں دھکے کھائے، اس کے بارے میں میری ماں نے مجھے کبھی بھی کچھ نہ بتایا۔ اس نے تو یہ بھی مجھے نہ بتایا کہ وہ ان بھکاریوں کے گروہ میں کیسے شامل ہو گئی۔ نہ ہی اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے کس طرح میری پرورش کی۔ مگر اس ابولہان زندگی اور کافروں بھرے جیون نے میری ماں کو کینسر کے ردگ میں مبتلا کر ڈالا اور ایک روز جب میری عمر سات آٹھ سال تھی اور ماں کی طبیعت مناسب علاج اور دیکھ بھال نہ ہونے سے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ زخم زخم زندگی نے انہیں موت کی منزل کا راستہ بنا ڈالا تھا۔ ماں نے مجھے اپنے پاس بلایا، لرزتے ہوئے تحیف و نزار ہاتھوں سے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور اٹکتے اٹکتے، رکتے رکتے، پھولی پھولی سانسوں سے اپنی ساری داستان سنا دی۔ اس نے اپنی زندگی کا کوئی بھی پہلو مجھ سے نہ چھپایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سرسوں رنگت والے چہرے پر ایک اطمینان سا چھا گیا تھا۔ گویا زندگی کا وہ عذاب جس کے بوجھ تلے ان کی روح پگھل چکی جا رہی تھی، مجھے سنا دینے سے ہلکا ہو گیا تھا۔ ان کی پیشانی پر کمزوری کے باعث

میں مست۔ جشن آزادی منارہے تھے۔ پیشہ درمورتوں کے نگاہ آلود جیسوں سے اپنے آپ کو آسودہ کر رہے تھے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی ہوگی کہ آزادی کے وہ چراغ، آزادی کے وہ دیپ جو آج ان کے محلات میں روشن ہیں، ان چراغوں میں تیل کی بجائے اپنا لہو جلانے والے خاندان کی وارث انتہائی کمپری کی حالت میں ایک بوسیدہ جمپونڈی میں اپنی زندگی مار چکی ہے۔ رانو اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو چکی تھی۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا اگر رانو نے کسی مجڑے ہوئے انسان کے منہ پر تھپڑ مارا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ یقیناً اس کی رنگوں میں اس کی اس غیر متنبہ مجاہدہ مال کا بھی لہو غیرت بن کر دوڑ رہا تھا جو آزادی کے قافلے کی سرخیل تھی۔

میں نے تو یہ سوچا تھا کہ رانو کو کسی باعزت پیشے کی طرف راغب کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ وہ عزت سے روٹی کما سکے مگر اس کی کہانی سن کر میں نے کوئی اور فیصلہ کر لیا۔ اس کو ہمیشہ ہمیش کے لئے باعزت نظر آئے۔ اس سے اپنانے کا فیصلہ، اس سے شادی کر۔ نہ کا عزم ہمیں۔ میں چونکہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا انہوں نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ اسی برے پر، اسی بھروسے پر، اسی مان پر میں نے رانو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”رانو! تمہارا باپ کون تھا، میں کبھی بھی تم سے نہیں پوچھوں گا۔ تم کسی کی بیٹی ہو، یہ سوال میرے لبوں پر کبھی نہیں آئے گا۔ میں ہر اس سوال کا گلا گھونٹ دوں گا جو تمہارے باپ کے متعلق اٹھے گا۔ ہاں تمہاری ماں کے متعلق اٹھنے والے ہر سوال کا میں بڑے فخر سے جواب دیا کروں گا کہ تم پاکستان کی خاطر جان ہار جانے والے خاندان کی اس عورت کی بیٹی ہو جس کی قربانی سے آج پاکستان کی آزادی کے چراغ روشن ہیں۔ تمہاری ماں کو

”بیٹی!“ ماں نے میرا ہاتھ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھاما اور رقت آمیز لہجے میں بولیں۔ ”اپنی مجبور ماں کو معاف کر دینا کہ تیرے لئے، تیری حفاظت کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ کچھ مردوں کے اس معاشرے میں عورت انتہائی کمزور ہے خاص کر مجھ جیسی لاوارث عورتیں تو لوٹ کا وہ مال ہوا کرتی ہیں جسے جوان، بوڑھا، امیر، غریب ہر کوئی لوٹ لینا چاہتا ہے۔ ایک عورت کے پاس سب سے قیمتی سرمایہ اس کی عصمت ہوا کرتی ہے۔ طبیعت بھی اپنی عصمت پر حرف نہ آنے دینا۔ ہاں اگر کوئی شخص سادھی مل جائے تو گناہ کی اس زندگی سے نکل جانا اور اس سے شادی کر لینا۔“ اس کے ساتھ ہی ماں کو ایک بھگی آئی اور میری طرف بڑی حسرت سے دیکھتے ہوئے اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ آزادی کا وہ چراغ جو ہوشیار پور کی حویلی میں اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھا، پاکستان کے اس چھوٹے سے شہر جہلم ریلوے سٹیشن کی بوسیدہ جمپونڈی میں ہمیشہ ہمیش کے لئے بجھ گیا اور اتفاق دیکھو کہ جس روز میری ماں سفر آخرت کے لئے روانہ ہوئی اس روز بھی یوم آزادی یعنی 14 اگست کی رات تھی۔ 14 اگست 1947ء کو ہندوستان کی سرزمین سے روشن دیپ آگ و خون کے دریا عبور کر کے پاکستان کے شہر لاہور کے والٹن کمپ میں پہنچا اور پھر 14 اگست کی رات کو ہی جبکہ موسلا دھار بارش اپنے زوروں پر تھی اس کے باوجود لوگ جشن آزادی پورے جوش و جذبے سے منا رہے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے گھر، ہر بلڈنگ کو رنگین روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ سبز ہلالی پرچموں اور جھنڈیوں سے ہر گھر کو آراستہ کیا گیا تھا۔ قوم کے غم میں دن رات گھلنے والے یہ نام نہاد سیاستدان، بیوروکریٹ، لیڈر حضرات بڑے بڑے ہٹوں، اونچے اونچے ایوانوں میں شراب و کباب

فیصلہ کن اور دو ٹوک لہجے میں بولے۔ ”بس اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“ اتنا کہہ کر ابو کمرے سے باہر نکل گئے۔

میں لاکھ ماں باپ کا اکھوتا اور لاڈلا سی مگر ابھی اتنا خود سر نہیں ہوا تھا کہ اپنی خوشیوں، اپنے ارمانوں پر اپنے ماں باپ کو قربان کر دوں۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے ماں باپ کو ہر صورت میں راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس لئے کہ ماں باپ تو وہ عطیہ خداوندی ہیں جن کی رضا میں راضی ہونا بھی ثواب کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں راضی کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مجھے سب سے بڑا دھڑکا یہ لگا ہوا تھا کہ رانو اگلے دن وقت مقررہ پر آئی ہوگی۔ اس نے میرا انتظار بھی کیا ہوگا۔ پھر وہ یہ سوچ کر مایوس ہو گئی کہ تمام مرد اسی طرح جھوٹے اور بے وفا ہوتے ہیں۔ صنف نازج کا دل جیتنے کے لئے آسمان سے تارے توڑ لانے کے وعدے کرتے ہیں۔ فرہاد بن کر جوئے شیر لانے کے قول و قرار کرتے ہیں اور پھر جب جذبات کا ریل گزر جاتا ہے تو یوں اٹھنی بن جاتے ہیں جیسے جانتے تک نہیں۔ جب کہ میں والدین کی رضامندی کی سند لے کر ہی رانو سے ملاقات کر کے اسے یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا تقریباً ایک ماہ اسی کشکاش میں گزر گیا۔ امی تو نیم رضامند ہو گئی تھیں تاہم ابو ابھی تک اپنے فیصلے پر ڈٹ ہوئے تھے۔

میں نے سوچا چلو ریلوے سٹیشن جا کر رانو کو ساری صورت حال بتا کر اسے کہوں گا کہ وہ میرا انتظار کرے۔ میں ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے والدین کو راضی کر لوں گا۔ چنانچہ میں دوسرے روز دس بجے کے قریب من میں ارمانوں اور خوشیوں کے پھول کھلانے جب ریلوے سٹیشن پہنچ کر جھکیوں کی طرف گیا تو دل مٹھی میں آ گیا۔ پھنے پرانے چیتھرے اور ٹوٹی پھوٹی اینٹیں یہ ظاہر کر رہی

ایک بدقماش نے شادی کے وعدے پر لوٹا تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم سے اب اس وقت ملاقات کروں گا جب گھر والوں سے تمہارے ساتھ شادی کا وعدہ لے کر اٹھوں گا۔ تم میرا کل اسی وقت، اسی جگہ انتظار کرنا۔ یہ کہہ کر میں تیزی سے اٹھا چائے والے کو ایک بڑا نوٹ دے کر بغیر ہتھاپیے لئے تیزی سے گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ دیکھ بصر کر رانو میرے اس فیصلے پر غیر یقینی انداز میں ہلکتی بنی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میزے لہجے میں یقیناً اتنی ٹھوس اور اٹل سچائی تھی کہ رانو نے شاید میری بات کا یقین کر لیا تھا۔

مگر وہ کل کبھی بھی نہ آئی۔ ہم مادی طور پر کتنے ہی ترقی کیوں نہ کر لیں، کتنی ہی روشن خیال کیوں نہ ہو جائیں، شادی بیاہ کے معاملے میں ابھی تک رسم و رواج کے قیدی ہیں۔ ذات پات، برادری غیر برادری، حسب نسب یہ وہ خون آشام عفریت ہیں جو ہماری خوشیوں کی شرک سے لہو پی لیا کرتے ہیں۔ خون چوس لیتے ہیں۔ میں نے بھی گھر آ کر رانو کی تمام کہانی سنا کر جب اس سے شادی کا عزم ظاہر کیا تو ابو کا خاندانی اور راجپوتی خون جوش میں آ گیا۔

”برخوردار!“ ابو جانے پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کی سی خشکی اور سرد لہجے میں کہا۔ ”تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ایک راجپوت کا بیٹا تمہیں اس لڑکی سے شادی کے لئے اجازت دے دے گا جس کے باپ، جس کے حسب نسب کا پتہ تک نہیں۔“

”ابو! وہ اس ماں کی بیٹی ہے جس کے آباؤ اجداد نے ہمارے اس پاکستان کے لئے قربانی دی ہے۔ جس کی فضاؤں میں آج ہم آزادی کا سانس لے رہے ہیں۔ کیا یہ حسب نسب کا فی نہیں؟“ میں نے ابو کو دھیمے لہجے میں جواب دیا اور ابھی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا اور

پناہ ڈھونڈ لی۔ ابو کو شاید اپنے سخت رویے کا احساس ہو چلا تھا۔ انہوں نے مجھے پیار سے سمجھانا بھانا چاہا۔ امی نے رو رو کر واسطے دیئے مگر میں اب نشے کی دنیا میں اتنی دور نکل آیا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہ رہی۔ نشے کی کثرت نے مجھے اندرونی طور پر کھوکھلا کر دیا۔ ابو میری حالت دیکھ کر تڑپ اٹھے انہوں نے مجھے ملک بھر کے ڈاکٹروں کو چیک کروایا مگر سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ میرے لئے اب دعا ہی کی جاسکتی ہے، دوا اب کارگر نہیں ہوگی۔

مگر والدین تو والدین ہوتے ہیں۔ میرے والدین کو اب بھی امید ہے کہ کوئی ایسا معجزہ زندہ ہوگا کہ میں پہلے کی طرح پھر چنگا بھلا اور صحت مند ہو جاؤں گا مگر میں جانتا ہوں کہ میں وہ چراغِ محری ہوں جو کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے۔

طارق محمود کی کہانی بظاہر ختم ہو چکی ہے مگر ہر یوم آزادی پر جب جب چراغاں ہوگا تو کم از کم مجھے یہ احساس ضرور ہوگا کہ رانو کی ماں جس نے پاکستان کی آزادی کے چراغ روشن کرنے کے لئے اپنے آباؤ اجداد اپنے عزیز واقارب اپنا گھر بار سب کچھ قربان کر دیا۔ بدلے میں اس دھڑی کے باسیوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا کہ ذلت و رسوائی کی موت اس کا مقدر بنی وہ بھی ایک شگستہ سی جمو نیڑی میں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنے ان گناہ محسنوں کو اگر وہ زندہ ہیں تو انہیں مکمل پیار اور احترام دیں اور اگر وہ مر گئے ہیں تو ان کے ورثاء کو تلاش کر کے ان سے ان کی ہجرت کی خونچکاں داستانیں سن کر انہیں تاریخ کا حصہ بنایا جائے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں آزادی کے ان چراغوں کی روشنی میں اپنی منزلوں کے نشان ڈھونڈتی رہیں۔



تھیں جھگیوں والے نہ جانے کب سے وہاں سے کوچ کر چکے ہیں۔

میں چند لمحے حیران و پریشان اپنے اجڑے ہوئے کارواں کے نقش دیکھتا رہا پھر دل شکستہ انداز میں واپس ٹی سال پر آ گیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ رانو وہاں پورا ہفتہ آتی رہی اور مجھے ڈھونڈتی رہی پھر کوئی تین ہفتے پہلے اچانک ڈسٹرکٹ انتظامیہ نے آ کر تمام جھگیوں کو وہاں سے اٹھوا دیا اور اب وہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ میں تھکے تھکے اور ہارے ہوئے انداز میں واپس

بٹیج پر آ کر بیٹھ گیا۔ انسان مر جائے تو چند دن رو دھو کر صبر اسی جایا کرتا ہے مگر جو لوگ بغیر کوئی پتہ دیئے بغیر کوئی نشان دیئے انسانوں کے سیل رواں میں گم ہو جائیں ان کے دیئے ذمہ ناسور بن کر لکھ کر گہرائیوں تک رستے رستے ہیں۔ رانو بھی انسانوں کے سمندر میں کوئی اتار پتہ، کوئی سراغ دیئے بغیر نہ جانے کہاں کھو گئی تھی اور اب مجھے رانو کی جدائی کا بوجھ اٹھائے ایک زندہ لاش کی طرح چینا تھا، نہ جانے کب تک؟

رانو کو مجھ سے پھڑے عرصہ بیت گیا۔ جب بھی 14 اگست کا دن آتا، میری آنکھوں کے سامنے رانو کا ستا ہوا چہرہ گھوم جاتا۔ اس روز عمارتوں، گھروں، دفاتروں اور گلیوں بازاروں میں چراغاں دیکھ کر مجھے رانو کی ماں اور دیگر وہ لوگ یاد آ جاتے جنہوں نے پاکستان کی بنیادوں میں اپنا خون بہایا۔ جنہوں نے آزادی کے چراغ تیل کی بجائے اپنے لہو سے جلائے اور پاکستان کی تاریخ میں گناہ ہو گئے۔ کسی بھی مورخ نے آزادی کے ان گناہ لوگوں کو کبھی بھی کھوجنے کی کوشش نہ کی جو وطن کی شمعیں روشن کرتے کرتے ذلت و رسوائیوں کی آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے۔

رانو کے پھڑنے کا غم ایسا نہ تھا جسے آسانی سے بھلایا جاسکتا۔ چنانچہ میں نے مختلف قسم کے نشوں میں



آؤ مجھے سلام کر لیں

ایک قوم دوسری کی برتری سے خائف ہے۔ دشمن نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ خوف سے انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ بزدلی سے مردانگی نہیں درندگی پیدا ہوتی ہے۔

☆ نسیم سیکڑہ صدف

”تم بھی بزدل ہو“۔ امجد نے فتویٰ دیا۔ ”میں کہتا ہوں ہم سب بزدل ہیں، حقیقت کا سامنا نہیں کر سکتے۔“

ہم نے مل کر زور سے قہقہہ لگایا جو خالی ہال میں گونجا۔ اس گونج میں یاس کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ کاؤنٹر سے نوجوان میجر نے ہمیں دیکھا، بیرے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ یہ سب لوگ نئے آئے تھے، انہیں کیا معلوم کہ اس ہال میں ایسے کتنے قہقہے بلند ہوا کرتے تھے۔ میں نے کالی کا آرڈر دیا۔

”قہقہہ لگاتے شرم نہیں آئی؟ بزدل ہمیشہ قہقہہ لگاتا ہے۔“

”انسان بزدل ہے۔“ امجد کا یہ فیصلہ ہمیں اچنبھے میں ڈال گیا۔ انسانیت پر اتنا بڑا الزام اور وہ بھی امجد لگائے جو انسان کی بزرگی کا قائل تھا۔

ہم لوگ کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے جہاں اب نہ رونق تھی اور نہ وہ مانوس چہرے صاف و شفاف ہال، خوبصورت فرنیچر ہال کی بے کسی کو زیادہ نمایاں کر رہا تھا۔

”بھائی!“ میں نے کہا۔ ”اتنے عرصے بعد کافی ہاؤس کھلا اور تم انسانیت کی بزدلی کا قصہ لے بیٹھے ہو۔ چھوڑیے اس قصے کو، کہو کیا کھاؤ گے؟ چکن سینڈویچ، فرائی انڈے یا چائپ؟“

”ہا کے لئے کشش!“ وہ غریبا۔ ”ہزاروں سال کی تہذیب و تمدن کو برباد کر دینے کا نام تم کشش رکھتے ہو۔“

”یہ سب اور کیا تھا؟“ ریاض ابھی خاموش بیٹھا کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، بولا۔ ”کافی ہاؤس کی بربادی سے انسان بزدل نہیں بن جاتا۔“

”اگر ہم حالات کا جائزہ لیں۔“ احمد نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”تو ہمیں معلوم ہو گا کہ یہاں دو قوموں کا سوال تھا۔ ایک ہر لحاظ سے دوسری پر فوقیت رکھتی تھی۔ اس کے پاس طاقت کے سارے سامان تھے اور دوسری تہی دست۔ ایک طاقت کے نشے میں محمور دوسری کو زندگی کی ہٹا کی فکر۔ نتیجہ یہ انقلاب ہے، اسے بزدلی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔“

”چند مکانوں کو جلا دینا، انسانوں کا قتل کرنا، انفرادی طور پر اس کی اہمیت ہے لیکن زمانے کے مقابلے میں اس کی اہمیت کیا ہے؟“

”امجد بھائی! کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ ریاض نے توجہ دلائی۔ امجد کی ان باتوں نے سارا حرا کر کر اکر دیا۔

”کافی بد مزہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”جب تک ماحول نہ ہو کافی کا لطف نہیں آتا۔“

”ہاں، تو تم نے کہا تھا۔“ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”کہ زمانے کے سامنے اس ہنگامے کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے اس سے بنیادی اختلاف ہے۔ تم زمانے کو اہمیت دیتے ہو اور میں انسان کو۔ تم قوم کی برتری اور کمتری کو دیکھتے ہو اور میں انسان کی فطرت میں جھانکتا ہوں۔“

”لیکن۔“ میں نے ٹوکا۔ ”تم زمانے کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔“

”میں انکار نہیں کرتا۔ جس چیز کو تم نظر انداز کر

کافی آگئی۔ احمد اسے پیالیوں میں ڈالنے لگا اور بولا۔

”جانے کب یہ کافی ہاؤس پھر آباد ہو گا؟ ایک وہ زمانہ تھا جب جگہ کے لئے پہروں انتظار کرنا پڑتا اور آج یہ خالی ہال کھانے کو آ رہا ہے۔“

میں نے گرم گرم گھونٹ کا مزہ لیتے ہوئے لقمہ دیا۔

”عرصے کے بعد آج کھلا ہے، رونق ہو جائے گی۔“

”رونق ہو جائے گی!“ امجد نے میرا فقرہ کچھ اس طرح دہرایا کہ مجھے برا لگا۔ ”زندہ انسانوں کی جگہ یہاں مُردے آئیں گے، مُردے۔“

”امجد! تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟“ احمد نے تنگ آ کر پوچھا۔ ”آخر یہ کیا ہے، تم بات بات پر بگڑ رہے ہو؟“

”میں بگڑ نہیں رہا، مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ انسان کی بزدلی پر، اپنی بزدلی پر، اس خوف پر جو ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے۔ انسان کے ذہنی جمود پر جو ہزاروں سال بیت جانے کے بعد بھی اس پر طاری ہے۔ تم مجھے یہاں لے آئے ہو، میرے لئے یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ایک تہذیبی مرکز تھا، یہاں ایک نئی دنیا جنم لے رہی تھی جس کا مذہب انسانیت تھا اور آج یہ ایک خالی کمرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ میز، یہ کرسیاں جو کبھی زندگی سے سرشار تھیں، اب پتھر سے زیادہ سخت اور سرد ہیں۔ یہ منبر، یہ بیرے انہیں کیا خبر کہ یہاں کون سی دنیا آباد تھی؟“

”وہ ایک خیالی دنیا تھی جو مٹ گئی۔“ میں نے کہا۔ ”اب ہم ایک حقیقت کا سامنا کر رہے ہیں، حالات کا تقاضا یہی ہے۔ انسان کو بزدل کہنا کسی حالت میں بھی روا نہیں، یہ ہٹا کے لئے کشش تھی۔“

فرمانِ الہی

اچھی بات کرنے اور معاف کر دینے کو اپنی عادت بنا لو۔ اچھی بات اور معاف کر دینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے کسی طرح کی تکلیف پہنچانا ہو اور اللہ بہت بے پروا بے حد بردبار ہے۔

مرسلہ: ----- محمد طفیل طونی - کویت
نے بہادری سے مقابلہ کیا، ہٹا کے لئے جدوجہد کی۔

”جدوجہد نہیں، یہ خوف تھا۔ ہماری سیاست خوف پر مبنی ہے۔ ایک قوم دوسری کی برتری سے خائف ہے۔ دشمن نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ خوف سے انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ بزدلی سے مردانگی نہیں درندگی پیدا ہوتی ہے۔“ وہ رکا اور اس نے کافی کے چند گھونٹ لئے۔ ”ایک انسان کائنات کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مہینوں ماں اسے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، ماں برسوں کی محنت سے اسے پالتی پوتی ہے، قدرت سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ جوان ہوتا ہے، اس کی فطری دہلیزیں بروئے کار آتی ہیں، علم کے خزانوں سے اپنا حصہ لے کر وہ لامال ہوتا ہے اور تہذیب کی عمارت کو بلند کرنے میں لگ جاتا ہے۔ ایک ایسی کسی کا نامعلوم ہاتھ اس کے سینے میں چاقو گھونپ دیتا ہے۔ وہی انسان جو ابھی کائنات کا ایک بہت بڑا شاہکار تھا اب لاش کی صورت میں پڑا ہے، کوئی اسے اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ قاتل کو پکڑ لے۔“

اور کافی آگئی تھی، امجد کا جوش بڑھ گیا۔ وہ پوٹیکل سائنس میں ایم اے تھا اور ایم اے اقتصادیات کی تیاری کر رہا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا، فسادات شروع ہو گئے، اس کا گھربار لٹ گیا، ساری جائیداد تباہ کر دی گئی۔ حساس نوجوان کے لئے یہ سانحہ کوئی معمولی نہ تھا،

باتے ہو میں اسے مقدم سمجھتا ہوں۔“

مال روڈ پر ایک شور بلند ہوا، لاریوں کی مہیب آواز نے کلام کا سلسلہ روک دیا۔ لاریوں کا ایک قافلہ پناہ گزینوں کو لئے جا رہا تھا۔ بے شمار تباہ حال لوگ ان لاریوں میں بھرے پڑے تھے۔ ہم بھی اٹھ کر کاؤنٹر کے پاس نمائشی کھڑکی سے نظارہ کرنے لگے۔ دروازے میں میجر اور پیرے راستہ روکے کھڑے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا جھوم تھا، ان میں کئی جانے والوں پر ہنس رہے تھے، یہ قافلہ کافی طویل تھا۔

”دیکھتا تم نے انسانوں کا یہ قافلہ؟“ امجد بولا۔ ہم لوگ اپنی جگہ پر واپس آ چکے تھے۔ ”یہ لوگ کہاں لے جائے جا رہے ہیں، خود جانے والوں کو بھی معلوم نہیں ہو گا۔ کتنے ہیں جو یہ جانتے ہوں گے کہ انہیں کس لئے گھروں سے اکھاڑ پھینکا جا رہا ہے، ان پر ہنسا جا رہا ہے؟“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ”انسان کی عظمت کتنی ارفع ہے، خدا کا نائب قرار پایا۔ ساری کائنات اس کے زیر نگیں کی گئی، فرشتوں نے اسے سجدہ کیا مگر اب یہ بلند و بالا انسان.....“

”اور کافی پیو گے؟“ میں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔

”ضرور، گرم گرم ہو۔“ وہ بولا۔ ”میں ایک عرصے سے خاموش ہوں، اچھا ہوا تم لوگ مل گئے۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں، پرانی باتیں ابھی رہتی ہیں، وہ باتیں جو اس ہال سے وابستہ تھیں اجاگر ہو رہی ہیں۔ وہ حسین لمحات جو ہم نے یہاں گزارے ہیں، نشتر بن کر ذہن میں چھ رہے ہیں۔“

”کافی کے بدلے تمہاری باتیں مہنگی نہیں۔“ ریاض مسکرایا، اس نے موضوع کی سنجیدگی اور غلطی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن اپنی چند حسیں یادوں کی خاطر سارے انسانوں کو بزدل بنانا درست نہیں۔ لوگوں

کا اثر کچھ نہ نکلا۔ تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی، سائنس نے دنیا کو مسخر کر لیا، ذرات سے کام لیا جانے لگا، ہوا میں اڑنا، پانی پر تیرنا آسان ہو گیا مگر خود انسان ابھی تک انسان سے ڈرتا ہے۔ اسی ڈر نے اسے بزدل بنا دیا۔“

”خوف اور بزدلی، ان دونوں کو گڈنڈ نہ کریں۔“ احمد جو خاموشی سے کافی پینے میں مصروف تھا، کہنے لگا۔ ”خوف ایک بنیادی جبلت ہے اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ موجودہ انقلاب میں جسے تم بزدلی کہتے ہو وہ جہد للبقا تھی۔“

”میں اس جہد للبقا کا ماتم کر رہا ہوں۔“ امجد نے ترش ہو کر کہا۔ ”اس جہد للبقا کا نتیجہ پنجاب کی تباہی کی صورت میں نمودار ہوا۔ کبھی فرصت ملے تو پناہ گزینوں کے کیمپ دیکھو، ہسپتال دیکھو، ان زخمی بچوں اور عورتوں کو دیکھ جو اس جدوجہد کا شکار ہوئیں۔ ابھی تک لاشوں کے ڈھیر سڑکوں کے کنارے پڑے انسانیت پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ کل تک جہاں آبادیاں تھیں، لہلہاتے کھیت تھے آج ان کی حالت دیکھ کر کبچہ منہ کو آتا ہے۔ انسانوں کی اتنی لاشیں ہیں کہ کتے اور گدھ بھی کھاتے کھاتے تنگ آ گئے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا کیا تھا کے لئے جدوجہد ہے؟ یہ بزدلی کا مظاہرہ ہے، حیوانیت نہیں درندگی ہے۔ آنے والی نسلیں اس دور کے انسان پر نفرتیں کریں گی۔“ امجد کی آواز اور بلند ہو گئی۔ میرے ہماری جانب دیکھنے لگ، کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا نوجوان منبر جو ابھی ابھی دلی سے آیا تھا، حیرانی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

”ہم لوگ ادب کے بچاری ہیں۔“ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”ذرا باز میں جا کر دیکھو، ادب کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ قیمتی کتابیں زمین پر بکھری ہیں، جو لوگ بچ رہے ہیں کتاب کی ضخامت سے قیمت

اس کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ کئی دن بعد وہ ہمیں ملا، ہم لوگ اسے کافی ہاؤس لے گئے۔ وہ حق بجانب تھا، میں نے باتوں کا رخ بدلنا چاہا یہ موضوع خوشگوار نہ تھا۔ ہم لوگ مہینوں اس پر سر کھاتے رہے ہیں۔ مستقبل کا ذکر چھڑا تو وہ بولا۔

”مستقبل..... میں اس سے مایوس ہوں۔ ہم لوگ مستقبل کے لئے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ درندہ، ستیہ ورت، بیدی اس میں حصہ لیتے رہے۔ مس شکنتلا بھی اس میں شامل تھیں۔ ہم نے کئی اقتصادی پلان بنائے، لائبریریاں چھان ماریں، بین الاقوامی قانون کی کتابیں دیکھیں۔ ہم عوام کی تعلیم کے منصوبے تیار کیا کرتے تھے۔ ”پنجابی زراعت“ پر لٹریچر جمع کر رہے تھے۔ مس شکنتلا کا بوڑھا تایا پروفیسر ودیا ساگر، اس نے ہماری راہنمائی کا ذمہ لے رکھا تھا۔ وہ ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا، اس نے اخبارات میں مضامین لکھے، ہماری اقتصادیات کے روشن مستقبل کی طرف توجہ دلائی مگر اس کا انجام..... درندوں نے اسے بھی پھاڑ کھایا۔ اس کے سارے کاغذات جلا دیے، انہیں کیا معلوم کہ ان کاغذوں میں انہی کی خوش حالی کے منصوبے تھے۔“

”امجد! تم جذباتی ہو رہے ہو۔“ ریاض بولا۔ ”تم خوب جانتے ہو کہ یہ کتنا بڑا انقلاب ہے۔ ایسے واقعات کا رونا ہوتا اتنی بڑی بات نہیں۔ جب طوفان بھرتا ہے تو اس کی راہ میں جو آجائے وہ اسے بہا لے جاتا ہے۔“

”میرے بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو۔“ امجد نے درد انگیز لہجے میں کہا۔ ”مگر میرا نقطہ نگاہ اور ہے۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ اس طوفان کو روکنے کے لئے ہمارے لیڈروں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ایک پارٹی نے تو خسارے پر سودا منظور کیا مگر اس کے باوجود یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ لیڈروں نے امن کی اعلیٰ کیں مگر اس

گاؤں کافی دور تھا، میں نے دیکھا تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑی سی ہے، میں یونہی وقت گزارنے کی خاطر جھونپڑی کی طرف روانہ ہوا۔ جب قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر بے سرو سامانی ہے، ایک ادھیڑ عمر کا لاغر سا کسان جو بدحالی کا شکار مظلوم ہو رہا تھا، نیم تاریکی میں زمین پر بچوں کو لئے بیٹھا ہے۔ زمین ہی ان کا بستر تھا۔ ایک طرف ہنڈیا چولہے پر رکھی تھی، کسان پاس بیٹھا تھا، ایک لڑکی آٹا گوندھ رہی تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا، بے سرو سامانی اور ان لوگوں کی بدحالی صاف صاف کہہ رہی تھی کہ وہ کون تھے۔ میرا دل بھر آیا۔

میں نے سلام کیا، بوڑھے کسان نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ آگ درست کی اور نور آٹھ ر میری جانب آیا۔

”آپ مہاجر ہیں؟“ میرے دل میں ہمدردی پھوٹ رہی تھی۔ ”آپ کا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔“ نہ جانے میں نے یہ سوال کیوں پوچھ لیا۔ حالانکہ بے گھر ہونا ہی وہ نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

کسان نے ایک آہ کھینچی۔ ”آپ مہمان ہیں، میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں آپ بیٹھ سکیں۔“ وہ رکا اور سنبھل کر بولا۔ ”نقصان، چار کڑیل جوان بیٹے، دو بہوویں شہید کی گئیں۔ خدا کا دیا بہت کچھ تھا، گھریار لوٹا گیا، نوم چھلا چھینا گیا، ڈھور ڈگر سب لٹ گئے۔ تین پوتے اور ایک پوتی بچا کر لایا ہوں۔“ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ شام کی تاریکی نے کسان کے چہرے پر اور وحشت بکیر دی مگر اس کی آنکھوں میں یقین تھا اور صبر۔ یہ شخص، میرے ذہن میں امجد کی باتیں ابھر آئیں ”انسان بزدل ہے“ ظلم کی داستان سنگدلی اور درندگی کا مظاہرہ جس کا شکار میرے سامنے موجود تھا۔

کا اندازہ لگاتے ہیں۔ دلی میں اس سے بھی زیادہ کمال دکھایا گیا۔ اردو کا سب سے بڑا کتب خانہ چلا دیا گیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”نایاب قلمی نسخے، ادب کے اصول بہرے، جہد للبقا کے پجاری، کینے بزدل.....“ اس نے غم وغصہ سے منھیاں بھیج لیں۔

”آساں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک۔“ ریاض نے لقمہ دیا۔ ”اب اس قصے کو جانے بھی دو۔ مہینوں سے رو رہے ہیں، اب تو آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔“ امجد بھائی نے کہا۔

میں نے بحث کو ختم کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ”ان کا اتنا زیادہ قصور نہیں، وہ بھی ہمارے زمانے کی پیداوار ہیں۔ اب ان کی جگہ اور کسے لایا جا سکتا ہے؟ تم زمانے کی اہمیت کو بھول گئے اور فرد کو بڑھا رہے ہو۔ فرد زمانے کے سامنے حقیر ہے۔“

”عجیب منطق ہے..... اگر فرد نہ ہوتا تو زمانہ کہاں ہوتا؟ زمانے کی اہمیت فرد کی ذات سے ہے۔“ وہ بولا۔

ریاض نے زور سے قہقہہ لگایا، یہ بحث ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ ”اب فرد اور زمانے کا چکر چلاؤ گے۔“

احمد اور میں نے بھی تائید کی۔ یہ محفل ختم ہوئی مگر امجد نے ہمیں بھی مایوس کر دیا تھا۔ ہم آگے مگر وہ جانے کب تک وہیں بیٹھا رہا۔

رسل و رسائل کے سارے ذرائع مسدود، ریل گاڑیاں بند، لاریاں پناہ گزینوں کے کام میں مصروف، پٹرول پر پابندی، عجیب مصیبت کا سامنا ہے۔ ایک ضروری کام سے مجھے باہر جانا تھا، بڑی مشکل سے ایک کار کا بندوبست ہو سکا۔ جانی دفعہ تو راستہ بخوبی کٹ گیا لیکن واپسی پر اچانک کار کے انجن میں کچھ نقص ہونے لگا۔ شام ہونے کو بھی اس لئے ڈرائیور اس خیال سے کہ ہم واپس شام سے پہلے پہنچ جائیں کار چلاتا رہا لیکن

کبھی جگہ نہ تھی، ایسی باتیں کر رہا تھا۔ یہ باتیں دماغ کی نہ تھیں، وہ احمد ہی کر سکتا تھا، یہ دل کی باتیں تھیں۔ میں نے جیب سے چند نوٹ نکال کر پیش کئے۔ ”آپ بچوں کے کپڑے اور سردی کے لئے لحاف بنا لیجئے۔“

وہ مسکرایا۔ ”بیٹا! خدا آپ کو زیادہ دے۔ ہم لوگ زمین کے بیٹے ہیں، زمین ہماری گود ہے، بیٹیں ہم پرورش پاتے ہیں۔ آج تک کسی سے کچھ لیا نہیں، اب جیسے شرم آتی ہے۔ میں مہمان کی خاطر تواضع بھی نہ کر سکا۔“ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

ڈرائیور کے ہارن نے بتایا کہ کار ٹھیک ہو گئی ہے، میں نے رخصت چاہی۔ اس کسان کی باتوں نے میرے دل کو مسرتوں سے بھر دیا تھا، مجھے ایک انسان سے ملاقات کا فخر حاصل ہوا۔

کار پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی، میرا ذہن خیالات سے پُر تھا۔ احمد کی ذہانت میں کسے کلام ہے، اسے انسان کی بزدلی کی شکایت تھی، اسے انسان پر یقین نہ رہا تھا لیکن یہ کسان اور اس کی سیدھی سادی باتیں، اسے اپنے آپ پر یقین تھا۔ ایک محکم یقین، وہ سراپا عمل تھا اور مستقبل سے پُر امید۔ چند نیکیے زمین اس کے لئے ارض مقدس تھی اور اس کے ناتواں ہاتھ کام کرنے کے لئے بیتاب۔ سب کچھ کھو کر بھی وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس کا طرز عمل بتا رہا تھا کہ انسان بہت بلند ہے۔ باہر اندھیرا چھا رہا تھا اور میرا ذہن نئی روشنی پا کر جوان انگٹوں کے دلولوں سے نئی زندگی کے سفر پر رواں دواں تھا۔ میری آنکھوں میں خمار چمک رہا تھا۔ میری بانہیں حیا سے سٹ رہی تھیں اور دل سے آواز آ رہی تھی کہ دنیا والو! آؤ لیجئے غلام کر لیں، ہر سحر کو ہم رنگ شام کر لیں، نفس کو دوام کر لیں!



”آپ کو یہاں زمین مل گئی ہے؟“ میں نے دلاسا دینے کے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بیٹا! کچھ زمین مل گئی ہے، خدا کا شکر ہے۔“ اس کی نگاہیں اچانک آسمان کی طرف اٹھیں۔ ”استحسان سخت تھا مگر میں نے برداشت کر لیا۔“ وہ رک گیا، اس کے چہرے پر نور کی جھلک نمودار ہوئی۔ وہ پہلی وحشت جالی رہی، وہ میرے قریب آ گیا اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

”بیٹا! میں نے سب کچھ کھو دیا، مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ میرا اہلہا تا باخ برباد ہو گیا، مجھے اس کی فکر نہیں۔ میں یہ چار ٹھنھی ٹھنہیاں سینے سے لگائے بیٹھا ہوں، انہیں تینچوں گا اپنے خون سے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن یہ درخت بن جائیں گے، پھلیں پھولیں گے۔ گزارے کے لئے یہ زمین کافی ہے۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ یوں معلوم ہوا جیسے زمین میلوں پھیل گئی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”ان ہاتھوں میں ابھی کچھ سکت باقی ہے، ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔“ وہ پھر رک گیا۔

اس کے ہاتھ نے میرے کندھے کو اور دایا، میں اس کے ذہن کی حالت کا اندازہ لگا رہا تھا، وہ اپنے غم کو چھپا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک کنگش تھی۔

”لیکن شکر ہے میں ثابت قدم رہا۔“ اس نے دہرایا۔ ”میرا جرم یہی تھا کہ میں مسلمان تھا، اس کی مجھے سخت ترین سزا دی گئی۔“ اس کی آواز میں اعتماد آ گیا، اس نے سر کو اونچا کر لیا۔ ”میں نے سزا کو بخوشی قبول کیا، اس کا اجر مجھے مل گیا ہے۔ میں اب اس پاک سرزمین پر ہوں جہاں میں سر بلندی سے کہہ سکوں گا کہ میں ایک مسلمان ہوں۔“ اس نے ہاتھ میرے کندھے سے اٹھا لیا۔

ایک خستہ حال انسان جس کے پاس سر چھپانے

آن گریہ

”اگر میں اسے قتل کرتا تو سب سے پہلے اس کی عزت تار تار کرتا۔ اس کے بعد اس کے سینے میں اپنے پستول کی چھ کی چھ گولیاں اتار دیتا۔“

☆ ریاض بٹ



آئے وہ صورت سے عام سے دیہاتی لگتے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ انہوں نے مکمل کے کرتوں کے نیچے عام سے لٹھے کی شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔ ایک کا نام اکبر اور دوسرے کا غلام دین معلوم ہوا۔

”لاش کس نے دیکھی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”نمبردار جی نے لاش دیکھی تھی سرکار!“ اکبر نے بتایا۔

”کچھ پتہ چلا لاش کس کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں، ابھی تک لاش کی شناخت نہیں ہوئی ہے۔“ نمبردار صاحب ہی تفصیل بتا سکیں گے۔“ غلام دین نے کہا۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ تم تھانے میں اطلاع دے آؤ۔“

میں نے اسی وقت ایک ہیڈ کانسیبل اور دو کانسیبلوں کو ساتھ لیا اور ان دیہاتیوں کی رہنمائی میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں لاش پڑی تھی۔ نمبردار لاش کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے لاش کے ارد گرد حصار سا بنوایا ہوا تھا تاکہ لاش کے پاس زیادہ بھیڑ نہ جمع ہو اور کھرے خراب نہ ہوں۔

میں نے لاش کے ارد گرد کھڑے بندوں کو پیچھے ہٹ جانے کے لئے کہا اور خود لاش کے پاس پہنچ گیا۔ ایک جوان سال عورت کی لاش تھی۔ زندگی میں خوبصورت رہی ہوگی لیکن اب موت کی زردی اس کے چہرے پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں حلقوں سے اٹلی پڑ رہی تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ کپڑے یعنی لباس بظاہر ٹھیک حالت میں ہی تھا۔ جسم پر کسی قسم کے تشدد کے نشان نہیں تھے۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد ہیڈ کانسیبل کی نگرانی میں لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر

میرا نام چوہدری سجاد الحسن ہے۔ میرا بچپن عام بچوں کی طرح نہیں گزرا۔ میں ہر وہ کام کرنے کی کوشش کرتا تھا جس سے دوسرے بچے خوف کھاتے تھے۔ میرا علاقہ کھڈانوں اور اوچھی چنچی ٹیکریوں سے بھرا پڑا تھا۔ اونچے اور خطرناک درختوں پر چڑھنا، نہر میں ہمیشہ گہرے پانی میں غوطے لگانا، چھوٹی عمر میں ہی بندوق چلانا اور پرندوں کے گھونسلے اجازنا، میرے شوق ایسے ہی تھے۔

مجھے فوج میں جانے کا بہت شوق تھا لیکن میرا یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ میرے والد صاحب کی حادثاتی موت اس میں رکاوٹ بن گئی۔

پھر وقت گزرنے کے بعد میرے دادا نے اپنے ایک دوست سے کہہ کر مجھے پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی کرادیا۔ یہ محکمہ مجھے راس آگیا اور میں نے بڑی محنت اور ایمانداری سے اپنی سروس پوری کی۔ دوران سروس مختلف علاقوں میں تعینات رہا۔ بے شمار وارداتوں کی تفتیش کی اور مجرموں کو انجام تک پہنچایا۔

”حکایت“ میں جو تفتیشی کہانیاں چھپتی ہیں وہ بہت بلند معیار کی ہوتی ہیں۔ میں اس پائے کی کہانیاں تو نہیں سن سکتا لیکن جو بھی میں نے دیکھا اور کیا وہ سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتا ہوں۔

ایک صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہا تھا کہ سپاہی نواز نے آکر اطلاع دی کہ ادھر گاؤں عزیز آباد کے قبرستان کے پاس کسی عورت کی لاش ملی ہے۔

”اطلاع لے کر کون آیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”نمبردار صاحب نے دو بندے بھیجے ہیں جناب!“ کانسیبل نے بتایا۔

”ان دونوں کو میرے پاس لاؤ۔“ میں نے کہا۔
کچھ ہی لمحوں کے بعد جو بندے میرے سامنے

دی۔

فرد کو جانتا ہوں۔“

اگست 2017

نمبردار کا نام رجب علی تھا۔ وہ میرے آگے بچھا بچھا جا رہا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کہ علاقہ تھانیدار کو خوش رکھے۔ اس کے لئے وہ خوشامد اور چالوسی سے کام لے رہا تھا۔ اس کے بدلے نمبردار تھانیداروں سے چھوٹے موٹے کام نکلوا کر گاؤں کے لوگوں پر رعب جماتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ڈیرے پر لے گیا اور میرے منع کرنے کے باوجود چائے پانی کا بندوبست کر دیا۔ میں نے سپاہیوں کو باہر ہی رکنے کا حکم دے دیا تھا۔

”میں یہاں کسی دعوت پر نہیں آیا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”بہتر ہے ہم کام کی بات کر لیں۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ لاش کیسے دریافت ہوئی تھی؟“

”مجھے صبح چہل قدمی کی عادت ہے۔ آج میں جونہی قبرستان کے قریب پہنچا تو میری نظر لاش پر پڑ گئی۔ کچھ دھڑکتوں میں کچھ لوگ کام کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بلایا اور آپ کے پاس اطلاع کے لئے بھیج دیا اور خود لاش کی حفاظت کے لئے وہیں رک گیا۔“

”میں جب قبرستان کے پاس پہنچا تھا تو دور سے آپ کا انتظام دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن قریب آ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ آپ نے اور دوسرے بندوں نے سارے کمروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ بعد میں لاش کے گرد حصار بنانا ایسے ہی تھا جیسے بارش میں اچھی طرح بھیکنے کے بعد چھتری تان لی گئی ہو۔“

”اس وقت میرا ذہن کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں لاش دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔“

”کیا تم نے لاش کو شناخت کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تھانیدار صاحب! یہ ہمارے گاؤں کی نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں اس گاؤں میں بسنے والے ہر

”اس کا مطلب ہے کہ اسے کسی نے لاش پہلے لاکر بھیجی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اے بھائی! آج اسے لاکر بھیجی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے کام کو سمجھنے والے۔“ میں نے کہا۔ ”اصل مسئلہ لاش کی شناخت کا ہے۔“

”لاش کی شناخت ہو کر آپ بالکل بے فکر ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں بے فکر نہیں ہو سکتا۔“

”پہلے لاش کی شناخت ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے لاش کے چہرے کے فوٹو لے لئے گئے۔“

”تھانوں میں بھیجتا تھا۔ یہ ہمارا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے اشتہار شور و غوغا کیسے کرتا ہے۔“

”سپاہیوں کو لے کر تھانے میں آجائیں۔ اس سے پتہ چلے گا کہ لاش کیسے لائی گئی تھی۔“

”میں نے اپنی سیٹ انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔“

”بندہ تھا۔ عمر پچاس کے قریب۔“ میں نے کہا۔ ”ان میں ایک اور شخص بھی تھا۔ آسمانی رنگ کا شلوار سوٹ۔“

”میں نے اس سے مہذب لگتا تھا۔ سر پر اس کے سر پر ایک کپڑا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے رکھی ہوئی تھی۔ بعض لوگوں کو کمرے میں بھیج دیا۔“

”میں نے اس سے گفتگو کی۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے کہا۔“

”ہاں، جناب! کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جناب! میری بھابی گم ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”گم ہو گئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، جناب! میری بھابی گم ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے سول ہسپتال بھیجی ہے۔“ میں نے کہا۔

اسی وقت وہ کانسیل آ گیا جو مقتولہ کی لاش کی تصویروں کے پرنٹ لینے گیا تھا۔ میں نے اس سے تصویریں لے کے شفقت کو دکھائیں تو اسے جیسے سکتے ہو گیا۔ پھر وہ دھائیں مار مار کر رونے لگا۔ فیاض اسے تسلی دلا رہے تھے لگا کہ حوصلہ کرو، اس طرح کام نہیں چلے گا۔

تھانیدار صاحب کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا تاکہ یہ قاتل کو قتل و واقعی سزا دلا سکیں۔

”لیکن اس طرح میری بھابی تو واپس نہیں آ سکتی۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”چاہے تھانیدار صاحب ساری دنیا کو چھانسی دلوادیں۔“

فیاض نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا پھر جو وہ رویا ہے تو ہم سے سننا مشکل ہو گیا۔ بہر حال رونا اس کے لئے ضروری اور سودمند تھا۔ ہم نے اسے رونا دیا۔ ساتھ ساتھ فیاض اس کی پیٹھ بھی تھپکتا رہا اور اسے حوصلہ دیتا رہا۔ چندر منٹ کے بعد یہ طوفان تھا۔ پھر جو باتیں مجھے معلوم ہوئیں وہ مختصر بیان کر دیتا ہوں۔

رشید اور شفقت دو بھائی تھے، ان کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ پانچ سال پہلے رشید کی شادی ہو گئی تھی زلیخا کے ساتھ۔ ابھی تک ان کی اولاد نہیں تھی۔ رشید کو شادی کے بعد زیادہ عرصہ گھر میں رہنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ کسی عرب ملک میں ملازمت کرتا تھا وہ چھ مہینے کی چھٹی آیا تھا۔ اس دوران شادی ہوئی تھی اور اس کی ازدواجی زندگی صرف چار ماہ پر مشتمل تھی۔

اب وہ ایک ماہ بعد واپس آ رہا تھا اور اس کا ارادہ یہاں سیٹل ہونے کا تھا۔ یہ گاؤں فیروز آباد تھا اور ہمارے تھانے سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ گھر چار مرلے پر بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں شفقت اکٹرا رہتا تھا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ دوسرا کمرہ

فیاض معلوم ہوا تھا اور لڑکی کا شفقت۔

”تھانیدار صاحب! شفقت کی بھابی زلیخا رات سے غائب ہے۔“ فیاض نے بتایا۔

”اور آپ لوگ اب آ رہے ہیں، رات سے صبح بارہ بجے تک کیا کرتے رہے ہیں؟“ میں نے ٹھیکے لہجے میں ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت دن کے بارہ بجے تھے۔

”اب تک یہ اور اس کی ہونے والی ساس اسے ڈھونڈتے رہے تھے۔“ فیاض نے کہا۔

اگر کسی کی بیوی، بیٹی یا اور کوئی رشتے دار عورت گم ہو جائے تو پہلے اپنے طور پر ڈھونڈا جاتا ہے تاکہ لوگوں میں بدنامی نہ ہو۔ پھر ہر طرف سے مایوس اور ناکام ہو کر تھانے کا رخ کیا جاتا ہے۔

اچانک مجھے خیال آ گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس عورت کی لاش ملی ہے وہ اس لڑکے کی گمشدہ بھابی ہو۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے اس کی بھابی کا حلیہ، عمر اور کپڑوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہر بات تفصیل سے بتا دی۔ اس کا جواب سن کر اس بات میں کوئی شک نہ رہا کہ قبرستان کے قریب سے ملنے والی لاش دراصل اس لڑکے کی گمشدہ بھابی کی ہے اور اس کا نام زلیخا ہے۔

”دیکھو شفقت! میری بات ذرا دھیان اور حوصلے سے سننا۔“ میں نے اسے ذہنی طور پر بری خبر کے لئے تیار کرتے ہوئے کہا۔ ”آج صبح ہی ایک قبرستان کے قریب جھاڑیوں سے ایک عورت کی لاش ملی ہے۔ تم نے اپنی گمشدہ بھابی کا جو حلیہ اور لباس کے متعلق بتایا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ وہ اسی تمہاری بھابی کی ہی ہے۔ اسے کسی نے لگا گھونٹ کر قتل کر دیا ہے؟“

”نہیں..... نہیں تھانیدار صاحب!“ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”آپ کو غلطی لگی ہوگی..... وہ لاش کہاں ہے؟“

زلیخا کے تصرف میں تھا۔ تیسرے کمرے میں مشترکہ سامان رکھا ہوا تھا۔

ریشم کے آنے پر شفقت کی شادی ہوئی تھی۔ شفقت کی معافی ہو چکی تھی۔ میں نے شفقت سے پوچھا کہ یہ بات کب اس کے علم میں آئی تھی کہ اس کی بھابی گھر میں نہیں ہے؟

”رات میرے سر میں درد تھا۔ کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔“ شفقت نے بتایا۔ ”میں نے بڑی کوشش کی کہ نیند آ جائے۔ نیند کو تو سر درد نے بھگا دیا تھا اس لئے میں درد کے مارے جاگ رہا تھا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے بھابی کو آواز دی۔ ایک دفعہ پکارا، دوسری دفعہ آواز دی، تیسری بار ذرا زور سے آواز دی لیکن میری آواز کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ میری ساس کا (ہونے والی) گھر ساتھ ہی ہے۔ میں نے ان کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ اندر سے ان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”کون ہے، اس وقت؟“

میں نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے چادر کو اپنے سر پر ٹھیک طرح سے جمایا اور میرے ساتھ ہمارے گھر میں داخل ہو گئیں۔ جب ہم بھابی کے کمرے میں داخل ہوئے تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بھابی کمرے میں نہیں تھیں۔ پھر میری ساس نے اور میں نے گھر کا کونہ کھدرا دیکھ لیا لیکن وہ کہیں نہ تھی۔

اس کے بعد ہم نے گاؤں کے کافی لوگوں کی نیند خراب کی تھی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلا۔ اب تک وہ نہ ملی تو فیاض نے کہا تھانے چلتے ہیں۔ یہ اندازہ تو میں نے لگا لیا تھا کہ فیاض بات عقل سے کرتا تھا۔ میں نے فیاض کو بھیج کر اس کی ہونے والی ساس ریشم بی بی کو اپنے سامنے بٹھالیا۔

وہ اپنے نام کے بالکل الٹ تھی۔ ریشم جیسی

ملاکت اور نازک ہونے کی بجائے وہ بارہ من کی دھوین لگتی تھی۔ وہ ہاتھ نچا کر بات کرتی تھی۔ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ لگتی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں تو اندازہ ہوا کہ موٹی عقل کی عورت ہے۔

”ریشم بی بی! یہ بتاؤ زلیخا کیسی عورت تھی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا مطلب تھا نیدار صاحب؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا کہ کہیں یہ عورت بن تو نہیں رہیں لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ یہ عورت بدھو ہے۔

”میرا مطلب ہے کردار کی کیسی تھی؟ نرم مزاج تھی یا جھگڑالو؟“

”تھانیدار صاحب! میں نے اپنی قبر میں جانا ہے، میں نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی تھی۔ البتہ غصے کی ذرا تیز تھی، بس چھوٹی ہری مرچ سمجھ لیں۔“

”تمہارے ہونے والے داماد نے یہ کہا تھا کہ تم نے اور اس نے گاؤں کے کافی گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے تھے، زلیخا کو ڈھونڈنے کے لئے لیکن اس نے زلیخا کے ماں باپ کا ذکر نہیں کیا۔“

”تھانیدار صاحب! وہاں تو اب الو بولتے ہیں، زلیخا کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی بہن گوجرانوالہ میں بیابائی ہوئی ہے اور اس کا بھائی رشید کے ساتھ باہر ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بی بی! تم دوسرے کمرے میں جاؤ اور اپنی بیٹی کو بھیج دو۔“

پہلے تو اس نے چند لمحے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اپنی بیٹی کو تو اسے بھیجا ہی پڑا تھا۔ اس کی بیٹی دھان پان سی ایک خوبصورت گڑیا کی مانند تھی۔ عمر بیس سال کے قریب ہو

گڑیا!“ میں نے اس سے کہا۔ ”تم کچھ خیال نہ کرنا۔ وہ قتل ہو چکی ہے ظاہر ہے یہ کام کسی دشمن کا ہی ہے۔ اس لئے ایسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”تھانیدار صاحب! اگر مجھے قاتل مل جائے تو میں سب سے پہلے اس کی آنکھیں نکالوں گی پھر.....“ وہ جوش میں آگے بھی بولنے لگی تھی لیکن اس نے میری طرف دیکھا تو شاید اسے احساس ہوا کہ وہ ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھی ہے۔

”تم بالکل بے فکر ہو جاؤ گڑیا!“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں قاتل کو پکڑ کر پھانسی پر لٹاؤں گا۔“

”بس، تھانیدار صاحب! اتنی اچھی پاکباز اور ہمدرد باہمی کو جس نے بھی قتل کیا ہے اس کا برا انجام نزدیک ہے۔“ اس نے مصیبت سے کہا۔

چند لمحے اس نے توقف کیا پھر بولی۔ ”تھانیدار صاحب! اگر میں ایک بات کہوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟“

”نہیں، میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔ تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو بلا خوف و خطر کہہ دو۔“

”لیکن میری آپ سے ایک گزارش ہے کہ جو باتیں میں اب آپ کے ساتھ کروں گی ان کا میری ماں کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”آپ اس علاقے کے تھانیدار ہیں، کیا آپ میری شادی میری مرضی سے نہیں کدوا سکتے؟“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے اس کے دل کی مزید باتیں اگلوانے کے لئے پوچھا۔

”مجھے شفقت ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے کسی سہیلی سے بات کر رہی ہو۔

گی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے اس گھبراہٹ اسے نکالنے کے لئے چند ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر نرم لہجے میں استفسار کیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نام تو میرا رافت ہے لیکن ماں نے مجھے گڑیا کا نام دے دیا ہے۔“

”بالکل صحیح نام دیا ہے۔ تم واقعی گڑیا ہی ہو۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گردش دینے پر ہی اکتفا کیا، بولی کچھ نہیں۔

یہ اندازہ میں نے لگایا تھا کہ وہ ماں کی طرح بدھو نہیں ہے، تیز طرار ہے۔

”اچھا، گڑیا! ایک بات تو بتاؤ۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”زیلینا تمہیں کیسی لگتی تھی؟“

”وہ بہت اچھی تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”ہر وقت رشید بھائی کے لئے دعائیں کرتی رہتی تھیں۔ اکثر کہتی تھیں کہ وہ میری خاطر اور اپنے بھائی کی خاطر اتنی دور پردیس میں روزی کمانے گئے ہوئے ہیں۔ وہ ہر جمعرات کو سائیں فیروز بابا کے مزار پر دیا جلانے جاتی تھیں کہ ان کا مجازی خدا وہاں خیر خیریت سے رہے اور خیر خیریت سے واپس آئے۔“

”اچھا، ایک بات کا ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”تم نے بھی اس کی ایسی ویسی بات سنی تھی؟“

”توبہ کر س تھانیدار صاحب!“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ جیسی باتیں کر رہے ہیں، زیلینا باہمی تو پانے کا سونا تھیں۔ ان میں ذرا بھی کھوٹ نہیں تھی۔ وہ محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں اور خود بھی نماز روزے کی پابند تھیں۔ وہ تو دن رات اپنے خاندان کے متعلق ہی سوچتی رہتی تھیں۔“

”میرے لئے ایسی باتیں پوچھنا ضروری ہیں

واقع ہوئی تھی اور جس وقت مقتولہ کا گلا گھونٹا گیا تھا اس وقت وہ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر تھی۔ معدے میں کچھ کھانے اور چائے کی مقدار پائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

اب اس بات کے متعلق، کہ خواب آور گولیاں یا کوئی دوائی مقتولہ نے خود کھائی تھی یا اسے قاتل نے دی تھی۔ فی الحال کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی تھی۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش ورثا کے حوالے کر دی۔ رشید کے متعلق انہوں نے بتایا کہ اسے بذریعہ ٹیلی فون مطلع کر دیا گیا ہے۔ میں نے یہ بات ذہن میں رکھ لی تھی کہ ہر جمعرات کو زینجا مزار پر دیا جانے جاتی تھی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں گڑیا نے بتایا تھا کہ اس کی زینجا باجی کبھی کبھی اس کے ساتھ دیا چلانے جاتی تھی لیکن زیادہ تر وہ کشور کے ساتھ جاتی تھی۔ کشور اس کی بچپن کی سہیلی تھی اور اس گاؤں میں بیابھی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر کریم بخش کھیتی باڑی کرتا تھا۔ میں نے کانشیل کو بلا کر اسے حکم دیا کہ وہ گھماؤ فیروز آباد جائے اور کریم بخش کو یہ پیغام دے آئے کہ آج شام وہ گھر میں رہے، ہم اس کی بیوی سے کچھ باتیں پوچھنے کے لئے آئیں گے۔

کریم بخش ایک مضبوط کاظمی اور گندی رنگت والا بندہ تھا۔ شکل سے مسکین لگتا تھا۔ وہ ہمارے آگے بچھا جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں رنگین پاپوں والی چارپائی پر بٹھایا۔ اس کے اوپر نیا کھیس بچھا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمیں وہ سر پر بٹھالے۔

”کوئی قصور ہو گیا مجھ سے سرکار!“ اس نے فدیہ انداز میں ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

”کریم بخش! میں تم لوگوں کو ملزم یا مجرم سمجھ کر

”اچھا تمہیں جو دونوں آنکھوں سے بھاتا ہے، اس کا نام بتادو۔“

”اس کا نام نور محمد ہے، چاچے کرامت کا بیٹا۔“

”دیکھو، گڑیا! تمہاری امی نے کچھ سوچ کر ہی تمہاری منگنی شفقت سے کی ہوگی۔“

”جی ہاں، صرف دولت دیکھ کر کیونکہ رشید بھائی ہر مہینے پہلے بھیجتے رہتے ہیں۔ رشید بھائی بہت اچھے ہیں... خیر جانے دیں تھانیدار صاحب! آپ سے اگر ہو سے تو میری منگنی تر وادیں۔“

وہ ایک ایسی بات کر رہی تھی جو میرے بس میں نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اسے جھوٹی تسلی دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد ہم تھانے میں واپس آ گئے تھے۔

زینجا کے متعلق یہ بات پتہ چلی تھی کہ کردار کی پختہ تھی۔ ویسے تو انسان کی نفسیات عجیب گورکھ دھندا ہے۔ اس کا شوہر کافی عرصے سے ملک سے باہر تھا اور فطری تقاضوں سے منہ موڑنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ صبر کی وزنی سل سینے پر رکھنی پڑتی ہے۔ میں فی الحال اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ زینجا نے اپنے آپ کو یاد الہی میں مگن کر لیا تھا۔ اس کو یہ احساس بھی تھا کہ اس کا خاندان اتنی دور روزی روٹی کمانے کے لئے گیا ہوا ہے۔ اسے اس کی امانت میں خیانت نہیں کرنی۔

ایک سوال میرے ذہن میں بچو کے لگا رہا تھا کہ آخر اتنی اچھی، کردار کی پاکیزہ خاتون کو کس نے قتل کیا ہے اور کیوں؟ کیونکہ یہ بات تو ایک اٹل حقیقت ہے کہ بغیر کسی وجہ کے کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں مزید کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ اگلے دن تقریباً بارہ بجے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی ساتھ لاش بھی آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان

”آپ پوچھیں، میں اپنی معلومات کے مطابق بالکل صحیح جواب دوں گی۔“
میں نے چند لمحے توقف کیا پوچھا۔

”زینا تمہارے ساتھ فیروز بابا کے مزار پر دیا جانے جاتی تھی؟“

”آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟“
”دیکھو کشور! تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”یہ نہ پوچھو کہ فلاں بات مجھے کس نے بتائی ہے۔ صرف میرے سوالوں کے جواب دو۔“

”تھانیدار صاحب! زینا مہینے کی مین جعرات میں میرے ساتھ دیا جانے جاتی تھی۔“ اس نے کہا۔
”اور ایک جعرات؟“ میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک جعرات وہ اپنی ہونے والی دیورانی (گڑیا) کے ساتھ دیا جانے جاتی تھی۔“ اس نے بتایا۔
”کیا وہ کوئی خاص جعرات ہوتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”یا کسی بھی جعرات کو؟“
”مہینے کی پہلی جعرات وہ گڑیا کے ساتھ جاتی تھی۔“

”یہ سب باتیں تو ہو گئیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ تمہاری سہیلی کا کردار کیسا تھا؟“

”تھانیدار صاحب! مرنے والی مر گئی ہے، خدا اس کا اگلا جہاں اچھا کرے۔“ وہ یہاں پہنچ کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوئی پھر کچھ سوچ کے بولی۔ ”یہ بات آپ اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ تقریباً چار ماہ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد وہ اب تک اکیلی رہ رہی تھی لیکن میں آپ کو یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس نے اپنے جذبات کو برف کی سل بنالیا تھا۔“

”کیا برف کی اس سل کو کسی نے اپنی ہوس کی آگ سے پگھلانے کی کوشش کی تھی؟“ میں نے ایک اور

یہاں نہیں آیا۔ کشور کی سہیلی زینا قتل ہو گئی ہے۔ قاتل کو پکڑنے کے لئے تمہاری بیوی سے چند سوال و جواب کرنے ہیں۔

میری بات سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ وہ بیوی کو لے کر آتا ہے۔

”کریم بخش! تم صرف اپنی بیوی کو بھیج دو۔“ میں نے اس سے کہا۔ وہ میری بات سمجھ گیا، اس لئے سر ہلا کر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی بیوی کشور میرے سامنے بیٹھی ہوئی بالوں کی چٹیا کو بل دے رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے نقوش والی ایک پرکشش عورت تھی۔

”کشور! مجھے بہت دکھ ہے کہ تمہاری پیاری سہیلی کو کسی ظالم نے قتل کر دیا ہے۔“ میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صاحب! پتہ نہیں کون ظالم ہے جس نے یہ ظلم کیا ہے۔“ اس نے کہا اور اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہ آنسو اس بات کی گواہی تھے کہ زینا اچھی عورت تھی، بے شک غصے کی تیز تھی۔ ایسے لوگ دل کے صاف ہوتے ہیں۔ کوئی کدورت اور بغض دل میں نہیں رکھتے۔

”دیکھو کشور! تم میری بہنوں کی طرح ہو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ قاتل کو کیفر کر دار تک پہنچا کر دم لوں گا۔ اس سلسلے میں تمہارا تعاون درکار ہوگا۔“

”تھانیدار صاحب! آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟“ کشور نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھے ہوئے کہا۔
”جو میں پوچھوں اس کا جواب بالکل ٹھیک دینا۔“ میں نے کہا۔ ”اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔“

مقتضا طبعی

شخصیت

(دو حصے)

زندگی سنوار دینے والی کتاب

زندگی سے مایوس نہ ہوں۔ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیں۔ اپنی دنیا کو آپ تارک نہ سمجھیں۔ آپ کی ذات میں روشنی کی کرنیں تڑپ رہی ہیں اور آپ کی قوتیں سوئی ہوئی ہیں۔ آپ کے اندر جسمانی اور نفسیاتی توانائی کا خزانہ چھپا پڑا ہے۔ ان کرنوں اور قوتوں کو ابھرنے دیں۔ اگر آپ کو اس کا طریقہ معلوم نہیں تو ہم میم الف کے دو مجموعے پیش کرتے ہیں۔ یہ مجموعے آپ کی ذات میں انقلاب برپا کر دیں گے۔



شخصیت

مقتضا طبعی

مکتبہ داستان

26- پیالہ گراؤنڈ لاہور۔ فون: 37356541

زاویے سے سوال کیا۔

”کئی آوارہ مزاج مردوں نے یہ چوٹی سر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن منہ کے بل گر گئے تھے۔“ اس نے غر یہ لہجے میں کہا۔

”ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو بہت زیادہ سر پھرا ہو۔“ میں نے اسے کریدا۔ ”جس نے اسے حاصل کرنا اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہو؟“

”چوہدری افضل کا بیٹا افضل۔“ کشور نے کہا۔ ”ایک دن اس نے زینچا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن زینچا نے اسے ایسا زٹائے وار تھپڑ رسید کیا تھا کہ وہ ہل کر رہ گیا تھا۔“ میرے لئے یہ بڑ کام کی بات تھی۔ ”پھر افضل کا رد عمل کیا تھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اس نے کہا تھا۔ کبوتری کی طرح جتنی مرضی اونچی اڑو، آخر میرے پنجرے میں آؤ گی۔ پھر وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا تھا۔“

”تم واقعی بڑی ذہانت والی ہو۔“ میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ بھی بتا دو کہ یہ کتنے دن پہلے کی بات ہے؟“

”آج بدھ ہے، یہ گزری جمعرات کی بات ہے۔“

”یہ واقعہ جب ہوا تھا تو اس پاس کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”مزار اور ہمارے گھر کے درمیان تھوڑا سا ویران علاقہ آتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہاں ہی اچانک کسی طرف سے آ کر افضل نے یہ بکواس کی تھی۔ اس وقت ارد گرد کوئی بندہ نہیں تھا۔“

اس کے بعد میں وہاں سے آ گیا۔

یہاں یہ بات بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ چوہدری کا گاؤں آخر آباد تھا جس کے قبرستان کے پلے

مجھے پتہ تھا کہ ایسے جوان داتا کی نگری کا کبہہ کر کہاں جاتے ہیں۔ اب انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چھوٹے چوہدری افضل سے تین دن بعد ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی جیب میں چار دوستوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو تھانے کے عملے نے اندر نہیں آنے دیا۔ وہ تنہا گردن اکڑائے میرے دفتر میں داخل ہوا اور السلام علیکم ایسے کہا جیسے کوئی نعرہ مستانہ بلند کر رہا ہو۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے اپنے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔

”جناب! آپ اس تھانے میں نئے آئے ہیں۔“ وہ میری طرف منکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں اچھی طرح نہیں جانتے، اس لئے میں خود آ گیا ہوں ورنہ.....“ اس کی گردن میں جاگیر اور پیسے کا سر یافت ہوا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھے اپنا مزارع سمجھ رہا ہے۔

”چوہدری صاحب! آپ کی مہربانی ہے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ورنہ مجھے خود زحمت کرنی پڑتی۔“ میں نے اس کے غرور کو ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس کے پندار غرور کو زبردست چوٹ لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانگی اور غصہ بیک وقت ہلکورے لینے لگا تھا۔

”مطلب یہ چوہدری صاحب! کہ آپ کے خلاف ایک درخواست میرے پاس چند دن پہلے آئی تھی۔ اس لئے آپ کو بلایا ہے۔“ میں نے پروگرام کے مطابق کہا۔

”درخواست؟“ وہ استہزاءیہ انداز میں ہنسا پھر اچانک ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے بولا۔ ”وہ کون بد بخت ہے؟ ذرا اس کا نام تو بتائیں۔“

زینکا کی لاش ملی تھی۔ تھانے میں واپس آ کر میں نے اسے ایس آئی کو اپنے منگے میں بلالیا۔

”اب تمہارے ہاتھ پاؤں ہلانے کا وقت آ گیا ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔

”حکم سر!“ اس نے مستعدی سے کہا۔

”تم اختر آباد کے چوہدری افضل اور اس کے بیٹے کو جانتے ہو؟“

”بالکل سر! چوہدری افضل تو جو کچھ ہے وہ تو ہے ہی لیکن بات وہی ہے کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔“

”کیا ابھی تک اس کی کوئی قابل دست اندازی پولیس کارروائی سامنے نہیں آئی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔“

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مجھے اس تھانے میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزر تھا۔

”اب ایک بات سامنے آگئی ہے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا اور مختصر آسارے حالات سے اسے آگاہ کر دیا۔

”سر! کہیں زینکا والی کارروائی بھی افضل نے نہ کر دی ہو۔“

”یہ تو اس سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، سر! میں ابھی کانسیبل کو بھیج دیتا ہوں۔“ اسے ایس آئی نے کہا اور اسی وقت ایک ہوشیار کانسیبل کو بھیج دیا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے آ کر بتایا کہ وہ حویلی میں نہیں ملا۔ بڑا چوہدری کہتا ہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ داتا کی نگری گیا ہوا ہے۔

نکلے۔ میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟ کیا آپ کو ہر بندے کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ سائن کرتا ہے یا انگوٹھا لگاتا ہے۔“

”وہ..... اپنا یار ہے اس نے بتایا تھا۔“ چوہدری نے کہا۔ ”بلکہ میں نے اس کے پاس سائن دیکھے تھے۔“ ”کون ہے تمہارا یار؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ شفقت ہے جی، اس کا نام۔“ چوہدری نے کہا۔ ”وہ مقتولہ کا دیور ہے نا؟“

”سائن کس پر تھے؟“ میں نے بال کی کھال اتارتے ہوئے کہا۔ ”اس کے پاس ایک چیک تھا۔“ چوہدری نے کہا۔

چوہدری پوری طرح میرے حال میں آچکا تھا۔ اس لئے میں جو پوچھ رہا تھا اس کے صحیح جواب دے رہا تھا۔

”اچھا، چوہدری صاحب! اب ذرا کھل کر بات کریں۔ درخواست میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا ذمہ دار جھوٹا چوہدری افضل ولد چوہدری افضل ہو گا۔ اگر آپ نے جرم کر ہی دیا ہے تو مجھے بتا دیں، میں آپ کو بچا لوں گا۔“ میں نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

میری اس بات پر وہ ہنس پڑا پھر بولا۔ ”تھانے دار صاحب! میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ایک دن زلیخا کو روک کر اپنے جذبات اس تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلی شورش تھی لیکن بات ختم ہو گئی تھی۔ یہ ہمارا شغل ہوتا ہے۔ آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ میں نے زلیخا کو قتل کیا ہے۔“ اچانک اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں پھر وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔

یہاں یہ بات بتا دوں کہ میں نے زلیخا کی طرف سے خود ہی ایک درخواست لکھ کر رکھ لی تھی۔ ایسے چوہدریوں کی ہوا نکالنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے پروگرام کے مطابق میز کی دراز سے درخواست نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ جوں جوں درخواست پڑھتا جاتا تھا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ وہاں مجھے غرور کی تہہ میں چھپی پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔

”یہ..... سب کیا ہے تھانیدار صاحب؟“ اس نے طیش زدہ لہجے میں کہا۔

”میرے خیال میں آپ نے درخواست پڑھ لی ہو گی۔ اس لئے مجھے کسی اور طرف الجھانے کی بجائے یہ بتائیں کہ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ درخواست زلیخا کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔“ اس نے بڑی صفائی سے میرے سوال کے جواب سے بچتے ہوئے کہا۔ ”یہ کسی نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔“

لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھلی تھیں، اس لئے حکمے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”شاید آپ نے درخواست کو غور سے نہیں پڑھا لیکن ٹھہریے پہلے آپ یہ بات بتائیں کہ آپ کو یہ شک کیوں ہے کہ درخواست مقتولہ کی طرف سے نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ یہ درخواست اس نے قتل سے چند دن پہلے دی تھی۔“

”میری معلومات کے مطابق وہ سائن کرتی تھی لیکن اس درخواست پر انگوٹھا لگا ہوا ہے۔“ اس نے غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ یہی ٹیکنیک غلطی ہم نے درخواست میں کی تھی۔

”چوہدری صاحب! آپ تو بڑے چھپے رستم

لئے اسے اللہ کی کروانی پڑیں گی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جیسی، میں نے اس کے پیٹ سے سب کچھ اُگلوا لیا ہے۔ اب وہ خالی پیٹ ہے۔“ میں نے ہتے ہوئے کہا۔

”چھ؟“

سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔
میرے خیال میں شرافت کو بلا لیا جائے۔ دیکھتے
ہیں وہ کتنے پانی میں ہے؟“

”تم سپاہی نواز اور ہیڈ کانسٹیبل ظفر کو بھیجو۔ وہ پوری حسداری کے ساتھ جائیں۔ اگر وہ جیل و جت سے کام لیتے ہیں تو اسے باقاعدہ تھکڑی لگا کر لے آئیں۔“

”لگتا ہے، آپ کو یقین کی حد تک شک ہے کہ یہ قتل اس نے ہی کیا ہے؟“

”بہار تو کام ہی شک پر چلتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال دیکھتے ہیں پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔“

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد شرافت میرے سامنے تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ سپاہی نے مجھے بتایا کہ یہ آئیں بائیں شاخیں کر رہا تھا۔ کہتا تھا تم جاؤ، میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں لیکن جب ہیڈ کوارٹریسیل ظفر نے جھکڑی سامنے کی تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ میں چلتا ہوں، مجھے جھکڑی نہ لگاؤ۔

”ہاں، تو جناب! سنا ہے آپ بہت جیدار ہیں۔
 ”نہیں۔ تو آنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔“

”میں نے اس کی کانپتی ٹانگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”میں کب آنے سے انکاری تھا۔“ اس نے رو

بچے والے آواز میں کہا۔ ”میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ
میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔ میری طبیعت خراب ہے۔“

نہیں — نے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“

”اگر میں اسے قتل کرتا تو سب سے پہلے اس کی عزت تار تار کرتا۔ اس کے بعد اس کے سینے میں اپنے پستول کی چھ کی چھ گولیاں اتار دیتا۔ میں نے تو لاہور سے واپس آ کر یہ کام کرنا تھا۔ پتہ نہیں میں کیا کیا کرتا کیونکہ اس نے اپنی سسکی کے سانسے میرے منہ پر پھپھر مار دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے چوہدری صاحب!“ میں نے اسے دلا سہ دیا۔ ”آپ ذرا کچھ دقت ہمارے پاس گزاریں۔ آپ سے پھر میں بات کروں گا۔“

”کیا مطلب، کیا آپ مجھے حوالات میں بند کریں گے؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ، نہیں نہیں..... چوہدری صاحب! آپ ذرا ساتھ والے کمرے میں تشریف رکھیں۔“

”ٹھیک ہے، آپ اپنا ٹھکانہ رفع کر لیں۔“ اس نے ٹھنڈا پڑتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ بھی آپ کے ساتھ واسطہ رہے گا اور ہم دوستوں کے دوست ہیں۔ جس نے ہمارے ساتھ دشمنی رکھی ہے وہ پریشان ہی رہا ہے۔“

میں نے اس کا یہ ارہی میں ہی اڑا دیا۔ پھر میں نے بیٹے کا فیصلہ رفاقت کو باکر افضل کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ چوہدری صاحب کے لئے چائے پانی کا بندوبست کر دو۔ یہ سب میں اس لئے کر رہا تھا کہ چوہدری نے اپنے خلاف سارے شک رفع کر دیئے تھے۔ اس کو تھانے میں روکنے کی وجہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ جو نعمی رفاقت چوہدری کو لے کر باہر نکلا اے ایس آئی کرے میں دعا ہے ہوا۔

”آؤ بھئی میں ابھی نہیں ہی بلانے لگا تھا۔“
میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”سر! افضل نے کچھ اگلا یا اس سے اگلو انے کے

دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنانے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکے گا۔“

”تھانیدار صاحب! میں واقعی بہت بُرا ہوں..... جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ میں نے ہی اپنی بھابی کو مارا ہے۔ مجھے پھانسی سے کم سزا نہ دلوائیں بلکہ میں سوچتا ہوں کہ آپ مجھے تھانے کے شکن میں ہی زندہ دفن کروا دیں۔ چند دنوں بعد میرا باپ جیسا بھائی آ رہا ہے، میں اس کا سامنا کیسے کروں گا؟“ اس کے بعد وہ بلک بلک کر رو دیا۔

پھر اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا جو میں اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ شفقت کا بھائی رشید روزی روٹی کی تلاش میں باہر گیا ہوا تھا وہ وہاں سے پیسے باقاعدگی سے اپنی بیوی کے نام بھیجتا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ بینک کے ذریعے نہیں بھیجے۔ شاید یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی کہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال زلیخا خود تو بینک میں جاتی نہیں تھی۔ ہر مہینے آنے والی رقم اپنے دیور کے ہاتھ میں رکھتی اور اسے کہتی کہ جا کر بینک میں جمع کروا دو۔ سب سے پہلے آنے والی رقم سے شفقت نے اپنی بھابی کا اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ جتنی رقم کی ضرورت ہوتی تھی، وہ چیک لکھ کر دیتی تھی کہ وہ بینک سے رقم نکلا کر لے آئے۔

چوہدری افضل کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ چوہدری افضل عیاش بندہ تھا۔ بازاری عورتوں سے اس کے تعلقات تھے۔ شفقت بھی اس دوستی میں ایک طرح دار عورت شازیہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے اس نے رقم میں ہیرا پھیری شروع کر دی۔ یہ عشق اور بازاری عورت کی دوستی ایک ایسی دلدل ہے جس میں انسان دھنستا چلا جاتا ہے۔ وہ ان چیزوں میں ڈوب کر انجام سے بے خبر ہو جاتا

میں خواہ مخواہ ہنس پڑا پھر اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم اداکار بہت اچھے ہو۔ ذریعہ تو بتاؤ۔ تمہیں تکلیف کیا ہے اور کس ڈاکٹر سے اپنا علاج کروا رہے ہو؟“

”جناب! کسی خاص ڈاکٹر سے نہیں، بس جوں جائے۔“ میں نے صاف دیکھ لیا کہ اس کی ہمت جواب دینے والی ہے۔ جب اس کو میرے کمرے میں لایا گیا تھا تو میں نے تاڑ لیا تھا کہ یہی ہمارا مطلوبہ بندہ ہے۔ میں نے نظروں کو مخصوص اشارہ کیا، اس نے اتنی زور سے اس کی کمر پر لات رسید کی کہ وہ سیدھا میری میز پر آ کر گرانظفر نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا ہے اور اس سے خون رس رہا ہے۔

”ابھی مزید کسی دوائی کی ضرورت ہے یا تمہاری بیماری دور ہوگی ہے؟“ میں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کیا کیا ہے تھانیدار صاحب؟ آپ مجھ مسکین پر یہ ظلم کیوں کروا رہے ہیں؟ میں واقعی بیمار ہوں۔ کئی دنوں سے بے خوابی کا شکار ہوں۔“ وہ رونے لگا۔

”پہلے تمہیں نیند آتی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”جی جی..... مم میں.....“ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

”اگر تم پہلے دن ہی مگر چھ کے آنسو بہانے کی بجائے اقرار جرم کر لیتے تو آج تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔“ میں نے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکالتے ہوئے کہا۔

”اقرار جرم؟“ اس نے زیر لب ذہرایا۔

”بالکل تمہاری بہتری اسی میں ہے۔“ میں نے

دیتا ہے جس سے نور اتوائانی بحال ہو جاتی ہے۔

فائدہ یا روزہ کے دوران خون میں 80 ملی گرام سے 120 ملی گرام گلوکوز ہو جاتی ہے۔ جب کھانے کے بعد یہ مقدار بڑھ کر 120 سے 180 ملی گرام خون کے 100 ملی لیٹر میں پائی جاتی ہے۔ کھجور کے درخت کے ساتھ پھل لگنے اور پکنے تک اس میں کیمیائی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ جب کھجور پکنے پر آتی ہے تو اس میں خشک مادے کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ مٹھاس کی مقدار 22 سے بڑھ کر 47 فیصد ہو جاتی ہے۔

سو گرام کھجور کے اندر موجود غذائیت درج ذیل ہیں:

پانی 15.3%، پروٹین 2.5%، چکنائی 0.3%، معدنی اجزاء 2.1%، ریشے 3.9%، کاربوہائیڈریٹس + کلوریز 317%۔

کھجور میں پائے جانے والے نمکیات اور وٹامن کا تناسب کچھ اس طرح ہے:

نمکیات 2.1%، کیلشیم 120 ملی گرام، آئرن 7.3 ملی گرام، فاسفورس 50 ملی گرام، وٹامن سی 3 ملی گرام، وٹامن بی 0.5%۔ ان اجزاء کے علاوہ کھجور میں کیلشیم، میگنیشیم اور نشاستہ بھی موجود ہے۔ جب ہم کھجور کھاتے ہیں تو (خصوصاً خالی معدہ) تو اس کی مٹھاس لعاب دار جھلی میں جذب ہو کر گلوکوز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کھجور ایک متوازن غذا بھی ہے اور دوا بھی۔ جگر، معدہ کے امراض میں مبتلا افراد پانچ چھ عدد کھجوریں گٹھلیاں نکال کر گرینڈ کر کے پاؤ بھر دودھ ملائیں۔ صبح و شام استعمال کریں اور اس نعمت خداوندی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی صحت کو بھی برقرار رکھیں۔



ہوتی تھیں اور بچے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اب تو افطاری میں بھی چٹ پٹے کھانے ہی ہوتے ہیں۔ کھجور کو سنت سمجھ کر کھایا جاتا ہے۔ اس طرح کھجور کو ٹائپو حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جب سے ہم نے قدرتی غذائیں چھوڑ کر مصنوعی اشیاء کھانی شروع کی ہیں ہر فرد کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کھجور کے اندر بڑی مقدار میں پوٹاشیم، شکر اور کاربوہائیڈریٹ پایا جاتا ہے۔ کھجور بھوک کو مٹاتی ہے اور نظام ہضم کو بہتر کرتی ہے۔ اس میں چکنائی اور کولیسٹرول نہیں پایا جاتا۔ کھجور پوٹاشیم اور وٹامن بی-6 حاصل کرنے کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔

قرآن مجید میں اٹھائیس مقامات پر کھجور کا ذکر مختلف حوالوں سے فرمایا گیا ہے۔ کتب حدیث میں سینکڑوں مقامات پر کھجور کی افادیت بیان کی گئی ہے اور اس کی غذائی اور طبی منفعت بیان کی گئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھجور سے روزہ افطار فرماتے اور کھانے کی تلقین فرماتے۔ کھجور جسمانی نقاہت کو دور کرتی ہے۔ افطاری کے وقت جب بھوک بیدار ہوتی ہے تو کھانے کی خواہش سے ہی منہ اور معدے میں مخصوص قسم کی رطوبات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی منہ سے Hunger Julla ٹپکنا شروع ہو جاتے ہیں جسے Conditioned Reflex کا نام دیا گیا ہے۔

معدہ کا کام غذا کو روکے رکھنا یا ذخیرہ کرنا ہے۔ معدہ غذا کو روک کر تھوڑی تھوڑی مقدار میں آنتوں کو بھیجتا رہتا ہے اس دوران Hydrochloric Acid نشاستہ والی غذاؤں کو Glucose میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خالی معدہ یا افطاری کے وقت کھجوریں کھانے اور چبانے کے دوران لعاب وٹن میں موجود ایک جوہر جو کھجور میں موجود ہے اس کو Glucose میں تبدیل کر

تمام ساتھیوں کی عجیب حالت تھی وہ آنسو بہاتے، اور گرد و حیران نظروں سے دیکھتے اور باقاعدہ ہچکیاں لیتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہے تھے جیسے کسی ماریٹا مخلوق کے قبضے میں ہوں۔

دیارِ حرم کو چلے

سفر نامہ



پہاڑی کیکر جیسی جھاڑیاں نظر آتی ہیں، ان پر دھواں اور گرد و غبار کی تہہ جم گئی ہے اور اصل رنگ اور خدو خال چھپ گئے ہیں۔ چاروں طرف سنان اور کالے پہاڑ مست اونٹوں کی طرح گردن اکڑائے کھڑے ہیں۔ جہاں کوئی جھاڑیوں کا جھنڈ یا چھوٹا گھاس کا ٹکڑا نظر آتا ہے اس کے آس پاس بکریوں کے ریوڑ اور کافی تعداد میں اونٹ منہ مارتے اور سبزہ کی تلاش میں اونچی نیچی پہاڑیوں پر مڑگشت کرتے نظر آتے ہیں۔ نزدیک کوئی باقاعدہ آبادی نہیں ہے۔ البتہ چھوٹی چھوٹی بستیاں اور ٹکڑے گھر دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی طرف جاتی لنگ روڈ پر گاڑی یا انسانوں کی چہل پہل نہیں ہے۔ اکا دکا مکان بھی انتہائی مضبوط طرز تعمیر رکھتے ہیں۔ دو تین منزل سے زیادہ اونچائی نہیں ہے۔ کھڑکیاں چھوٹی لیکن ایک سیدھ میں اوپر نیچے ہیں جن میں شیشے لگے ہوتے ہیں۔ یہاں لان کا تصور نہیں ہے جس کی وجہ موسم کی شدت اور اپنی ذاتی زندگی تک محدود رہنا ہے۔ یہ لوگ اپنی ٹیلی کے ساتھ بند کمروں میں اے سی ٹی ٹھنڈک میں خوش رہتے ہیں۔ ملکی حالات اور سیاست سے دلچسپی نہیں ہے بس آرام پسند ہیں۔

شاہراہ ہجرہ مین روے اور اطراف میں کھلی ہے اور فن کاریگری کا اعلیٰ نمونہ ہے بلکہ ملک کے جس حصے میں ملے جائیں اس طرز کی سڑکوں کا چال بچھا ہوا ہے لیکن ارد گرد سبزہ، درخت، مختلف فصلیں اور ان کی مخصوص مسکور کن خوشبو، کھیتوں میں کام کرتے کسان اور بارش آبادیاں دل کو بھانے کے لئے موجود نہیں ہیں۔ پولیس فورس اور ایمر جنسی سروس کے لئے ٹیلی فون سروس کی سہولت بھی نہیں ہے۔ راستے کے پٹرول پمپ، درکشاپس اور مساجد دیرانے میں ہونے کی وجہ سے ایسا منظر پیش کر رہی ہیں جیسے صدیوں سے کوئی ذبی روح نہیں آیا۔ راستے میں ڈرائیور نے ایک ہوٹل پر اہل

صبح کی نماز کے بعد ہوٹل واپس آئے تو ایک کھلے احاطہ میں بیس قطار میں کھڑی تھیں گویا ایک پورا قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا اور بیک اٹھا کر نیچے لے آئے۔ اپنے گروپ نمبر والی بس تلاش کی اور عورتوں کو اندر بٹھا دیا۔ جب سامان لوڈ ہو گیا تو ہم تسلی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر بعد معلم کا نمائندہ آ گیا اس نے سب حاجیوں کو اپنی سیٹوں پر بیٹھنے کو کہا۔ گنتی مکمل کرنے کے بعد پاسپورٹ حوالے کئے، نام لے کر چیک کیا اور پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لئے۔ ڈرائیور کو سب حاجیوں کے نام کی لسٹ تھما دی گئی اور بیس آہستہ آہستہ ریگنے لگیں۔ دن وے ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر چکر کالے اور آخر شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں مدینہ منورہ کا بورڈ اور تیر کا نشان نظر آرہے تھے۔ اس سڑک کو شاہراہ ہجرہ کہتے ہیں اسی راستے پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے تقریباً نو دن اور نو راتیں سفر کرتے ہوئے مدینہ المنورہ پہنچے تھے اور آج دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے۔ انجینئرز اور ماہر شاہرات حیران ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کسی آلہ یا جدید مشین سے مدد لئے بغیر جو راستہ اختیار کیا گیا یہ مختصر ترین ہے۔

پرانی آبادی سے باہر آئیں تو مکہ کے مضافات میں سڑک کے بائیں طرف ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار ہے۔ جس مقام پر حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکاح ہوا، قبر وہیں پر ہے۔ سفید رنگ کی چار دیواری پر لوہے کی جالی اور دروازہ پر تالہ لگا رہتا ہے۔ دوران سفر چلتی بس سے فاتحہ خوانی کی۔

ساڑھے چار سو کلومیٹر لمبی یہ سڑک دیران، بخر اور بے رونق ہے۔ دور تک کھتی باڑی یا سبزہ کا نشان تک نہیں ہے۔ میلوں سفر کے بعد انسانی قد کے برابر

علاوہ مختلف مقامات اور مساجد کی زیارات ہیں جو ایک ہی دن چند گھنٹوں میں کی جاسکتی ہیں۔

مسجد نبوی

مسجد نبوی ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن، شوق فراوان کی منزل، اذلیل اور ذوق وجدان کا قبلہ مقصود ہے۔ اس کی زیارت سے آنکھوں کو تازگی، ایمان و یقین کو بالیدگی اور دل کو سکون و قرار کی دولت نصیب ہوتی ہے اور اس کی قدسی فضاؤں میں داخل ہو کر ایک باصفا مسلمان سب کچھ بھول جاتا ہے اور کیف و سرور کی ایسی انوکھی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے جس کو الفاظ و کلمات کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ جب مدینہ طیبہ میں ایک نئی اسلامی بستی وجود میں آئی اور اس میں اسلامی روایات کی داغ بیل ڈالی گئی تو ایک مسجد کی ضرورت محسوس ہونے لگی چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذلیل فرصت میں اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دی۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ مقامی باشندے تھے۔ اپنی ذات میں سراپا تحریک، انتہائی پُر جوش اور رضا کار قسم کے بندے تھے، ان کے تعادان سے دو یتیم بچوں سمیل اور سہل سے زمین خریدی گئی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی گرہ سے یہ قیمت ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ زمین کے اس بے آباد ٹکڑے کے کھڈرات، نا، موار گڑھے، ہموار کر دیئے گئے اور کھجور کے درخت کاٹ کر قبلے کی طرف دیوار کی شکل میں گاڑ دیئے گئے۔ پتھروں کی چٹائی سے دونوں طرف ستون بنا دیئے گئے۔ اس کے بعد باقاعدہ تعمیر شروع ہوئی تو حضور کام کرنے والوں میں باقاعدہ شامل رہے۔

اپنے دور میں سلطان محمود خان نے نئی تعمیر کے لئے دنیا کے کونے کونے سے ماہر ترین ذہکار اور مہمار

روک لی، ہم بھی اتر آئے، کسی نے کھایا، چائے پی اور اور کوئی سگریٹ کے کش لگا کر دل بہلانے لگا۔ تمام ذرا نیورز ایک جگہ بیٹھ کر گپیں اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ہم ظہر تک مدینہ پہنچ کر باجماعت نماز کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے لیکن یہاں اتنی دیر ہو گئی کہ یہ سب ایک خواب بن گیا تھا۔

اب ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا، آدھا راستہ طے ہو چکا تھا کہ ایک جگہ سڑک کے قریب سو کے قریب بندروں کا غول نظر آیا جن میں ہر عمر اور جسامت کے بندر شامل تھے لیکن رنگ ایک جیسا بھورا تھا۔ جسمانی طور پر کمزور تھے کیونکہ یہاں پہاڑوں پر درختوں کے پتے ہیں نہ حشرات الارض ہیں۔ وہاں رہائش پذیر ایک پاکستانی نے بتایا تھا کہ یہ خوراک کی تلاش میں سڑکوں کے کنارے ہوٹلوں کے پچھواڑے تک آ جاتے ہیں وہاں انہیں پانی اور بچا کھچا کھانا بھی مل جاتا ہے۔ ایک جگہ رک کر ظہر کی نماز قصر ادا کی۔ اب اکا دکا کھجور کے باغات دکھائی دے رہے تھے، ہم مدینہ کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔ چند منٹ کے بعد مسجد نبوی کے مینار نظر آنے لگے تو ہم نے درود شریف کا درود شروع کر دیا۔ اب معلم کا نمائندہ بھی بس میں سوار ہو گیا اور ڈرائیور کی ہوٹل تک رہنمائی کی۔ بس اتر پورٹ روڈ پر مسجد نبوی کے قریب ایک بڑے پلازہ کے سامنے رک گئی۔ یہ ایک جدید طرز پر بالکل نیا تعمیر شدہ ہوٹل ہے۔ گراؤنڈ فلور پر دکانیں اور اندر کی طرف پانچ لفٹ ہیں۔ سولہ منزلہ ہوٹل اتنا قریب ہے کہ اذان کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ ہمیں کمرے بھی سیکنڈ فلور پر ملے۔ اب تمام سہمی خوش اور مطمئن تھے یہاں مکہ جیسی مصروفیات نہیں ہوتیں۔ جب تک قیام ہے باجماعت نماز کا اہتمام ضروری ہے عام طور پر یہاں چالیس نماز جماعت ادا کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے

موجودہ مسجد نبوی میں چھ لاکھ نمازی، نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کے چاروں طرف صحن اس کے علاوہ ہے۔ شفاف و منفصل ستونوں پر بنائی گئی تانبے کی جالیاں، ان میں نصب رنگین شیشے کمال فن کا ایسا نمونہ ہیں جن کی مثال ناپید ہے۔ جب ان پر آویزاں قدیمیں فردزاں کی جاتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رنگ و نور کا سیلاب آ گیا ہے۔ زائر وہاں پہنچ کر پہلے ہی محبت کی رنگین وادیوں میں گم ہو چکا ہوتا ہے یہ پرنور ماحول اس کی محبت اور بے خودی میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

عربی طرز کی کھڑکیاں، قیمتی دروازے اور ان پر سجائی گئی حیرت انگیز ڈاٹس یا قوسیں قدیم و جدید آرٹ کے اعتبار سے فن کی معراج پر ہیں۔ جگہ جگہ دیدہ زیب بڑے بڑے گنبد بنائے گئے ہیں جن کی اندرونی سطح پر بیلوں پر چتر کاری کا کام ہے۔ یہ دیوہیکل گنبد اپنی جگہ سے ہٹ کر مسجد کے اندرونی حصہ میں تازہ ہوا، دھوپ اور روشنی فراہم کرتے ہیں۔ چھت کی اوپری سطح پر بھاری موٹریں لگائی گئی ہیں جو یہ سارا مشقت بھرا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ میں کئی بار چھت پر خاص طور پر جمعۃ المبارک کی نماز کے لئے گیا لیکن یہ بھاری بھر کم موٹریں نظر کے سامنے نہ آ سکیں یوں جانے وہاں کا ہر کام نرالا اور حیرت میں ڈال دینے والا ہے۔ ہر ستون کی جڑ سے ذیرائن دار چھوٹی ٹکڑے نما جالیوں سے ٹھنڈی ہوائیں جیتی دوپہر اور شدت کی گزری میں طمانیت دے رہی ہیں جس کے لئے دنیا کا سب سے بڑا انرکنڈیشنڈ پلانٹ مدینہ کی آبادی سے باہر لگایا گیا ہے۔ یہاں شہری رنگ کا جیتل استعمال کیا گیا ہے جو ہمارے سونے کو بھی شرماتا ہے۔ روشنی کا اصل مرکز چھت پر سینکڑوں کی تعداد میں لگائے گئے فانوس ہیں جو گول شکل میں ہیں اور ان پر مختلف رنگ کی لائیں

بلائے جنہوں نے اپنے فن کو عروج پر پہنچا کر مسجد نبوی کی شکل میں ایسا شاہکار تخلیق کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے روضہ اطہر کی تجدید و تعمیر کرائی اور 1255 ہجری میں اس پر نظر افروز سبز رنگ کرایا جو آج تک اہل نظر کے لئے فردوسِ نظر بنا ہوا ہے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے انوکھی روحانی مسرت کا باعث ہے۔ سلطان عبدالعزیز بن سعود نے ضرورت وقت اور نئے دور کے تقاضوں کے مطابق شایانِ شان توسیع کے لئے جدید مشینری منگوانے اور تعمیری منصوبہ بندی پر سنجیدگی اور سرگرمی سے عمل کیا۔ عمارت ایسی دلکش، عايشان اور حسین ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ چپے چپے میں جمال و رعنائی کی رفتیں سرسبز ہیں اور جہانِ نور کی رونقیں شاد و آباد ہیں۔ اب تک کی تعمیرات فنی نقطہ نظر سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ہنرمندوں نے مہارت و دسترس اور فنی صلاحیت کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ ہر کوئی تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کئی سال پہلے جب میں پہلی بار حاضری کا شرف حاصل کر رہا تھا تو اس وقت ترکوں کی بنائی گئی مسجد نبوی کے علاوہ کچھ اضافہ موجودہ سعودی حکومت نے کیا تھا جو شروع سے ایک خاندان کے مختلف فرماں روا بدلتے آ رہے ہیں وہ بالکل ناکافی تھا۔ حج کے دنوں میں عارضی طور پر سایہ کے لئے چھو لدریاں تان کر نمازیوں کے لئے سہولت دی گئی تھی۔ اس وقت عمرہ کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا، یوں قافلہ پر قافلہ رواں گئی والی بات نہ تھی بلکہ خود میرے علم میں اس سفر اور سہولت کی معلومات نہ تھیں۔ البتہ اس وقت ستون ضرور کھڑے تھے، کسی حد تک اضافی تعمیر کا کام شروع تھا لیکن حج کے یزین کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ میں نے چند سال کے وقفہ کے بعد دیکھا تو مسجد کا اضافی کام مکمل ہو چکا تھا۔

لگائی گئی ہیں۔
ہم نے عورتوں کو سمجھا کر ان کے مخصوص دروازہ پر پھوڑا اور مسجد نبوی کے باب الملک فہد سے داخل ہو گئے۔ خوش قسمتی سے یہ مرکزی دروازہ ہمارے ہوٹل سے چند منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ سڑک کراس کرنا اور ٹریفک کے خطرہ سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔ نفل تحشیہ المسجد ادا کر کے عبادت کی ابتدا کی۔ کچھ وقت تسبیح پر وارد کرتے رہے اور نماز عصر باجماعت ادا کی۔ درود شریف پڑھتے ہوئے روضہ اطہر کی طرف چل دیئے۔ تمام ساتھیوں کی عجیب حالت تھی وہ آنسو بہاتے، ارد گرد حیران نظروں سے دیکھتے اور باقاعدہ ہچکیاں لیتے ہوئے لڑکھراتے قدموں سے چل رہے تھے جیسے کسی مادرائی مخلوق کے قبضے میں ہوں۔ آخر روضہ مبارک کے سامنے بڑے گول سوراخ کے سامنے آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں سلام کا تحفہ پیش کیا۔ اگلے قدم پر چھوٹے سوراخ کے سامنے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا چہرہ مبارک ہے، وہاں سلام پیش کیا اور اگلے قدم پر خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ اب چند قدم آگے بڑھ کر چاروں فرشتوں پر سلام بھیجا۔ دائیں طرف کی دیوار میں چھت سے ذرہ نیچے چوکور گرل لگی ہے گویا کھڑکی ہو۔ یہاں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تھے یہ جگہ اب بھی خالی چھوڑی گئی ہے، یہاں دو نفل عبادت ادا کئے اور باب البقیع سے باہر نکل آئے۔ پیچھے مڑنے کی اجازت نہیں ہے یوں افراتفری مچ جاتی ہے۔

ایک دوسرے دروازہ سے مسجد میں داخل ہو کر باب الملک فہد سے باہر آ کر عورتوں کو ساتھ لیا۔
اب ہر نماز کا باجماعت اہتمام تو ہمارا اذیلین مشن تھا جس پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ ساتھیوں کی

حضرت طلحہ کا کنواں

یہ باب فہد سے مسجد نبوی میں داخل ہوں تو تقریباً 15 میٹر مسجد کے اندر واقع ہے۔ فرش پر تین دائرے بنائے گئے ہیں لیکن اب ان کو قالین سے ڈھک دیا گیا ہے۔ خدام کی نظر بچا کر قالین اٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کنویں پر کئی بار تشریف لائے اور اس کا پانی پیا۔ دراصل یہ کنواں اور قرہنی باغ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملکیت تھا۔ جب انہوں نے اللہ کا یہ فرمان سنا کہ ”جب تک اعلیٰ تقویٰ حاصل نہیں کر سکتے جب تک سب سے پسندیدہ شے اللہ کی راہ میں دے دو“ تو یہ کنواں اور ملحقہ باغ بطور صدقہ دے دیا تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ اس کی زیارت کے بعد آگے چل پڑے۔

اصحاب صفہ

بابل جبرائیل سے دائیں طرف اصحاب صفہ کا تھڑا ہے۔ وہ مسلمان جن کا کوئی گھر بار نہ تھا، یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم حاصل کرتے اور وقتاً فوقتاً تبلیغ اسلام کے لئے دوسرے مقامات پر جاتے رہتے تھے، ان کی زندگی میں فقر و سادگی اور دنیاوی چیزوں سے بے نیازی اور بے تعلقی پائی جاتی تھی۔ اب زائرین کافی تعداد میں نوافل اور تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے ہیں۔ ہم نے بھی رش کی وجہ سے تھوڑی جگہ نکال کر نوافل ادا کئے۔

ریاض الجنۃ

محراب نبوی، مصلیٰ رسولؐ

حدیث شریف میں آتا ہے ”جو جگہ میرے گھر اور منبر کے درمیان ہے، وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔“ اس کے میں ستون ہیں جن میں چند خاص ہیں۔ یہاں نماز پڑھنا، جنت میں نماز پڑھنا ہے۔ اس کے فرش پر کریم کلر قالین بچھے ہوئے ہیں جبکہ مسجد کے دوسرے حصوں میں سرخ رنگ کے ہیں۔ یہاں بغیر شمار کئے نوافل ادا کئے اور دعا مانگتے ہوئے اپنی خوش قسمتی پر اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ قیامت کے دن زمین کا یہ ٹکڑا جنت میں چلا جائے گا۔ حالانکہ اس دن زمین و آسمان ختم کر دیئے جائیں گے۔

استوانہ حنائی

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہاں کھجور کا ایک تنہا جس سے آپؐ ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر شریف تیار ہو گیا تو اس درخت سے ایسے رونے کی آواز آئی جیسے اونٹنی کی ہوتی ہے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر شریف پر جلوہ افروز ہوئے تھے تو وہ درخت جدائی میں رو رہا تھا۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اسے ستون! تجھے اپنی جگہ پر چھوڑ دوں تو ہرا بھرا ہو جائے، لوگ تیرا پھل کھائیں۔ اگر تو چاہے تو دعا کروں، تجھے بہشت بریں میں لگوا دوں تاکہ جنت کے چشموں اور نہروں سے سیراب ہو، جنتی تیرا پھل کھائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو فرمایا کہ ستون نے جنت کی ابدی زندگی چاہی ہے۔ اس کے بعد اسے دفن کر دیا گیا۔ یہاں قریب کھڑے ہو کر دعائیں مانگیں اور خیر و برکت چاہی۔

یہ ریاض الجنۃ میں ہے یہاں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر امامت فرمایا کرتے تھے۔ آج یہاں ایک خوبصورت محراب بنا دی گئی ہے۔ آپؐ کے وصال کے بعد متبرک جگہ کی تعظیم کو برقرار رکھنے کی غرض سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قدم مبارک کی جگہ چھوڑ کر باقی جگہ پر دیوار بنوا دی تھی تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جدہ کرنے کی جگہ لوگوں کے قدموں سے محفوظ رہے۔ ہم نے یہاں دعا مانگ لی کیونکہ یہاں نفل پڑھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ادب کا مقام ہے، دھینگا مشتی بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے بعد میں کئی موقعوں پر یہاں نوافل ادا کرنے کا شرف حاصل کیا۔ جو محراب اس وقت موجود ہے وہ نوٹ سنگ مرمر کے ایک ہی ٹکڑے کی ہے جس پر سونے کے پانی سے خوبصورت مینا کاری کی گئی ہے۔ دونوں جانب سرخ رنگ میں سنگ مرمر کے بے مثال ستون بنے ہوئے ہیں۔ محراب کے اوپر وہ آیت لکھی گئی ہے جس میں درود پاک پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رمضان المبارک میں امام صاحب اسی محراب میں کھڑے ہوتے ہیں۔

استوانہ عائشہؓ

اس ستون کی جگہ کے بارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری مسجد میں اس جگہ نماز پڑھنے کی فضیلت معلوم ہو جائے تو قرعہ اندازی کے بغیر وہاں کسی کو جگہ نہ ملے۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا جو پوری امت کے لئے باعث برکت ہے۔

ہے اور مکبر بھی وہیں کھڑا ہوتا ہے۔

اس کے بعد استوانہ سریر، استوانہ حرس، استوانہ دُود، استوانہ جبرائیل اور استوانہ تہجد کی زیارت کرتے دعائیں مانگتے آگے بڑھ گئے۔ ان میں کچھ ستون ایسے بھی ہیں جو موجودہ روضہ اطہر کے اندر یا دیواروں میں گئے ہیں۔

جائے پرنالہ حضرت عباسؓ

اب ہمارا رخ باب السلام کی طرف تھا یہاں پر پرنالہ تھا۔ پہلے یہ پرنالہ مسجد نبوی سے ملحقہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کے مکان کی چھت پر تھا۔ اس سے گرنے والے پانی سے مسجد نبوی میں آنے والوں کے کپڑے خراب ہوتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر پرنالہ اکھاڑ دیا گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھوں پر سوار ہو کر اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے پرنالہ کو اسی جگہ لگوا دیا۔ چھوٹا سا جالی دار یہ نشان اب بھی موجود ہے۔ سب ساتھیوں کو زیارت کرائی۔

ابوبکرؓ کا گھر

منبر سے باب صدیق کی طرف پانچویں ستون کے بعد آپ کا گھر تھا۔ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن گھروں کے دروازے مسجد نبوی میں ٹھٹھتے ہیں، بند کر دیے جائیں، سوائے حضرت ابوبکر صدیق کے گھر کا دروازہ۔ یہ اس بات کی پیشگوئی تھی کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہوں گے۔ یہاں کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ حضرت عباس ان

استوانہ توبہ

حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو ایک غزوہ کے موقع پر کافروں سے مذاکرات کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے ایک جنگی راز آؤٹ کر دیا۔ اپنی خطا کا احساس ہوتے ہی واپس آ کر خود کو اس ستون سے زنجیروں سے بندھا دیا کہ جب تک میرے آقا معاف کر کے نہیں کھولیں گے، بندھا رہوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک اللہ کریم کی طرف سے حکم نہیں آئے گا میں بھی نہیں کھولوں گا۔ چنانچہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ کئی روز تک اسی ستون سے بندھے رہے۔ نماز اور حاجت کے اوقات میں ان کی زوجہ محترمہ کھول دیتی تھیں۔ ایک دن حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا اٹھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ابولبابہ کی دعا رب کریم نے سن لی ہے۔ صحابہ کرام کھولنے کو دوڑے مگر ابولبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اب یہ زنجیریں تاجدارِ مدنی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے کھولیں گے۔ یہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی یادگار ہے۔ یہاں کی زیارت اور دعا مانگنے کے بعد آگے بڑھ گئے۔

مؤذنہ بلالؓ

مسجد نبوی میں منبر کے سامنے سفید ستونوں پر قائم چبوترہ ہے۔ حالیہ دور میں بھی اسی چبوترہ پر اذان دی جاتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں خطبہ جمعۃ المبارک کے وقت اس جگہ اذان دیتے تھے۔ ترکی دور میں یہ جگہ اس طرح تعمیر کر کے نشاندہی کر دی گئی۔ اب ہر نماز کی اذان مؤذن اسی چبوترے کی چھت پر کھڑے ہو کر دیتا

گئے۔ اب واپسی کا راستہ اختیار کیا اور چھوٹے راستے پر ہو گئے۔ حضرت عقیل بن ابوطالب اور عبداللہ بن جعفر طیار کی قبور مبارک سے ہوتے ہوئے گیٹ کے بائیں طرف آگئے یہاں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو چھوٹی چھوٹی قبور مبارک ہیں۔

جنت البقیع

سب کی فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے تو ساتھی آپس میں ٹھہر ٹھہر کر تے نظر آئے۔ میرے استفسار پر بتایا کہ ہم سب تمہاری یادداشت کی بات کر رہے ہیں کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود ساری قبور کی ترتیب اور نام یاد ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ تم نے میری صلاحیت کو تسلیم کیا ہے اور یہ سچی بات ہے کہ ترتیب اور ناموں کے ساتھ یاد رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ میرا شوق ہے کہ یہ سب اور دوسری زیارات کے بارے میں معلومات ذہن کی محنت پر تازہ رہتی ہیں۔ ہم بھی تعریف سن کر تھوڑا پھول گئے اور تھکاوٹ بھی دور ہو گئی اور چہرے پر خواہ مخواہ مسکراہٹ آ گئی۔ اب ہم نے گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر تمام اہل قبور کے لئے اجتماعی دعا مانگی اور پھر واپسی کی راہ لی۔

مسجد قبا

حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر اس مقام پر قیام فرمایا اور مسجد کی تعمیر کی۔ یہ مدینہ کی آبادی سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم نے فجر کی نماز کے بعد چھوٹی کوچ کے ذریعہ سے کرایہ طے کیا اور با وضو چل پڑے۔ میں فرہٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ذرا نیچر سے کچھ اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں باتیں کرتا گیا۔ وہ بڑا خوش اخلاق جوان تھا، نام صالح الخربلی تھا۔ حضور صلی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پیدل اور بھی سواری پر تشریف لایا کرتے تھے، میں نے خود بھی ایک بار پیدل سفر کیا ہے۔ یہاں دو نفل پڑھنے کا

عبدالمطلب کا مکان اس سے ملا ہوا تھا۔ تمام زیارات ایک ہی چمٹ کے نیچے ہیں۔ اس لئے تھکاوٹ نام کو نہ تھی، تمام ساتھی حاجی ہشاش بشاش دلچسپی اور عقیدت کے ساتھ چلتے رہے حالانکہ نماز ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔

نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ میں نے ساتھیوں کے ساتھ قریب کی زیارات پر حاضری کا سلسلہ جاری رکھا۔ فجر کی نماز کے بعد جنت البقیع جانے کا پروگرام بن گیا۔ مسجد نبوی سے باہر آ کر سبز گنبد کا نظارہ کر کے روحانی اور ذہنی سرور حاصل کیا اور مشرقی سمت چلتے گئے۔ سامنے یہ قبرستان ہے۔ اس میں کم از کم دس ہزار صحابہ کرام، اہمات المؤمنین، ازواج مطہرات اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے، صاحبزادیاں اور چھوٹے بھائی مدفون ہیں۔ عورتوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ بہت بڑا سریے کی جالی کا گیٹ ہے۔ اندر داخل ہوئے تو سامنے قدرے دائیں الگ احاطہ میں فاطمہ زہرہؓ، حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ، حضرت امام حسنؓ، زین العابدینؓ، جعفر صادقؓ اور امام باقرؓ کی قبور مبارک ہیں۔ بائیں طرف تین صاحبزادیوں اور ساتھ نو ازواج مطہرات پر الگ الگ فاتحہ خوانی کرتے آگے بڑھ گئے۔ چند قدم آگے امام مالکؓ اور قاری تافح مدنیؓ کی قبریں ہیں۔ چند قدم آگے بائیں طرف اکیلی قبر صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ اور شہدائے حرہ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی۔ سامنے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ یہاں تاریخی قبرستان کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اب بائیں طرف والی حلیہ مسجد بنیہ اور چند قدم آگے ایک ہی احاطہ میں فاطمہ بنت اسدؓ والدہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوسعید خدریؓ کی قبور مبارک ہیں۔ سب پر فردا فردا فاتحہ خوانی کرتے

قائد اعظم کے اقوال

☆ میں اقوام ایشیا اور بالخصوص مسلم اقوام میں ہم آہنگی، مقصد کی وحدت اور مکمل افہام و تفہیم کی ضرورت پر زور کیونکہ ایشیائی اتحاد عالمی امن اور خوشحال کے حصول میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ایرانی وفد سے گفتگو-9 اپریل 1948ء)

☆ بنگال کے لوگوں کے مجاہدانہ جذبے اور فوجی سپرٹ سے تاریخ کے صفحات اٹے پڑے ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں نے بنگال کی تاریخ میں جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں، وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔

(ایک فوجی پریڈ سے خطاب-20 مارچ 1948ء)

مرسلہ: ----- محمد احسان نذیر-نارنگ منڈی

ثواب ایک عمرہ کے برابر ہے۔ مسجد کی موجودہ نئی تعمیر نہایت عالیشان، وسیع اور مکمل اڑکنڈیشنڈ ہے۔ نہانے اور وضو کرنے کا نہایت اچھا انتظام ہے۔ ہم نے بے شمار اور جگہ بدل بدل کر نوافل ادا کئے اور باہم مشورہ سے صالح الحربی کوکل آنے کا کہہ دیا۔ یوں ہم مسلسل پانچ دن تک مسجد قبا جاتے رہے۔ وہ مجھے امیر یعنی گروپ لیڈر کہتا۔ اسی مسجد والی جگہ پر آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی بیٹھی تھی۔ پرانی مسجد شمال کے کونے میں تھی، دائیں طرف چار ستون اکٹھے ہیں۔ مسجد وسیع کر دی گئی ہے لیکن پرانے نشانات کی نشاندہی پرانے حاجی کرتے ہیں۔ یہ اسلام کی سب سے پہلی مسجد ہے جس کی بنیاد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔

مسجد جمعہ

مسجد قبا سے کچھ فاصلہ پر قبیلہ بنو سالم آباد تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر قبا کی بستی سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو جمعہ کا روز تھا۔ نماز کا وقت تھا۔ اس مقام پر آپ نے جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ مدینہ شریف میں آپ کا پہلا جمعہ تھا۔ اب وہاں جدید اور خوبصورت مسجد موجود ہے۔ ایک دن واپسی پر زیارت کے لئے آئے تو یہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بند ملی۔ ہم نے ہاتھ تھڑے پر سیزھیوں کے سامنے نفل ادا کئے اور دعا مانگتے ہوئے واپس آ گئے۔

وقت کے ساتھ یہاں کئی تبدیلیاں آمد تعمیرات ہوئی ہیں۔ پرانی عمارتیں مہار کی جا رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی عمارتوں کو گرا کر نئے پلازہ تعمیر کر دیئے گئے۔ کئی محلوں کا علیہ بدل گیا ہے۔ جب بھی گئے کئی حیرانیاں ہماری منتظر ہوتی ہیں۔ مسجد نبوی کے باب فہد کے سامنے سڑک کو چوڑا کر کے اطراف میں بیسیوں کی

تعداد میں جدید اور آسمان کی بلندی کو چھوتے پلازے تعمیر ہو گئے ہیں۔ کچھ تعمیر کے مختلف مراحل میں ہیں۔ مسجد نبوی کے چاروں اطراف میں زیر زمین حمام اور وضو کی بے شمار ٹوئیاں لگائی گئی ہیں۔ نیچے جانے اور اوپر آنے کے لئے سیزھیوں کے ساتھ خودکار برقی سیزھیوں کی سہولت موجود ہے۔ حمام تین حصوں یا منزلوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ جگہ جگہ براشیم کش خوشبودار لوشن کے ڈبے دیواروں کے ساتھ لگائے گئے ہیں جن کو پریس کرنے سے لوشن آسانی سے نکل آتا ہے اور ہم بھی بار بار ہاتھ دھوتے ہیں۔ حماموں کے ساتھ نیچے ایک الگ دنیا آباد ہے۔ بجلی کو کنٹرول کرنے اور تقسیم کا مکمل نظام نیچے ہے۔ ایک شفٹ میں ڈھائی سو کے قریب افراد کام کر رہے ہیں۔ آبادی سے کئی کلو میٹر دور جنریٹر بجلی پیدا کر رہے ہیں جسے زیر زمین یہاں تک پہنچا دیا گیا ہے اور ٹرانسمار کنٹرول کر رہے ہیں

کے موسم، ماحول اور پانی کی کمی کی وجہ سے خوشگوار اور مسکور کن نظارہ ہے۔ یہاں سکون، امن ہے کیونکہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی حلیم طبع، امن پسند اور خاموش طبیعت تھے۔

باب الملک فہد کے سامنے صحن کے پار پلازوں کے جھرمٹ میں چند سال پہلے خوبصورت، قابل دید اور منفرد طرز کی یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ یہ تیس مربع فٹ گولائی اور بیس فٹ کے قریب اونچے پتھر کو زمین پر ایسے رخ پر کھڑا کیا گیا ہے جیسے قدرتی چٹان کھڑی ہے۔ پتھر کے آخر میں اونچائی پر سعودی عرب کا جھنڈا اور دو تلواریں کراس کرتی ہوئی تراشی گئی ہیں جس پر کلمہ شریف تراش کر لکھا گیا ہے۔ گنبد خضرا اور مینار کا عکس بھی ابھارا گیا ہے۔ غور سے دیکھنے پر کھجور کا درخت اور شاخیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں یعنی پورے تشخص اور ثقافت کو واضح کیا گیا ہے۔

چٹان سے پانچ فٹ کے فاصلے پر گولائی میں پتھروں سے جنگلا بنایا گیا ہے۔ درمیانی چٹان اور جنگل میں پانی کے فوارے لگائے گئے ہیں۔ پتھر کو اتنی صفائی سے تراشائیت اور صبر کا کام ہے۔ کاریگروں کی ہمت، ہنرمندی اور پرکاری کی دلدی پتا پڑتی ہے۔ یہ منظر اس لحاظ سے قابل دید ہو گیا ہے کہ جنوب میں مسجد نبوی، خوبصورت طرز تعمیر رکھنے والے مینار، سامنے کی سڑک کے اطراف میں جدید سہولتوں اور آسائش سے مرصع سولہ سے بیس منزلہ پلازوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں چار کلو میٹر دور چوڑی سڑک کے اختتام پر جبل احد اپنی شان و شوکت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس یادگاری چٹان اور جنگل کے باہر سے چھوٹی اور پولیس کی گاڑیوں کے یوٹرن لینے کی سہولت موجود ہے۔ پرندے خاص طور پر جنگلی کبوتر فواروں کے پانی میں نہاتے اور پیاس بجھاتے ہیں میں انہیں بڑے دھیان سے دیکھتے ہوئے

اور ضرورت کے مطابق مختلف شعبوں میں بھیج رہے ہیں۔

مجھے سرگودھا کے شوکت اتفا قائل گئے جو پاکستان نبوی میں رہے، وہیں کورس کیا۔ جب یہاں مانگ ہوئی تو وہ ملازمت چھوڑ کر یہاں ٹرانسپارمر ریڈنگ آپریٹر بن گئے۔ انہوں نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ جب بھی مدینہ گئے تو ان سے ملاقات ہوتی ہے وہ اچھے میزبان ہیں۔ انہوں نے مسجد نبوی کے نیچے آباد دنیا کے حالات سے آگاہ کیا۔ حماموں کے ساتھ کار پارکنگ ہے جو اونچے دو حصوں میں ہے۔ یہاں پانچ ہزار گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش ہے۔ اندازہ کیجئے کہ گاڑیوں کو کھڑا کرنے اور دیگر دفاتر کے لئے پتھریلی زمین توڑنے کے لئے کتنے حوصلے اور توانائی کی ضرورت ہوگی لیکن موجودہ حکومت نے تصوراتی خاکے کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ یہاں بجلی فیمل ہوتی ہے نہ پانی کم پڑتا ہے۔ کہیں کوئی بلب فیوز نہیں دیکھا۔ ہر شعبے سے متعلقہ عملہ منظم طریقے سے اپنی ذیوبی سرانجام دے رہا ہے۔ بد نظمی، کاہلی اور شور شرابا کے نام سے کوئی واقف نہیں ہے۔ ہر کام بالاسن اور خوبصورتی سے سرانجام دیا جا رہا ہے۔

مکہ المکرمہ کی نسبت مدینہ المصورہ کی زمین ہموار اور زرخیز ہے۔ پہاڑیاں آبادی سے دور نظر آتی ہیں۔ یہاں سبزہ اور کھجور کے باغات کثرت سے ہیں جو آبادی کے اطراف اور درمیان میں موجود ہیں۔ سڑکوں کے ارد گرد چھوٹے قد کے پودے لگائے گئے ہیں جن کو مختلف انداز سے کاٹ چھانٹ کر خوبصورت اور پھولوں کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ کہیں پتھری جیسے بنے ہیں۔ ٹریفک کا اڑدھام اور ہلڈھول نہیں ہے بلکہ خاموشی اور روانی سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ بڑی سڑکوں پر قریب سے مصنوعی آبشاریں گرائی گئی ہیں جو یہاں

گزرتا ہوں۔

ایک دن جنگلی شکل و نسل کے ایک جیسے کبوتروں کے درمیان ایک سفید کبوتر کو جو دوسروں کی نسبت صحت مند، موٹا تازہ اور پھر تپتا تھا، کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ بڑے بڑے مڑے سے نہا رہا تھا اور ارد گرد کی گہما گہمی سے بے پروا بڑے رنگین موڈ میں پھیدکتا پھر رہا تھا۔ شاید اسے میری مداخلت پسند نہ آئی تھی۔ پروں سے پانی جھاڑا اور میرے دیکھتے دیکھتے اڑتا ہوا مسجد نبوی کے میناروں کے درمیان گم ہو گیا۔ میرے رکے ہوئے قدم بھی حرکت میں آ گئے۔ اس رنگ، نسل اور جسامت کا کبوتر کم از کم میں نے یہاں پہلی بار دیکھا تھا کیونکہ اس سرزمین پر صرف ہمارے ہاں مزاروں یا ویران مکانوں میں پائے جانے والی نسل و شکل کے کبوتر دکھائی دیتے ہیں۔ سفید رنگ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا پسند تھا۔ آپ پہننے میں سفید رنگ کو ترجیح دیتے تھے اور دیکھنے میں سبز رنگ بھاتا تھا۔ آپ کا فرمان ہے کہ نظر کو تیز اور خود کو تازہ رکھنا چاہیے ہو تو سبز رنگ اور ہتھ پانی کو دیکھو۔ بعد میں مدینہ المنورہ کے قیام کے دوران اس کبوتر کو دیکھنے کی حسرت رہی اور شاید رہے گی۔

سعودی عرب میں سرویوں میں بھی موسم گرم رہتا ہے۔ عام گرمی کے مہینوں میں ہمارے اندازوں سے زیادہ گرمی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ کبوتر کے علاوہ کم پرندے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک بار عمرہ کی ادائیگی کے دوران نومبر میں یہاں قیام رہا تب موسم قدرے خوشگوار اور گرمی کسی حد تک قابل برداشت تھی، کئی خودرو جھازیاں بھی جو بن پر تھیں۔

یہاں مزدوروں اور بے ہنر پاکستانیوں کو انتہائی بری حالت میں دیکھا ہے۔ مجھے اپنے قریبی گاؤں جمالی بلوچاں کے ریٹائرڈ فوجی بھائی ملے۔ ان سے

اکھی خاصی واقفیت اور سلام دعا ہوئی وہ کبھی میرے ہاتھوں پھوٹا موٹا سامان اور رقم گھر بھیج دیتے تھے اسے جو پشن ملی، وہ گھر والوں نے مکان بنانے کا خرچ کر دی جو کچھ بچا اس سے یا فرنیچر خرید لیا۔ یو وہ خالی ہاتھ ہو گئیں سید ذات تھے عورتیں پردہ دار تھیں گھر سے باہر نکل کر کوئی کام نہ کر سکتی تھیں، بچے اچھے پھوٹے اور زیر تعلیم تھے۔ ایک جانے والے احسان کرتے ہوئے سعودی عرب بھجوا دیا۔ وہ فوراً ڈرائیور تھے جلد ہی کام پر لگ گئے اور مناسب تنخواہ مقرر ہو گئی اور بلدیہ کی گاڑی چلانے لگے۔ بارہ کھٹے ڈیو تھی۔ ایئر کو مطلوبہ مقام پر چھوڑ کر وہ واقف پاکستانی اور علاقے سے آئے حاجیوں سے گپ شپ لگانے چلا جاتے۔

ایک پاکستانی جوان کو دین سے گیس سلنڈر اتار کر گھروں کی دوسری اور تیسری منزل تک کاندھے پر لاد کر پہنچاتے دیکھا اس کا لباس چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا اور کپڑوں کے رنگ کی پہچان بھی مشکل ہو گئی تھی۔ ایک درمیانی عمر کا پاکستانی ہول گئی چوتھی منزل کی کھڑکی آدھے دھڑ باہر لٹکے ہوئے درست کر رہا تھا، وہاں سے ہاتھ چھوٹ جانے سے توازن بگڑا تو سڑک پر آگرا۔ اوزار دور دور تک بکھرے پڑے تھے لیکن اس کی ہمت دیکھئے کہ اتنی بلندی سے گر کر ہڈیوں، گوشت اور خون کا مغلوبہ بننے کے باوجود زندہ تھا۔ ایک بار سر اٹھایا، شاید بیوی بچوں کی فکر تھی۔ پھر بے ہوش ہو گیا اس کا زندہ بچ جانا معجزہ ہوتا۔ ایبویلیس آئی اور اسے لے کر ہارن بجاتی چلی گئی۔ میں نے یہ سارا حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب کوئی یوں جان کی پرواہ کئے بغیر، خطروں سے کھیل رہا ہو تو گھر میں موجود ہر چھوٹے بڑے فرد کو یوں بے دردی سے رقم نہیں لٹانی چاہئے۔

مسجد ابو ذر غفاری

فکر مند ہو کر رونے لگے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ سے سر اٹھا کر فرمایا کہ تو فکر مند نہ ہو، مجھے جبرائیل علیہ السلام نے بتایا ہے جو کوئی مجھ پر درود بھیجے گا اس پر میں یعنی اللہ تعالیٰ سلام و صلوة بھیجیں گے۔ میں نے اس شکرانے کا لبا سجدہ کیا ہے۔ بڑی تبرک مسجد ہے لیکن بند رہتی ہے۔ ہم نے باہر سے زیارت کی، دعا مانگی اور کچھ دیر تھڑے پر بیٹھ کر آگے چل پڑے۔

مسجد اجابہ

یہ مسجد ابو ذر غفاری کی داکیں طرف اور شرق کی طرف جانے والی سڑک پر ہیں جنت البقیع سے آدھا کلو میٹر فاصلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ یہاں تشریف لائے۔ دو رکعت نماز ادا فرمائی اور تین دعائیں مانگیں۔ اے اللہ میری امت کو قحط سے نہ مارنا۔ اے اللہ میری کو پانی میں غرق نہ کرنا۔ اے اللہ میری امت کو آپس میں قتل اور خونریزی سے بچانا۔ دو پہلی دعائیں قبول ہوئیں۔ یہ مسجد صرف نماز کے اوقات میں کھلتی ہے لیکن پہلے ایک بار نفل پڑھنے کا موقع مل چکا ہے۔ آج باہر سے دعا مانگتے ہوئے واپس آ گئے۔

مسجد امام بخاری

یوسف کی دکان والے پلازہ کے پچھلی طرف سفید رنگ میں پرانے طرز تعمیر کی یہ مسجد موجود ہے۔ دراصل یہ امام بخاری کا گھر تھا۔ آپ نے زندگی بھر با وضو ہو کر اور شکرانہ کے نفل پڑھ کر تمام احادیث اسی مکان میں رقم کی ہیں۔ یہ مسجد بھی بند رہتی ہے۔ آگے چھپے پلازے بننے اور زمین میں کھدائی کی وجہ سے دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ ہم نے دروازہ پر کھڑے ہو کر دیواروں پر عقیدت سے ہاتھ پھیرے اور زیارت کے بعد واپس آ گئے۔

(یہ روح پرور سفر نامہ جاری ہے)

حجری نماز کے بعد ہم مسجد قبائلیہ میں نفل پڑھ کر واپس آ گئے تھے، ناشتہ کے بعد قریبی زیارات کو پہل پڑے۔ یہ مسجد ہمارے ہوٹل سے داکیں طرف سڑک پر ہے۔ یہ سڑک یوسف کی دکان سے شروع ہو کر اس مسجد پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس سڑک کا نام بھی شارع ابو ذر غفاری ہے۔ راستہ میں ایک قدیم عمارت کے سامنے ایک بس کھڑی نظر آئی، لگتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سمندری جہاز کسی نے سڑک پر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک سائینڈ پر آگے پیچھے آٹھ مارے تھے۔ فرٹ سائینڈ پر داکیں بائیں آگے پیچھے دو دو مارے تھے۔ یوں کل ملا کر یہ تعداد بارہ تک جا پہنچی تھی۔ مسافر وہل کے بیٹھنے کے لئے اوپر نیچے دو حصے تھے۔ بیٹھیں کھلی اور آرام دہ نظر آ رہی تھیں۔ اطراف میں بیٹھوں کی کثرت تھی۔ اس میں بیٹھوں کی تعداد کے حساب سے آسانی سے ایک سو بیس مسافر سفر کر سکتے ہیں۔ یہ بس دیکھنے میں بھی جاذب نظر تھی۔ مکہ میں اندرون شہر چلنے والی بسوں دو منزلہ ہوا کرتی تھیں لیکن ان کے ٹائر مضبوط اور معمول کی تعداد میں تھے، وہ لمبائی میں بھی بہت چھوٹی تھیں۔ کئی سال ہوئے انہیں بند کر دیا گیا ہے۔ اس بحری بیڑا کی نمبر پلیٹ پر ”لبنان“ لکھا ہوا تھا۔ میں نے چاروں طرف سے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور مسجد کی طرف چل پڑے۔

مسجد درختوں کے جھنڈ میں ہے۔ میں نے اس کو جدید تعمیر کے مختلف مراحل میں دیکھا ہے اب یہ مکمل اور خوبصورت بن گئی ہے۔ ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصار قبیلہ سے پہلے مسلمان تھے۔ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں لبا سجدہ کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھ تھے۔ وہ

طنز و مزاح لکھنؤ

اگر اصلی محبوبہ بھی انور ڈنڈہ کر سکتا ہو کیونکہ آج کل مہنگائی بہت زیادہ ہے، تو فرضی محبوبہ ضرور ہونی چاہئے، یہ آپ کا کوئی یار دوست بھی ہو سکتا ہے جو وقتاً فوقتاً کال یا ایس ایم ایس کر کے آپ کی بیوی کے کان کھڑے کئے رکھے۔

300-8826510

☆ خادم حسین مجاہد

کے ساتھ ہوتا ہے کہ مقتدی بھی مولوی کی کہی ہوئی بات کو حرف آخر ہی سمجھتے ہیں اور اکثر اپنے دماغ زحمت دینے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور استادوں کو شاگردوں پر جملہ حقوق حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ بچہ کہ جو والدین کو بھی حاصل نہیں ہوتے یعنی بچوں کھال کھینچ دینا اور ہڈی پبلی ایک کر دینا۔ وہ تو اس میڈیا اور مغربی پالیسیوں نے ان کو لگام دی ہے ورنہ پہلے بے وقوف والدین بچہ داخل کراتے وقت اساتذہ یہ کہہ کر کھلی چھوٹ دے دیتے تھے کہ ”ماسٹر جی بچے کھال ہماری اور ہڈیاں آپ کی، بس اسے بندہ دو“ اور استاد پھر آزادی سے اسے بندہ بنانے کے چہ

حضرت صاحب ایک دن گھر سے برآمد ہوئے تو چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ظاہری حالت بھی کوئی تسلی بخش نہ تھی، میں ہلکے ڈرتے ڈرتے ماجرا پوچھا تو بولے کہ ”بیروں کی عادتیں مریدوں نے خراب کی ہوئی ہیں کہ جو جائز ناجائز پیر کہیں وہ مان لیتے ہیں اور جب وہ اسی زعم میں بیویوں سے کوئی جائز بات بھی کریں تو وہ نہیں مانتیں اور بات تو تراخ سے جوتا پیرا تک پہنچ جاتی ہے جس کے بیروں کی جسمانی ہی نہیں ذہنی صحت پر بھی بڑے منفی اثرات ہوتے ہیں۔ بس اسی کا ایک ہلکا سا نمونہ تم دکھ رہے ہو۔

کچھ ایسا ہی مولویوں، پولیس والوں اور استادوں

خدمت کریں اور جب ایک بدسلوکی کرے تو مرد دوسری کی طرف چلا جائے اور دوسری بدسلوکی کرے تو پہلی کی طرف آجائے یعنی اس کے پاس دوسرا آپشن ہر وقت کھلا ہو۔

”مگر حضرت آج کل کی عورتیں تو آپس میں اتحاد کر کے مرد کی مت مار دیتی ہیں۔“

میں نے حضرت کی توجہ دوسری طرف دلائی تو بولے۔ ”مرد کو یہ اتحاد توڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی بس وہ ذرا سیاست سے کام لے تو، کیونکہ حسد تو عورتوں کی فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ بس صرف اسے ابھارنے کی دیر ہوتی ہے۔ مثلاً پہلی کے سامنے دوسری کے لباس کی تعریف کر دیں اور دوسری کے سامنے پہلی کے سلیقے کی پھر دیکھیں وہ دست و گریباں ہوتی ہیں کہ نہیں یونہی لڑاؤ اور حکومت کر دے اصول پر عمل کر کے زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔“

”لیکن اگر بندہ دو بیویاں افورڈ نہ کر سکتا ہو تو کیا کرے؟“ دوسرے سرید نے عرض کی۔

”تو اسے کم از کم ایک مجبورہ ضرور رکھنی چاہئے اور اگر اصلی مجبورہ بھی افورڈ نہ کر سکتا ہو کیونکہ آج کل مہنگائی

بہت زیادہ ہے، تو فرضی مجبورہ ضرور ہونی چاہئے، یہ آپ کا کوئی یار دوست بھی ہو سکتا ہے جو وقتاً فوقتاً کال یا ایس ایم ایس کر کے آپ کی بیوی کے کان لھڑے کئے رکھے۔ اس سے وہ اپنا خیال بھی رکھے گی اور آپ کا

بھی، زیادہ بہتر نتائج کے لئے اپنے رازدار دوست کا نمبر کسی خوبصورت زمانہ نام سے سیو (Save) کر کے

موبائل فون بیوی کی پہنچ میں رکھ دیں اور اس وقت آپ کا دوست حسب ہدایت رومانی پیغامات بھیجنا

شروع کر دے آپ دیکھیں گے کہ بیوی یکدم کتنی مہربان ہو گئی ہے حتیٰ کہ وہ آپ کی بیوی تو لگتی ہی نہیں

اگر وہ جھگڑا کرے تو دوسری طرف منہ کر کے لیٹ

میں مرنا بھی بنا لیتے تھے اور گدھا بھی لیکن یہ ہے کہ بچے بندہ بن جاتے تھے۔ اب ”مار نہیں پیارا“ کے نعرے کی وجہ سے وہ سب کچھ بن جاتے ہیں سوائے بندہ بننے کے۔

خیر مولویوں کا حشر تو بیویوں کے سامنے پیروں سے بھی برا ہوتا ہے کیونکہ وہ آگے سے دلائل دے کر

مزید ذلیل ہوتے ہیں کیونکہ بھلے بیویاں قرآن و حدیث کے حوالوں سے وقتی طور پر ڈر بھی جائیں مگر

مانتی پھر بھی نہیں۔ سپاہیوں اور استادوں کا انجام تو مولویوں سے بھی بدتر ہوتا ہے کیونکہ جتنے چھٹ ہونے کی

بتا پر وہ بیویوں کو ملزموں اور شاگردوں کی طرح ٹریٹ (Treat) کرتے ہیں اور پھر جمنے، میلن اور

کفگیر سے ”پڑد“ ملاقات کے بعد ہاتھ بھی جوڑتے ہیں، کان بھی پکڑتے ہیں اور ناک سے لکیریں بھی

نکالتے ہیں یعنی بیویاں ان کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی ہیں جو وہ ملزموں اور شاگردوں کے ساتھ کرتے ہیں

کیونکہ ہر سر کا سوا سر ہوتا ہے۔ سپاہی، پیر، مولوی اور استاد جو باہر حکم چلانے کے عادی ہوتے ہیں گھر میں حکم

ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔“

حضرت کی بات خدا خدا کر کے ختم ہوئی تو ایک سرید نے عرض کی کہ ”حضرت بیویاں کم از کم تنہی ہونی

چاہئیں؟“ تو حضرت نے پہلے تو اس ناانجناب کو خشکیں نظروں سے گھورا اور پھر گویا ہوئے۔

”بھائی میری مانو تو بیوی ایک بھی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ یہ ایک بھی دس کے برابر ہوتی ہے اور

بڑے غیر محسوس طریقے سے آہستہ آہستہ آپ کو دوستوں اور رشتہ داروں سے کاٹ کر رکھ دیتی ہے لیکن

اگر تم میری نہ مانو تو پھر کم از کم دوسرور ہونی چاہئیں تاکہ وہ آپس میں الجھی رہیں اور مرد کی جان چھوٹی رہے اور دونوں مرد کی خوشنودی کے لئے بڑھ چڑھ کر

تخیر معده کے مایوس مریض متو

مفید ادویات کا خوش ذائقہ

دیمینا

شہر

تخیر معده اور اس سے پیدا شدہ عوارض
قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، خینک، کثرت
ریاں، سانس کا پھولنا، تیزابیت، جگر کی
خراپی اور معده کی تیس سے پیر
والے امراض کے لئے مفید ہے۔

اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں

نوٹ

تخیر معده دوا دیکر امراض کے طبی مشورے

ممتاز مطب

سے رابطہ فرمائیں

یاسر اعوان (ایڈووکیٹ)

انچارج ایگل سیکشن

ممتاز دوا خانہ (رجسٹرڈ) میا

0311-73 59072

فون: 0334-6447660

مائیں، زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ وہ خود ہی منائے
گی۔“

”آپ درپردہ پوری گرل فرینڈ کلچر کی تبلیغ کر
رہے ہیں۔“ میں نے انہیں احساس دلایا۔

”میں مانتا ہوں کہ اس کی اجازت ہمارا مذہب یا
معاشرہ نہیں دیتا لیکن بیویوں کو راہ راست پر رکھنے کا
اس سے بہتر طریقہ یہی کوئی نہیں۔ محبوبہ بیوی بننے کے
چکر میں آپ کو بے تحاشا پیار دے گی اور بیوی تختہ
الٹنے کے خوف سے آپ کا خیال رکھے گی، یقین مائیں
دنیا جنت بن جائے گی۔“

”اور اگر بیوی مر جائے تو؟“ تیسرے مرید نے
پوچھا۔

”اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ایک
چانس اور دیا۔ اسے دفا کر دوسری بیوی کی تلاش شروع
کر دینی چاہئے۔ ویسے بھی سیٹ خالی ہونے پر کئی
بی بیاں تاک میں ہوں گی لیکن کوشش کریں کہ نئی بیوی
میں پرانی بیوی والی عادتیں نہ ہوں لیکن نئی میں بھی کچھ
عادتیں ایسی ضرور ہوں گی جو آپ کو پسند نہیں آئیں گی
انہیں مقدر اور مجبوری سمجھ کر قبول کر لیں اور اللہ کا شکر ادا
کریں کیونکہ اگر ایسا نہیں بھی کریں گے تو کچھ کر نہیں
سکیں گے کہ چانس تو بار بار ملتا نہیں اس لئے نئی بیوی کو
خندہ پیشانی سے قبول کریں اور اگر اپنی خیریت چاہتے
ہوں تو کبھی بھول کر بھی اس کے سامنے پہلی بیوی کی
خوبیاں بیان نہ کریں ورنہ مہلک نتائج نکل سکتے ہیں۔“

”مرنے کے بعد ہم بیوی کے لئے کیا کر سکتے
ہیں؟“ چوتھے مرید نے استفسار کیا۔ ”کیا ہم اسے
مرنے کے بعد کچھ بھیج سکتے ہیں؟“

”ظاہر ہے دعائی کر سکتے ہیں اور دل نہ چاہے تو
بھی ضرور کر لی جائے۔ ہاتی جہاں تک کچھ بھیجنے کا تعلق
سے تو ہمارے ہاں عام طور پر نیک اعمال کا ثواب بھیجا

فائدہ مردے کو کیا ہوتا ہے، اس کا فائدہ تو احباب کو ہوتا ہے۔ ہاں اولاد کی نیکی و بدی کے ذمہ دار والدین ہوتے ہیں زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ان کے اعمال کے مطابق ان کو گناہ و ثواب ملتا ہے اسی طرح اگر وہ کوئی نیک عمل جاری کر کے مریں گے یعنی مسجد، مدرسہ بنوائیں گے یا کوئی دینی تصنیف کریں گے تو وہ جب تک باقی رہیں گی ان کو ثواب ملتا رہے گا، چاہے وہ مریں جائیں۔

جاتا ہے حالانکہ ہر انسان کو زندگی اپنے اپنے اعمال کے لئے دی جاتی ہے اور اگر ثواب بھیجتا ممکن ہوتا تو گناہ بھی بھیجا جاسکتا ہے پھر ہم مرے سے گناہ تو خود کرتے اور بھیج کسی اور کو دیتے۔ ویسے بھی یہ فیصلہ تو اللہ نے کرنا ہے نہ کسی عمل کا ثواب ہے بھی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی نیک عمل کریں اور وہ عمل نیک ہو ہی نہیں یا اس میں فخر یا ریاکاری شامل ہو جائے اور ثواب کی بجائے الٹا گناہ ہو۔

اسی طرح اگر وہ کوئی برا عمل جاری کر کے مریں گے یعنی کلب، بار، چوکانہ وغیرہ بنوائیں گے تو جب تک وہ باقی رہے گا ان کا گناہ ان کو ملتا رہے گا۔ ویسے بیویاں عموماً جو سلوک مردوں کے ساتھ کرتی ہیں مرنے کے بعد ان کو لعنتوں کے بندل بھیجتا چاہئیں۔

”سنا ہے کہ جنت میں بھی اپنی ہی بیویاں ملیں گی۔“ پانچویں مرید نے پوچھا۔

”ہاں لیکن وہ اس صورت میں جبکہ میاں بیوی دونوں جنتی ہوئے تو۔ مرد تو بیویوں کو جھیلنے کے صلے میں اکثر جنت میں ہی جائیں گے لیکن اگر اپنی بیوی جنت میں نہ جاسکی تو کسی جنمی مرد کی جنتی بیوی مل جائے گی اور حوریں بونس کے طور پر ملیں گی۔ اب اس سے پریشان نہ ہو جانا کہ بیویاں وہاں بھی جینا حرام کر دیں گی تو وہاں پر ان کا ڈنک نکال کر بھیجا جائے گا۔ وہ قطعاً پریشان نہیں کریں گی حوروں کی سرداری انہی کے پاس ہو گی مگر وہاں وہ کوئی جالاپا محسوس نہیں کریں گی۔ دراصل بیویاں وہاں اس روپ میں ہوں گی جس میں آپ انہیں اس دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی دنیا و آخرت کا فرق ہے جس کا اندازہ وہاں جا کر ہوگا۔“

حضرت صاحب بول بول کر تھک گئے تھے لہذا محفل برخاست کر دی گئی۔



اکثر یوں ہوتا ہے کہ مرنے والے کو جو چیز پسند ہوتی ہے وہ ہم غریبوں کو دیتے ہیں کہ مرحوم کو اگلے جہان میں مل جائے تو یاد رکھو یہ جسم کی ضروریات ہیں مرنے کے بعد جسم تو فنا ہو جاتا ہے جبکہ روح اللہ تعالیٰ کے پاس چلی جاتی ہے۔ اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے بے وقوف بھی ہیں جو قبر پر مردے کی پسندیدہ چیزیں رکھ آتے ہیں جو بعد میں گورکن کے کام آتی ہیں۔ ایک گورکن نے مجھے ایک نفیس قسم کا حقہ دکھایا جو ایک چوہدوی کے بیٹے قبر پر رکھ گئے تھے کیوں کہ چوہدری صاحب حقے کے بغیر رچے نہیں تھے اور انہوں نے مرنے کی رات ہی بڑے بیٹے کو خواب میں آ کر سرزنش کی تھی کہ مجھے حقے کی طلب ہو رہی ہے، وہ تم نے کیوں نہیں بھیجا۔ لہذا وہ صبح سویرے ہی حقہ پہنچا گئے۔ بجائے اس کے وہ کسی غریب کو چوہدری کا حقہ بخش دیتے تو شاید چوہدری صاحب کی روح کو قرار آ جاتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس انسان کی قدر، عزت اور خدمت ہم زندگی میں سمجھی نہیں کرتے بلکہ اسے بیکار اور بیمار جان کر کوئے میں ڈال دیتے ہیں مرنے کے بعد اس سے محبت ظاہر کرنے کے لئے قل، ساتے، دسویں اور چہلم پر لوگوں کو خوب کھلاتے ہیں۔ اس سے آدمی محبت ہم اس سے زندگی میں کرتے تو شاید وہ اتنی جلد نہ مرتا یا مرتا تو سکون سے مرتا۔ مرنے کے بعد دعوتوں کا